ہم

تابش دہلوی

تمغۂ امتیاز

دلی جہاں آباد

پیش کردہ

واینڈ اسرار ایسوسی ایٹس
مشرق سینٹر گلشن اقبال کراچی

DUE DATE

مُرتّبین

ہوش امروہوی   نعیم میرٹھی

مرزا آثمر لکھنوی

سرورق : یداللہ حیدر

سال طباعت جنوری 1999ء

قیمت : ۱۲۵ روپے

پیشکش

کُل پاکستان حلقۂ ادب

C-21 چوتھی منزل تسلوروں سینٹر یونیورسٹی روڈ۔ گلشن اقبال۔ کراچی

فون: ۴۹۷۲۴۱۳



کون سینچے گا اِسے اپنے لہو سے تابشؔ   خشک ہو جائے گی یہ کشتِ نوا میرے بعد

مُجلّہ

نذرِ تابشؔ

تمغۂ امتیاز (صدارتی اعزاز) ملنے پر

ہم

کل پاکستان حلقۂ ادب

کے توسط سے

حضرت تابشؔ دہلوی

کو

تمغۂ امتیاز (صدارتی اعزاز)

ملنے پر

دلی مبارکباد

پیش کرتے ہیں

قطعۂ تاریخ

تمغۂ امتیاز صدارتی اعزاز

شاعری نے جناب تابشؔ سے
ہر شرف کا جواز پایا ہے
رتبہ ہوگا سدا افزوں فی الحال
۶۵
تمغۂ امتیاز پایا ہے

۱۹۳۳ + ۶۵ = ۱۹۹۸ء

نعیم میرٹھی

ہم

غزل کے منفرد شاعر

جناب تابش دہلوی

کو

تمغۂ امتیاز (صدارتی اعزاز)

کے اجراء پر

خلوص دل سے

مبارکباد پیش کرتے ہیں

منجانب

کراچی پبلک اسکول

۲۲۔ الف۔ بلاک ۶۔ پی۔ای۔سی۔ایچ۔ایس شاہراہ فیصل کراچی

فون: 4537816; 4523306

اِنتساب

ڈائریکٹر جنرل ریڈیو پاکستان

سیّد ذُوالفقار علی بخاری (مرحوم)

کے

نام

عنوانات



جستجوئے علم ، تسخیرِ فطرت

[illegible] کا [illegible] مرض کا علاج [illegible] کے
[illegible] تسخیرِ [illegible] فطرت کے
[illegible] کی [illegible] کوشش [illegible] انسان کی فلاح و بہبود کے لیے
[illegible] انسان [illegible] اور [illegible] کی [illegible] سے
سائنسی میدان میں [illegible] طب مشرقی طب کا
[illegible] اور اس کی [illegible] ترویج میں سائنسی [illegible] کا حصہ [illegible]
[illegible] مسلّم ہے

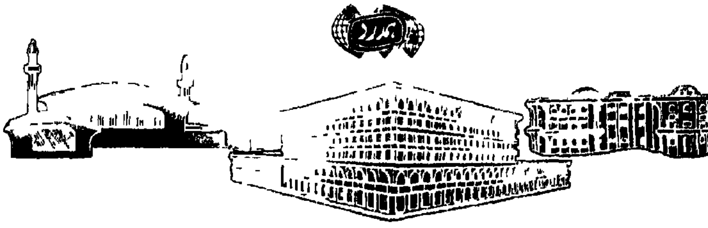
ہمدرد [illegible] استفادہ [illegible] کا
کو جدید آلات اور مشینوں [illegible] ادویات کی صورت
میں دکھی انسانیت کے علاج کے لیے پیش کرتا ہے [illegible] انسانی
وجود کے مختلف پہلوؤں پر [illegible]
مواد کی اشاعت [illegible]
[illegible] اور ان کی [illegible] ضرورت [illegible]

علمی دولت [illegible] کی اشاعت کے ذریعے صحت
[illegible] آگاہی [illegible]

ہمدرد [illegible] آمدنی [illegible] اصلاحی مقاصد پر صرف کرتا ہے اس کے
[illegible] شہرِ علم و حکمت کی تشکیل و تعمیر پر استعمال ہو رہا
ہے جو ہمدرد کا ایک دیرینہ خواب ہے اللہ کے فضل و کرم سے اب یہ خواب
مدینۃ الحکمہ کی شکل میں ایک ٹھوس حقیقت بنتا جا رہا ہے کراچی کے قریب
[illegible] ماحول میں ایک [illegible] مدینۃ الحکمہ جویانِ
علم کے لیے اس طرح کا ایک عظیم الشان منصوبہ ہے شہرِ فضل و کمال انشاء اللہ
[illegible] علم کی حیثیت سے اقوامِ عالم کے لیے عموماً اور عالمِ اسلام کے
لیے خصوصاً [illegible] خدمات انجام دے سکے گا

ہمدرد کا یقین واثق ہے کہ انسان کا فطری تجسس اور جذبۂ تحقیق تسخیرِ فطرت کا
سبب بنیں گے اور اب ایسا صحت مند معاشرہ وجود میں آئے گا جو غربت و
افلاس اور امراض و آلام سے پاک ہوگا





اپنی بات

کل پاکستان حلقۂ ادب کی بنیاد ۱۹۷۰ء میں میرے عزیز ترین دوست نظر جعفری مرحوم نے رکھی تھی ان کے ساتھ میرے علاوہ چند دوسرے احباب بھی شامل تھے۔ مگر یہ ادارہ اپنے اصل بانیوں کے ساتھ تین ماہ سے زیادہ سفر نہ کر سکا جس کے کئی اسباب تھے جن میں سے ایک یہ تھا کہ ذہین لوگوں کے درمیان نظریاتی اختلاف بہت جلد پیدا ہو جاتا ہے اور ان کی اَنا ان اختلافات کو مزید شدید بنا دیتی ہے تقریباً ۱۸ برس کے بعد میں نے ایک ادبی پرچہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ میرے ذہن میں ایک ایسے پرچے کا نقشہ تھا جو مثالی حیثیت رکھتا ہو۔ پروگرام یہ بنا کہ کل پاکستان حلقۂ ادب کا احیاء کیا جائے اور اسی کے نام سے اشاعت کا اجازت نامہ (ڈیکلریشن) حاصل کیا جائے۔ یہ زمانہ جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کا زمانہ تھا اور تمام اخبارات اور ادبی پرچوں کے ڈیکلیریشن انھیں کے دستخطوں سے جاری ہوتے تھے۔ میں نے جنرل ضیاء الحق صاحب سے رجوع کیا مگر اجازت نامہ حاصل کرنے میں ناکامی ہوئی جس کے بعد یہ طے ہوا کہ مجلّے کی صورت میں ادبی پرچہ شائع کیا جائے کیونکہ مجلّے کے لئے اجازت نامہ حاصل کرنا نسبتاً آسان تھا اور اس کا تعلق حکومت سندھ سے تھا۔ اس زمانے میں علی احمد بروہی سکریٹری اطلاعات سندھ تھے جن کی توجہ کی وجہ سے بہت سی آسانیاں حاصل ہوئیں ہم نے تھوڑے عرصے میں چار قابل قدر مجلّے شائع کئے جن میں تین مجلّے مذہبی نوعیت کے تھے جبکہ چوتھا مجلّہ حضرت جوش ملیح آبادی کی یاد میں ترتیب دیا گیا تھا۔ مجلّوں کی اشاعت کا مرحلہ بھی آخر کار مشکل ہو گیا کیونکہ خالص ادبی کام جس میں پبلک ریلیشننگ کا حصہ نہ ہو سرمایہ داروں یا صاحب ثروت افراد کی سرپرستی سے محروم ہو جاتا ہے

آخر کار یہ فیصلہ کیا گیا کہ کل پاکستان حلقۂ ادب کو صرف معتبر کتابوں یعنی معتبر ادیبوں اور شاعروں کی تصنیفات اور شعری مجموعوں کی اشاعت تک محدود رکھا جائے۔ خدا کا شکر ہے کہ ادارہ اب تک ۱۶ سولہ کتابیں شائع کر چکا ہے اور زیور طباعت سے آراستہ ہونے والی یہ کتابیں اہل ادب سے خراج تحسین حاصل کرنے میں کامیاب رہی ہیں۔ علاوہ ازیں پانچ کتابوں کی تقاریب رونمائی بھی ادارے کے زیر اہتمام منعقد

ہوئی ہیں۔ طباعت و اشاعت کے ساتھ تقاریب رونمائی میں بھی ادارے نے اعلیٰ معیار کو قائم رکھنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

حکومت پاکستان نے حال ہی میں نامور بزرگ شاعر جناب مسعود الحسن تابش دہلوی کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں صدارتی اعزاز یعنی تمغۂ امتیاز سے نوازا ہے۔ ہمیں دیگر اہلِ ادب کی طرح ہمیشہ سے تابش صاحب کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف رہا ہے۔ اس حکومتی اعزاز نے ہمارے احساس کو تقویت بخشی ہے اور اسی احساس کے تحت کل پاکستان حلقۂ ادب کی جانب سے حضرت تابش دہلوی کے لئے یہ مجلہ ترتیب دیا گیا ہے جس میں تابش صاحب کے فن اور شخصیت پر مضامین اور آراء شامل ہیں۔ یہ مجلہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد ہے کہ اس میں مشاہیر شعرا' ادبا' اور نقادانِ فن کی وہ تمام تحریریں شامل ہیں جو تابش صاحب کے فن اور شخصیت پر آج تک لکھی گئی ہیں۔ اس مجلے میں تابش صاحب کے فن اور شخصیت پر مطبوعہ مضامین کے ساتھ وہ تازہ تحریریں بھی شامل ہیں جو بطور خاص ادارے کی ایما پر تحریر کی گئی ہیں۔ اس مجلے میں وہ تمام قابل قدر مواد موجود ہے جو ادب کے طالب علموں کے لئے رہنمائی فراہم کرسکتا ہے۔

مجلہ نذرِ تابش "تابش دہلوی کے فن اور شخصیت کا اعتراف بھی ہے اور اہلِ ادب کے لئے ایک قابل قدر تحفہ بھی ہے

اس مجلے کی اشاعت اور ترتیب میں جناب ہوش امروہوی (صدر ادارہ) اور جناب مرزا اطہر لکھنوی ناظم نشر و اشاعت نے ہر قدم پر میرا ساتھ دیا اور میری حوصلہ افزائی کی۔ جناب ہاتف سعید نے جس خلوص اور محبت کے ساتھ پروف ریڈنگ کی ذمہ داری پوری کی اس کے لئے میں ان کا شکر گزار ہوں میں اُن تمام حضرات کا بھی ممنوں ہوں جنہوں نے دامے' درمے' سخنے مجھ سے اس مجلے کی اشاعت میں تعاون کیا۔ میں ان اہل قلم کا بھی ممنون ہوں جنہوں نے میری درخواست پر تابش صاحب کے فن اور شخصیت پر تازہ مضامین تحریر کئے۔ اس مجلے کے حوالے سے ان تمام افراد کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنہوں نے کسی نہ کسی صورت میں تعاون کیا ہے اس سے ان تمام لوگوں کے خلوص "تابش دہلوی کے لئے محبت اور اردو زبان سے عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔

میں برادرم ید اللہ حیدر کا بھی ممنون ہوں کہ انہوں نے مجلہ کے سرورق کی صورت میں حضرت تابش دہلوی سے اپنی محبتوں کا اظہار کیا۔!

نعیم میرٹھی
ناظم کل پاکستان حلقۂ ادب

تہنیت نامے

(۱۴)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حکومت پاکستان

کابینہ ڈویژن

نمبر [illegible] ۹۸ - اعزازات

اسلام آباد مورخہ ۳۰ ستمبر ۱۹۹۸ء

محترم جناب مسعود الحسن نابش دہلوی صاحب السلام علیکم !

میں آپ کو نہایت مسرت کے ساتھ مطلع کر رہا ہوں کہ صدر پاکستان نے ۱۴ اگست ۱۹۹۸ء کو یوم آزادی کے مبارک موقع پر آپ کو "تمغۂ امتیاز" کا قومی اعزاز عطا کیا ہے۔ یہ اعزاز پاکستان کے خصوصی گزٹ میں شائع کیا جا رہا ہے۔

۲۔ اب آپ اپنے نام کے بعد "تمغۂ امتیاز" یا اس کا مخفف "ٹی۔ آئی" لکھنے کے/کی مجاز ہیں۔

۳۔ پروگرام کے مطابق ۲۳ مارچ ۱۹۹۹ء یوم پاکستان کے موقع پر منعقد ہونے والی تقسیم اعزازات کی تقریب میں صدر پاکستان آپ کو "تمغۂ امتیاز" سے مزین کریں گے۔ اس تقریب میں شرکت کے لئے آپ کو دعوت نامہ انشاء اللہ بروقت ارسال کر دیا جائے گا۔

مخلص

عبدالحمید قاضی

(اے۔ ڈبلیو قاضی)

جناب مسعود الحسن نابش دہلوی

۳-اے۔ ۹/۶، ناظم آباد،

کراچی۔ ۷۴۶۰۰

باسمہٖ تعالیٰ۔ حامداً و مصلیاً

PROFESSOR
Dr Ghulam Mustafa Khan
M A LL B PhD D litt

2 OLD UNIVERSITY CAMPUS
HYDERABAD SINDH

Dated ۳۱ ستمبر ۱۹۹۲ء

عزیز مکرم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا گرامی نامہ ملا۔ بڑی خوشی ہوئی کہ آپ حضرت تابش دہلوی کے اعزاز میں ایک تقریب پذیرائی کا اہتمام کر رہے ہیں۔ الحمد للہ۔
حضرت تابش مجھ سے چند ماہ بڑے ہیں۔ میں پرانی روایت پر قائم ہوں اس لیے اُن کو "بھائی جان" کہا کرتا ہوں۔ چنانچہ اُن کو جو صدارتی "تمغائے حسن کارکردگی" ملا ہے وہ دراصل ہم کو ملا ہے کیونکہ بزرگوں کا اعزاز دراصل چھوٹوں کا سر اونچا کر دیتا ہے۔
حضرت تابش کی شاعری کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ اظہر من الشمس ہے۔ لیکن اُن سے پہلے بھی عرض کیا تھا اور اب بھی عرض کرتا ہوں کہ وہ "خاکے" ضرور لکھتے رہیں، کیونکہ جن حضرات کو وہ جانتے ہیں موجودہ نسل اُن سے واقف نہیں۔ میری دلی دعا ہو کہ اللہ تعالیٰ اُن کو دونوں جہانوں میں اعزاز عطا فرماتا رہے۔ آمین

فقط

میں بہت کمزور ہو گیا ہوں ورنہ ضرور اس تقریب میں شرکت کرتا۔

حکیم محمد سعید
KIM MOHAMMED SAID
HAMDARD HOUSE
KARACHI-74800
(Pakistan)

Karachi Clinic 215908, Office 6616001 4, Residence 4914651
Telex 29370 HAMD PK, Telefax (92 21) 6641766
Madinat al Hikmah 6996001 2, 6900000
Lahore. Clinic 7237729
Rawalpindi Clinic 566716
Peshawar Clinic 274186

پیغام

حکیم محمد سعید

حضرت تابش دہلوی بزرگ اور قابل احترام شاعر ہیں۔ اپنی قابل قدر شعری تخلیقات کے باعث اس میدان میں بلا شبہ ایک اعلا اور ارفع مقام رکھتے ہیں۔ وہ قادر الکلام شاعر ہونے کے علاوہ ایک نف انسان بھی ہیں۔

حکومت پاکستان نے ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں جس تمغۂ حسن کارکردگی سے انھیں نو ہے میرا خیال ہے کہ وہ ان کے شایان شان نہیں ہے۔ انھیں اس سے بڑا اعزاز ملنا چاہیے تھا۔

کل پاکستان حلقۂ ادب مبارک باد کا مستحق ہے کہ اس نے حضرت تابش دہلوی کی ادبی خدمات سراہتے ہوئے ان کے اعزاز میں ایک تقریب پذیرائی کا اہتمام کیا ہے۔ یہ یقیناً ایک مستحسن اقدام ہے۔ میں اس کی کامیابی کے لیے دعا کرتا ہوں۔

PAKISTAN TELECOMMUNICATION CORPORATION

X 1635 CA 22 ISLAMABAD 26/3 46/48
MR - MASOOD UL HASSAN TABISH DEHLVI
(TAMGHA-I-IMTIAZ)
3-A-6/9 NAZIMABAD KARACHI
HEARTY CONGRATULATIONS ON RECEIVING AWARD IN RECOGNITION
OF YOUR NATIONAL SERVICES AND ACHIEVEMENTS ( )
(RAJA NADIR PERVEZ KHAN)
MINISTER FOR COMMUNICATIONS

C-35 88/287
26

X 1635 CA 22 ISLAMABAD 26/3 46/48
MR - MASOOD UL HASSAN TABISH DEHLVI
(TAMGHA-I-IMTIAZ)
3-A-6/9 NAZIMABAD KARACHI
HEARTY CONGRATULATIONS ON RECEIVING AWARD IN RECOGNITION
OF YOUR NATIONAL SERVICES AND ACHIEVEMENTS ( )
(DR M AKRAM SHEIKH)
SECRETARY COMMUNICATION

CONSULATE GENERAL OF JAPAN
Karachi

March 31, 1999

Mr Tabish Dehlvi

Respected Sir,

I would like to congratulate you from bottom of my heart on the auspicious occasion of receiving the most distinguished Presidential Award "the Pride of Performance" in recognition of your outstanding achievements in the field of literature

This is indeed a well-merited award for your notable services that you extended to promote the high standards in Urdu poetry and gave a new dimension to it.

I once again congratulate you.

Sincerely Yours

Shigeyuki Ataka
Advisor to the Consul General of Japan,
Karachi

INSTITUTE OF EYE DISEASES العین

Dr Muhammad Mukhtar Ahmed

FRCS (Ed) DO FRCOphth (London)

۲۶ مارچ ۱۹۹۹

محترم مسعود تابش دہلوی

تمغۂ حسن کارکردگی پر دلی مبارک باد

آپ تو اس سے کہیں زیادہ کے اور آپ

اس کے مستحق رہے ہیں - آپ میرے لئے

بہت ہی عظیم دوست ہیں ۔ اللہ تعالیٰ

آپ کو اور بھی عظمت اور عزت و شہرت عطا فرمائے

دعاگو

محمد مختار احمد

241/3/A Block 2 Shahrah-e Quaideen P E C H S Karachi Pakistan Tel 4556460 445561 445562 Fax 4556151

Telegrams Cables
DIGBROCAST

DIRECTOR GENERAL

Pakistan Broadcasting Corporation
Headquarters

Broadcasting House
ISLAMABAD

Reference No

پیغام

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ کلّ پاکستان حلقۂ ادب مشہور شاعر تابش دہلوی کے اعزاز میں ایک تقریب کا اہتمام کر رہا ہے اور اس موقعہ پر ایک ضخیم مجلہ بھی شائع کریگا ۔ یہ امر بھی میرے لئے باعث مسرت ہے کہ اس ادبی ادارہ نے مجھے دعوت دی کہ میں اپنی تحریر کے ذریعہ اس تقریب میں شرکت کروں ۔

ادبی حلقوں میں تابش دہلوی ایک قد آور شخصیت کے مالک ہیں جنہوں نے اپنی زندگی شعرو ادب کیلئے وقف کر دی اور ایک غزل گو شاعر کی حیثیت سے ادب میں ایک بلند مقام پایا ۔ ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے حکومت پاکستان نے تمغۂ حسن کارکردگی سے نوازا ۔ میں ان کو اس اعزاز پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ تعالٰی انہیں علم و ادب کی مزید خدمت کرنے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے ۔

علم و ادب کے فروغ اور اس کی ترقی میں ریڈیو پاکستان کا ایک منفرد کردار رہا ہے ۔ ملک کے طول و عرض میں قائم ۲۴ ریڈیو سٹیشنوں نے قومی زبان کے ساتھ ساتھ اپنے علاقے کی زبانوں ان کے ادب اور ثقافتی اور مجلسی زندگی کو فروغ دیا اور پاکستان کے ہر علاقے کو دوسرے علاقوں کی ثقافت سے متعارف کرایا کیونکہ ریڈیو کی نشریات کا دائرہ ملک کے ۸۵ % علاقے تک پھیلا ہوا ہے اور اس کے پروگراموں سے ملک کی ۹۵ % آبادی مستفید ہو رہی ہے ۔

ریڈیو کے علمی اور ادبی پروگرام ہر طبقۂ فکر کے سامعین کیلئے ذہنی اور روحانی تسکین کا ذریعہ سمجھے جاتے ہیں جن میں ادبی تقاریر ، کتابوں پر تبصروں مباحثوں کے علاوہ مشاعروں کو خاص اہمیت حاصل ہے اور اس طرح ریڈیو کے وسیلے سے قومی اور علاقائی کلچر کے فروغ کیلئے ملک کے ممتاز ادیبوں شاعروں نے نمایاں کردار ادا کیا ہے ۔

آخر میں ادارے کو اس تقریب کے انعقاد پر مبارکباد پیش کرتا ہوں اور اس کی کامیابی کیلئے دعا گو ہوں ۔

انور محمود

(سید انور محمود)

یونیورسٹی گرانٹس کمیشن اسلام آباد
UNIVERSITY GRANTS COMMISSION, ISLAMABAD
H 9, Islamabad (Pakistan), Phone (051) 9290130 Fax (051) 9290129

CHAIRMAN

No 4-7 CHR/UGC 98 1444
Dated August 18 1998

My dear Masood-ul-Hasan Saheb

It gives me immense pleasure to congratulate you on the award of ***"Tamgha-i-Imtiaz"*** by the Government of Pakistan on 14th August 1998

It is a well-deserved recognition of your merit and consistent hard work. May God give you greater honours in the future

With best wishes and regards,

Yours sincerely,

(Capt U. A. G Isani)

Syed. Masood-ul-Hasan
(Tabish Dehlvi)
3-A-6/9
Nazimabad
KARACHI.

(19)

No.D-16/98-586

Vice-Chancellor

University of Karachi
Karachi

September 2, 1998

Mr Masoodul Hasan Tabish Dehlvi
3-A-6/9, Nazimabad,
Karachi Post Code 74600

My dear Tabish Dehlvi Sahib

It is with great pleasure that I write to congratulate you on the award of Tamgha-i-Imtiaz conferred upon you on 14th of August 1998 Kindly accept my heartiest and sincere felicitations on this well-deserved recognition

This Presidential award recognizes your tremendous achievements and contributions on national goals

May Allah Almighty bless you with greater successes

With profound regards

Yours sincerely,

[signature]

Zafar H Zaidi

Telegrams & Cables
'BROCAST'

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

Pakistan Broadcasting Corporation

KARACHI STATION

Ref. No ______________ Karachi ______________ 19

پیغامِ تہنیت

حضرت تابشؔ دہلوی حد درجہ قابلِ احترام بزرگ اور قادرُالکلام شاعر اور بلند پایہ انسان ہیں۔ بلاشبہ وہ ایک عہد ساز شخصیت کے مالک ہیں۔ میں ان کے بارے میں کیا عرض کروں کہ "چھوٹا منہ اور بڑی بات" والا معاملہ ہے۔ ان کے ساتھ میرا دیرینہ رشتۂ نیازمندی میرے لیے بہت بڑے اعزاز سے کم نہیں۔ دہلی اور ریڈیو ہمارے درمیان قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ان کی عظیم ادبی خدمات کے اعتراف میں حکومتِ پاکستان کی جانب سے انہیں تمغۂ حسنِ کارکردگی سے نوازا گیا ہے دراصل وہ اس سے بھی بڑے اعزاز کے مستحق ہیں میری دعا ہے کہ اللہ رب العزت علم و ادب کی خدمت کیلئے انہیں تا دیر زندہ بہ صحت اور سلامت رکھے۔ آمین

کُل پاکستان حلقۂ ادب بجا طور پر مبارکباد کا مستحق ہے کہ وہ تابشؔ صاحب کی گراں قدر ادبی خدمات کے اعتراف میں ان کے اعزاز میں تقریبِ پذیرائی کا اہتمام کر رہا ہے اور ایک یادگار مجلہ بھی اس موقع پر شائع کر رہا ہے۔ یہ نہ صرف ایک مستحسن بلکہ قابلِ تقلید اقدام ہے۔ میں اس کارِ خیر میں شریک تمام احباب کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں اور ان کی کامیابی کے لیے اللہ رب العزت کے حضور پورے خلوص کے ساتھ دعاگو ہوں۔

(شکیل فاروقی)
اسٹیشن ڈائریکٹر ریڈیو کراچی

انجمن ترقی اُردو پاکستان

قائم شدہ ۱۹۰۳ء

ٹیلیفون: شعبۂ تحقیق: ۴۶۱۴۰۶ ، ۴۹۷۴۲۹۶
شعبۂ فروخت: ۶۷۴۴۰۲۴

D 159 BLOCK 7 GULSHAN E IQBAL, KARACHI 75300

نمبر ------- / ۱۹۰
تاریخ ------- ۱۹ء

پیغام

جناب تابش دہلوی کا شمار کلاسیکی روایت کے صفِ اول کے شعرا میں ہوتا ہے، ان کا اصل میدان ہی غزل سرائی ہے۔ یہ غزل گوئی میں اپنا مخصوص و منفرد انداز رکھتے ہیں، مضامین کے اعتبار سے ان کے اشعار عصری حسیت کا حصّہ بنا دیتے ہیں۔ ان کی غزل گوئی کی عمر اب پچاس سال سے تجاوز کر چکی ہے۔ ان کا شمار آج کے اساتذہ میں ہوتا ہے۔ ان کے مجموعوں میں ماہِ شکستہ، نیم روز، چراغِ صحرا، غبارِ انجم اور دھوپ چھاؤں ادبی حلقے میں مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ ایک مختصر پیغام میں اُن کی شاعری کی تمام خصوصیات کا احاطہ ممکن نہیں، لیکن تابش دہلوی کی غزل کا رشتہ جدید رجحانات سے جڑا ہوا ہے۔

ان کے نثری مضامین کی ایک کتاب "بازدید" کے نام سے شائع ہو چکی ہے جسے خاصی پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔ اگر غزل کی تہذیب کا مطالعہ کرنا ہو تو جناب تابش دہلوی کی غزل کا مطالعہ از بس ضروری ہے۔

آفتاب احمد خاں

آفتاب احمد خاں
صدر
انجمن ترقی اُردو پاکستان

مراسلت کا پتہ: ڈی-۱۵۹- بلاک ۷، گلشن اقبال، کراچی ۷۵۳۰۰

URDU DICTIONARY BOARD
ST-18/A, GULSHAN-E-IQBAL, BLOCK-5
OFF UNIVERSITY ROAD, KARACHI
TEL : [redacted]
469561 - 4988887

اُردو لغت بورڈ
ایس ٹی ۱۸-اے، گلشن اقبال بلاک ۵
آف یونیورسٹی روڈ، کراچی
ٹیلیفون: [redacted]

محترمی تابش دہلوی صاحب!

السلام علیکم

آج کے اخبار "جنگ" اور "ڈان" میں یہ خوش خبری نظر سے گزری کہ اس سال آپ کی
ادبی خدمات کے اعتراف میں تمغۂ امتیاز (صدارتی ایوارڈ) دیا گیا ہے۔ میری اور میرے اہلِ خانہ
کی جانب سے دلی مبارک باد قبول فرمائیے۔ اعزاز بہرحال اعزاز ہے اور اعتراف کمال کی ایک
ثبت ہوتی ہے۔ اس موقع پر میں یہ کہہ سکتا ہوں بہت پہلے اس قسم کی کارروائی ہو جانی چاہیے
تھی لیکن ایسی باتیں چھوڑ کر کامیابی اور مبارک باد کے منہ کا ذائقہ کڑوا نہیں کرنا چاہتا۔
آپ نے اپنی گمبھیر آواز اور جیدہ خدمت، پرخلوص اور پرمحل شگفتہ مزاجی سے محفلیت
ایک بڑے حلقے کو اپنا گرویدہ بنا رکھا ہے۔ میں ایک مدت سے آپ کو ایک ہمہ وصف کا
پاسدار دیکھ رہا ہوں جو ان دنوں نا مشکل ترین امر معلوم ہوتا ہے۔ آپ کے ایسے بزرگ
تہذیب، روایت اور شرافت کے جن سانچوں میں ڈھلے تھے میرا خیال ہے
وہ سانچے ٹوٹ چکے ہیں۔ آپ کی ذات سے شعر و ادب، زبان و تہذیب
کو جو رنگ و آہنگ ملا ہے وہ ہماری تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔
میری دعا ہے کہ آپ تا دیر سلامت رہیں اور اس شہر کی ادبی ثروت میں
اضافہ فرماتے رہیں۔
امید ہے آپ بخیر ہوں گے۔

خیر اندیش

سحر انصاری

۱۴ اگست ۱۹۹۸ء

۱۳۷

X 1925 AE 3 CSC F.7 MKZ ISLAMABAD 1 29/33
MR TABISH DEHALVI BLOCK-DA 6/9 NAZIMABAD KARACHI

PLEASE ACCEPT MY HEARTIEST CONGRATULATION ON TAMGHA-I-IMTIAZ
ANNOUNCED ON PAKISTAN INDEPENDENCE DAY
NAZIR NAJI CHAIRMAN PAKISTAN ACADEMY OF LETTERS ISLAMABAD

GPD LN 19 B 00026

ڈاکٹر وقار احمد رضوی
ایم اے پی ایچ ڈی
سی/۹۷، اسٹاف ٹاؤن،
کراچی یونیورسٹی کیمپس، کراچی ۳۲

فون : ~~۳۴۱۲۰۰۷~~ 6347527

تاریخ : ۱۲ ستمبر ۱۹۹۸

مکرم و معظم جناب تابش دہلوی صاحب!

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

اخبارات سے یہ معلوم ہو کر دلی خوشی ہوئی کہ حکومت پاکستان نے آپ کی ادبی خدمات کے اعتراف میں تمغۂ امتیاز عطا کیا ہے۔ میں آپ کو اس قومی ایوارڈ کے ملنے پر صمیم قلب سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ میں آپ کو ٹیلیفون بھی کرنا چاہتا تھا مگر میرے پاس آپ کا ٹیلیفون نمبر نہیں ہے۔ اس لیے نہیں کر سکا۔ امید ہے آپ بخیریت سے ہوں گے۔

(پروفیسر ڈاکٹر) وقار احمد رضوی

تابش دہلوی صاحب

تابش دہلوی ہمارے بزرگ نسل کے ایسے نمائندے ہیں جن کا کلام اور شخصیت، دونوں یکساں طور پر خوبصورت اور پُروقار، شائستہ ہیں۔ وہ مسلّمہ بزرگ ہیں لیکن انہوں نے کبھی بزرگی کو اپنے اوپر طاری ہونے نہیں دیا۔ وہ خوش طبع، خوش کلام اور خوش خصال انسان ہیں اور یہ تینوں صفات بہت کم لوگوں میں اکٹھی نظر آتی ہیں۔

ان کو جو تمغۂ امتیاز ملا ہے، وہ یقیناً اس سے بڑے اعزاز کے اہل اور بہت پہلے سے مستحق تھے لیکن "دیر لگی آنے میں تم کو شکر ہے پھر بھی آئے تو" کے مصداق پوری ادبی برادری کے ساتھ ساتھ میں بھی ان کو ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کو مزید رفعتوں اور زیادہ درجات عطا فرمائے اور ان کے بڑھاپے کا یہ شاندار دور اسی طرح رخشاں اور درخشاں رہے۔

امجد اسلام امجد

ڈائریکٹر جنرل — اردو سائنس بورڈ

299 - اپر مال — لاہور

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن آف پاکستان۔ کراچی

ایم آر کیانی روڈ کراچی ۷۴۲۰۰

فون ۵۱۰۰۴۰

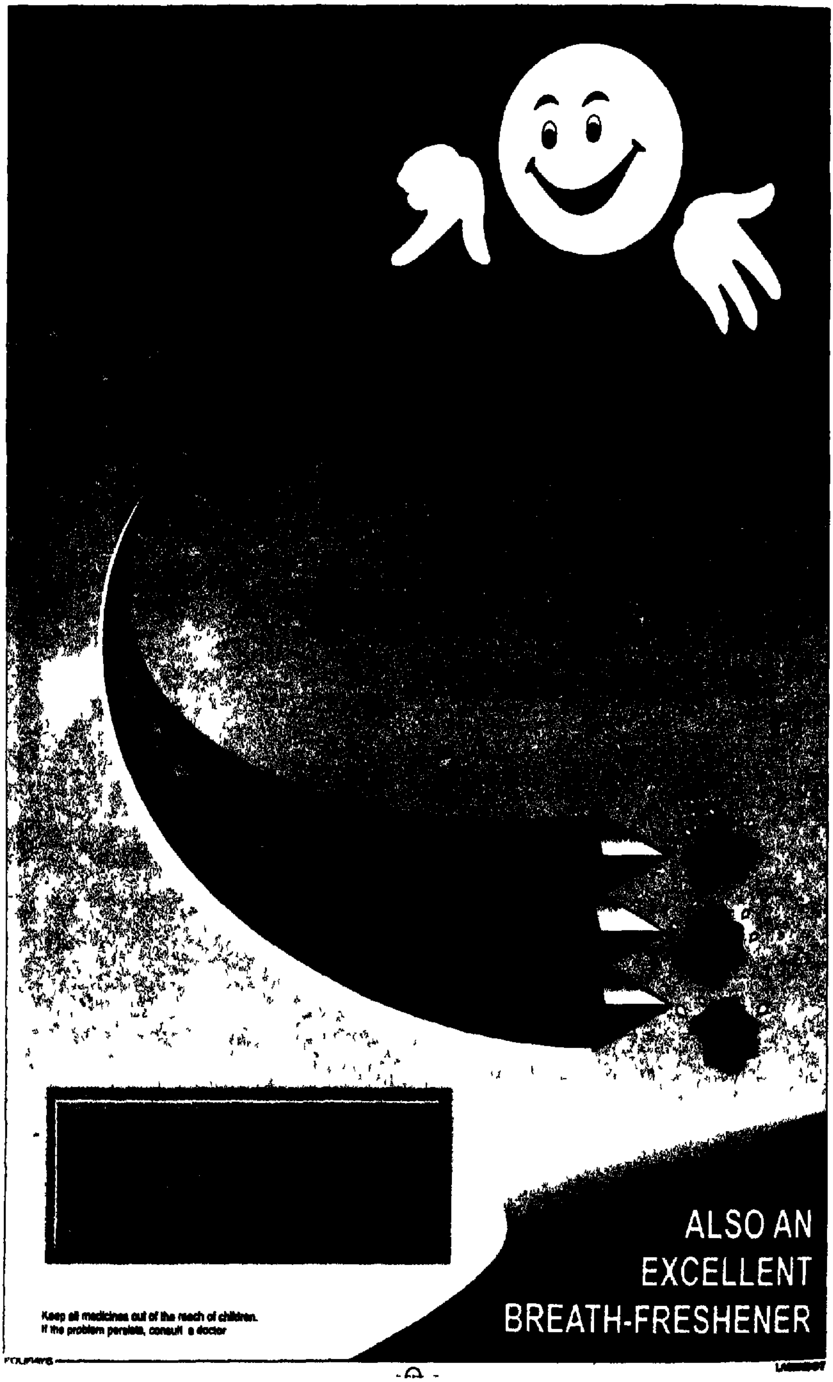
محمد احسن کا گرامی اور لشکرِ اردو کا سپہ سالار

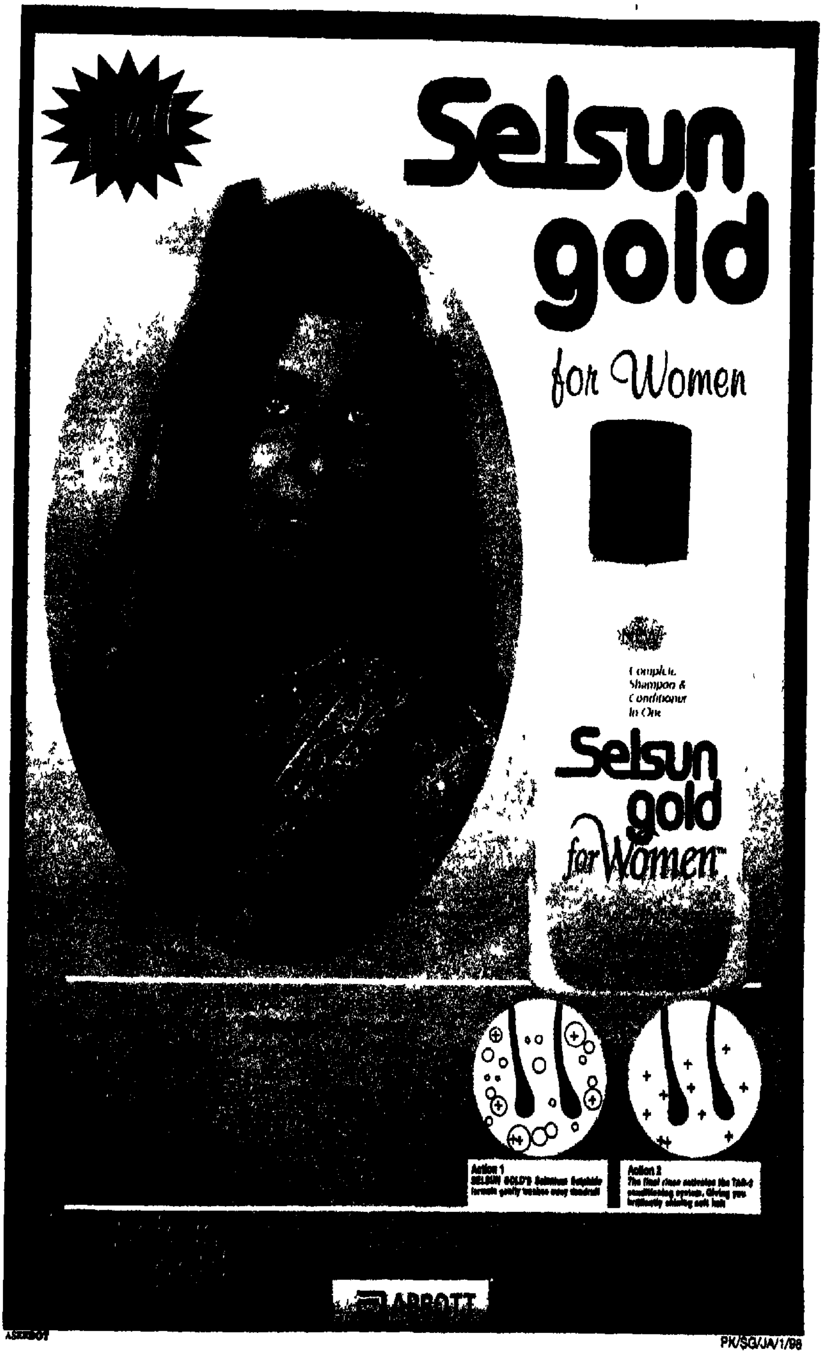
اردو زبان کا جانثار لکھوں یا بزرگ و معتبر خدمت گزار کہوں لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ تابش صاحب کو میں لشکرِ اردو کا سپہ سالار سمجھتا ہوں جو آج بھی تیر و کمان لئے رزم گاہ میں موجود ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تابش دہلوی کا نام لیتے ہی ہماری مظلوم قومی زبان اپنے تمام حسن و رعنائیوں کے ساتھ سامنے آجاتی ہے اور اس وقت وقتی طور سے یہ وہم و گمان ختم ہو جاتا ہے کہ ہماری قومی زبان پر کیا گزر رہی ہے اور اس کی یہ ہمت و استقامت ہے کہ گزشتہ پچاس برسوں سے ہو رہی ان سازشوں کے طوفان اور ریلے سے زیادہ اور مت انگریز تیر و نشتر سہتی چلی آرہی ہے ایسے نامساعد ماحول میں ہماری زبان کا نام بھی احساس کمتری کے الزام کے خوف سے نہیں لیا جاتا اور اس طرح یہ ایک غیر ترقی یافتہ بلکہ جدید علوم سے بے بہرہ لوگوں کی علامت سمجھی جا چکی ہے یہ ہمارے درمیان تابش دہلوی اور اسی قبیل کے دیگر ادبا و شعرائے کرام کا موجود ہونا ہی ہے جو اردو زبان کا پرچم بلند کئے ہوئے ہے خدا ان تمام بزرگان باہمت کو تادیر سلامت رکھے تاکہ اردو پر سے انگریز استعمار کے سائے زوال پذیر ہو سکیں

ان مایوس کن حالات میں تابش صاحب کی خدمات کا سرکاری سطح پر اعتراف ایک خوش آئند حقیقت ہے گو کہ ان کی ۷۷ سالہ خدمات جلیلہ کا اعتراف بہت پہلے ہونا چاہیے تھا اور یہ بھی اس سے بڑھ کر طویل مدت تک حق ناشناسی کا اظہار ہے محمد اللہ تابش دہلوی کا نام ہی ان کے علم و دانش کی سند ہے کیونکہ ان کی ذات ان تمام اعزازات سے بلند و بالا ہے تاہم ہم پرامید ہیں کہ ماضی قریب میں جو حقدار رسید کے مترادف نہ صرف تابش صاحب بلکہ دیگر عاشقانِ اردو، سخنوروں اور ادبا کو بہتر طریقے سے نوازنے کا سلسلہ جاری رکھا جائے گا تاکہ کسی طور اہل وطن یہ سمجھ سکیں کہ اردو لکھنا پڑھنا یا بولنا ذلیل باعث نہیں اور اردو کا اپنا ایک مقام ہے جس پر اس کو ایک نہ ایک دن فائز ہونا ہے اور یہ صرف کچھ مدت کی کہانی ہے

میں تابش صاحب کو علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی جانب سے جن کی محفلوں کی رونق وہ بہ کمال ذوق و شوق سالہا سال سے بڑھاتے چلے آرہے ہیں، مشاعروں کے لاکھوں سامعین اور خود اپنی جانب سے ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ تابش صاحب کی عمر دراز تر ہوتی رہے، ہم انہیں سنتے رہیں اور انمول داد کے خزانے ان پر لٹاتے رہیں جس سے بڑھ کر نہ کوئی مقبولیت کی سند ہے نہ کسی نمائشی اعزاز کی ضرورت ۔

محمد ذاکر علی خاں


ALSO AN
EXCELLENT
BREATH-FRESHENER
Keep all medicines out of the reach of children.
If the problem persists, consult a doctor


Selsun
gold
for Women
Complete
Shampoo &
Conditioner
In One
Selsun
gold
for Women™
Action 1
Action 2
ABBOTT

PK/SG/JA/1/98

تاؔبش دہلوی
کی
نثر نگاری

لہ

— (ساز یافتہ) —

شاعری میں حضرت داغ دہلوی کو جو ہر دلعزیزی حاصل ہوئی وہ اُردو کے کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوئی۔ ان کی ہر دلعزیزی کا یہ عالم تھا کہ برصغیر کا ہر شاعر انہی کے رنگِ سخن کی پیروی کر رہا تھا اسی لئے وہ جہانِ اُستاد حضرت داغ دہلوی کہلائے۔ ہمارے عہد میں حضرت جگر مُرادآبادی دوسرے ہر دلعزیز شاعر ہیں اور ان کو بھی داغ ہی کی طرح کا قبولِ عام حاصل ہوا۔ اور برصغیر کے بیشتر شعراء نہ صرف ان کے رنگِ سخن کی پیروی کرتے رہے تھے بلکہ شاعروں نے ان کا ترنم تک اپنا لیا۔ حضرت جگر نے بعض نوجوان شاعروں کو ان کی شاعری میں ترقی کے امکان اور ان کے اندازِ شعر خوانی کو دیکھ کر بہت عزیز رکھا ان میں مجروح سلطانپوری، راز مُرادآبادی، شکیل بدایونی، دور ہاشمی، نظر امروہوی اور ہوش امروہوی شامل ہیں۔ اور ان میں سے بعض شاعروں میں جگر صاحب کا رنگِ سخن ہی نہیں بلکہ ترنم تک ایسا رچ بس گیا کہ ان کا اندازِ سخن اور ان کا طرزِ شعر خوانی "جگر مکتبۂ شاعری" کہلانے لگا۔ اور آج بھی یہ نوجوان شعراء اسی سرشاری سے معاملاتِ حُسن و عشق جگر ہی کی طرح اپنی شاعری میں بیان کرتے ہیں لیکن شاعری کے دورِ حاضر کے تقاضوں نے انہیں زندگی کے دوسرے مسائل کی طرف متوجہ کیا ہے اور وہ اپنی شاعری کے کینوس کو زیادہ وسعت دینے پر مجبور ہیں اور اس طرح "جگر مکتبۂ شاعری" کو دورِ حاضر سے منسلک کرنے میں نہایت کامیاب ہیں۔

ہوش امروہوی بھی اسی حلقۂ شعراء کے رکنِ رکین ہیں اور وہ بھی اپنی شاعری میں معاملاتِ حُسن و عشق کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کے دُکھ درد اُسی سوز و گداز سے بیان کرتے ہیں جو حضرت جگر کا خاصّہ تھا اور وہ اس اظہار میں نہایت کامیاب ہیں۔ آج سے پچاس سال پہلے کے ہوش امروہوی اردو شاعری کو بازیافت ہوئے ہیں اور بائیس ۲۲ سال کے طویل عرصے کے بعد اپنی جتنی توانائیوں سے اُردو شاعری کو مالا مال کر رہے ہیں اُمید ہے وہ اپنی شاعری سے پھر روح کی بالیدگی اور ذہنوں کی آسودگی کا سبب ثابت ہوں گے۔ اُن کا مجموعۂ کلام "بکھری خوشبو" آپ کے پیشِ نظر ہے فیصلہ آپ کریں۔

تابش دہلوی

حرفِ آغاز

غزل کے مطالعہ میں ہم اَدوار کا تہذیبی پس منظر پیشِ نظر نہیں رکھتے اور یہ الزام کہ قدیم غزل اپنے ادوار کی عکاسی نہیں کرتی اسی کا نتیجہ ہے ۔ درحقیقت غزل ہی وہ صنفِ شعر ہے جس نے ہمیشہ اپنے معاشرے کی پوری پوری عکاسی کی ہے ۔ میرؔ، سوداؔ اور دردؔ کے زمانے کو لیجئے ، یہ شعرا بھی اپنی غزل میں نہ صرف اپنے معاشرے کی بھرپور ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں بلکہ ان کی ترجمانی اور عکاسی نے باقاعدہ تحریک کی صورت اختیار کرلی ۔

میرؔ سوداؔ اور دردؔ نے جس معاشرے میں زندگی بسر کی وہ سیاسی بدحالی، معاشی ناہمواری ، مذہبی زوال آمادگی اور طوائف الملوکی کا شکار تھا ، مرہٹوں اور روہیلوں کی یلغاریں ، نادرشاہی اور ابدالی حملے ، روز کا معمول تھے ، موسموں کی طرح حکومتیں بدل جاتیں ، زندگی عذاب بن کر رہ گئی تھی ۔ عوام میں خواص دونوں زبوں حال اور زندگی کی آسودگیوں سے محروم تھے ۔ اس معاشرے نے جو دُکھ دیئے تھے ۔ ان کا مداوا دو تین طریقوں ہی سے کیا جا سکتا ہے یا تو ماتم و فریاد اور آہ وزاری سے یا طعن وطنز سے یا اللہ اللہ کرکے ۔

میر تقی میرؔ نے نالہ وشیون میں اس کرب سے جو زندگی کا سرمایہ بن گیا تھا نجات تلاش کرنے کی کوشش کی ۔

سوداؔ نے اُس کرب کا اثر دوسری طرح قبول کیا ، انہوں نے روزگار اور ابنائے روزگار کو اپنے طعن وطنز کا ہدف بنایا اور اس طرح زندگی کی اُس تلخی کو جو زندگی کا مزاج بن گئی تھی اپنے لہجے کے طنطنہ سے کم کیا ۔

دردؔ نے ان مصائب سے نجات کا راستہ خانقاہ اور تصوف میں ڈھونڈا ۔

میرؔ، سوداؔ اور دردؔ کا یہ اندازِ سخن جو اپنے زمانے اور معاشرے کا پورا پورا عکاس ہے آج تک قائم ہے کیونکہ زندگی میں اخلاقی پستی ، زوال آمادگی ، معاشی ناہمواری اور دوسری بُرائیاں اب بھی جاری وساری ہیں اور اسی لئے ان بزرگوں کے اندازِ سخن کی پیروی ہماری غزل کا مزاج بن گئی ہے

میرؔ کا طرزِ سخن مختلف شعرا سے ہوتا ہوا فانیؔ اور فراقؔ تک پہنچتا ہے

اکبرؔ اور زیادہ نکھرے ہوئے انداز میں حالیؔ ، اقبالؔ ، جوشؔ اور غزل میں یگانہؔ کے یہاں سوداؔ کا اسلوب

وانداز صاف نظر آتا ہے، وہی لہجہ میں گھن گرج وہی طنطنہ اور وہی اظہار و بیان میں مردانگی ۔

دردؔ کی صوفیانہ شاعری کا پرتو یوں تو ہر شاعر کے یہاں تھوڑا بہت ضرور نظر آتا ہے، لیکن اصغرؔ گونڈوی کی شاعری میں یہ زیادہ نکھر کر سامنے آتا ہے

آتشؔ و ناسخؔ ، غالبؔ و ذوقؔ و مومنؔ ان سب کی شاعری میں بھی اُس دور کی پوری ترجمانی ملے گی۔ خاص طور پر غالبؔ مٹتی ہوئی عظمت اور دم توڑتی ہوئی تہذیب کی ترجمانی میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں

داغؔ اور امیرؔ کے زمانے کی شاعری محاکاتی شاعری ہے، لکھنؤ دبستان شعر بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ۔

غزل نے اُس معاشرے کی بھی پوری پوری عکاسی کی ہے، اُس معاشرے میں طوائف ایک اہم رکن تھی ، اسی لئے اُس زمانے کی شاعری اور خاص طور پر غزل چوما چاٹی کی شاعری اور غزل ہے ۔

جدید غزل بھی اپنے زمانے کی نہایت سچّی عکاس ہے

اِس دور میں قدیم اور جدید کی کشمکش سے اقدار کی جو شکست و ریخت ہو رہی ہے اس کی وجہ سے ہماری تہذیبی شناخت مبہم مبہم ہے اور ابھی ہمارا صحیح قومی تشخص نہیں ہو پایا ہے اور یہی ابہام ادب میں بھی نظر آتا ہے۔ خاص طور پر ہماری جدید غزل اِس ابہام بلکہ بسا اوقات اہمال سے دوچار ہے ۔

غزل کے مطالعہ میں یا تو بعض ادوار کی شاعری کو ہم یکسر رد کر دیتے ہیں یا اس شاعری کے ایک بڑے حصّہ سے ہم صرف نظر کر جاتے ہیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیئے بلکہ ہمیں شعر کو اُسی دور کے تناظر میں رکھ کر پڑھنا اور سمجھنا چاہیئے جس دور میں وہ کہا گیا ہے ۔ ارتقائی مطالعہ میں تو ہم جانؔ صاحب اور سعادت یار خاں رنگینؔ کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے ۔

غزل نے ہر دَور میں اپنے دور کی ثقافت کی پوری پوری ترجمانی کی ہے، غزل ہر دور میں سچّی رہی ہے اور سچّی رہے گی، معاشرے کی عکاسی کا جو قرینہ غزل کو حاصل ہے وہ کسی اور صنفِ شعر کو میسّر نہیں ۔

مَیں خود بھی قدیم اور جدید کے سنگم پر کھڑا ہوں، اس لئے میری غزلوں میں آپ کو دونوں دھارے بہتے نظر آئیں گے۔ میرے نزدیک جدّت کا نام مہمل گوئی نہیں ہے، بلکہ اسلوب کے نئے پن کو میں جدّت سمجھتا ہوں۔ کوئی خیال نیا نہیں ہے، صرف اسلوبِ اظہار خیال کو نیا پن دیتا ہے اور غزل کی شاعری میں اسلوبِ اظہار کا نیا پن بڑی مشکل سے پیدا اور حاصل ہوتا ہے ۔

حرفِ اوّل

غزل ہیئت کے اعتبار سے قدیم ہی نہیں قدیم تر ہے مگر اسلوب اور تاثر کے اعتبار سے جدید بلکہ جدید تر !!

ہیئت سے مُراد غزل کی وہ ظاہری صُورت ہے جو دُوسری اصنافِ شعر سے اس کو ممیّز کرتی ہے یعنی قافیے، ردیف کی پابندی، مخصوص بحروں (مثنوی کی بحروں کے سوا) کا استعمال، اور مطلع اور مقطع کا عام لزوم جو سینکڑوں سال سے چلا آرہا ہے وغیرہ وغیرہ۔

غزل کے مجموعی تاثر میں ہیئت کو بڑا دخل ہے اور جو لوگ اس رمز سے نابلد ہیں وہ بغیر سوچے سمجھے غزل کی ہیئت یعنی ردیف قافیہ کی پابندی پر اعتراض کر دیتے ہیں اور بزعم خویش سمجھتے ہیں کہ اُنھوں نے کوئی " دریافت " کی ہے حالانکہ اس سے زیادہ مضحک اور کوئی بات نہیں !!

شعر کا موسیقی سے گہرا تعلق ہے، موسیقی جاننے والے جانتے ہیں کہ نغمگی کا کوئی تاثر " تال " اور " سم " کے بغیر پیدا نہیں کیا جا سکتا، موسیقی میں تال اور سم کو بنیادی حیثیت حاصل ہے: تال موسیقی کی لَے کو برقرار رکھتی ہے اور سم تال کی بنیادی حیثیت کو قائم رکھتا ہے، جُوں جُوں لَے تیز ہوتی جائے گی سم پر پہنچنے کی رفتار تیز ہوتی جائے گی مگر یہ نہیں ہوگا کہ سم کی جگہ بدل جائے اور اس طرح لَے کا وہ دلکش اور حسین تاثر جس نے نغمگی کا ایک دائرہ پیدا کیا ہے اور جو مسلسل بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے اور جس نے اپنی لپیٹ میں تمام سُننے والوں کو لے لیا ہے ٹوٹ جائے اور اس طرح تمام تاثر ہی خراب ہو جائے۔ تال اور سم کی یہی اہمیت رقص کی جان ہے اور یہی وہ مرکزی نکتہ ہے جو قافیہ اور ردیف کا نہ صرف جواز پیدا کرتا ہے بلکہ اس کی اہمیت کو دوچند کر دیتا ہے۔ شعر میں نغمگی کی یہ تاثیر صرف

قافیہ ہی پُوری طرح قائم نہیں کرتا اس کے قائم کرنے میں ردیف کو بھی بڑا دخل ہے۔

قوافی عام طور پر اسماء پر مشتمل ہوتے ہیں اور ردیف افعال پر، یا فعل کا کوئی مشتق ٹکڑا ردیف کی صُورت اختیار کرتا ہے اور جیسا کہ صرف و نحو کا قاعدہ ہے کہ کوئی جُملہ فعل کے بغیر بامعنی نہیں ہوتا بالکل اسی طرح ردیف کے بغیر شعر کا تاثر مکمل اور بامعنی نہیں ہوتا۔ غیر مُردّف غزلوں سے اس کی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ ایک غزل جس کا قافیہ ردیف "فریاد کیا کرتے" اور "یاد کیا کرتے" ہو اس غزل کے مقابلے میں جس کا قافیہ صرف "فریاد" اور "یاد" ہو زیادہ پُر تاثیر ہوگی۔ تاثیر کی اس کمی کا سامنا ان غزلوں کو کرنا پڑتا ہے جو غیر مُردّف ہوں۔ چہ جائیکہ وہ اشعار جو قافیے اور ردیف کی "تاثراتی حدُود" سے بے نیاز ہوکر کہے گئے ہوں۔ ایسے اشعار دِل و دماغ پر کوئی اثر نہیں چھوڑتے۔ اس سے معلُوم ہوا کہ شعر میں نغمگی کے لئے تال اور سَم کی طرح قافیہ اور ردیف دونوں نہایت ضروری ہیں۔ جو لوگ قافیہ اور ردیف کی پابندیوں سے آزاد ہوکر شعر کہتے ہیں وہ شعر کی نغمگی کے راز سے ناواقف اور بے بہرہ ہیں۔

قوافی کے جواز کا ایک پہلُو یہ بھی ہے کہ وہ "عنوانِ مضموں" ہوتے ہیں۔ قوافی کے ذہن میں آتے ہی بہت سے مضامین بھی ذہن میں آجاتے ہیں بلکہ اُن کے اظہار کا پیرایہ بھی، اور ردیف کی پابندی پیرایۂ اظہار کو ایک دلفریب شکل دے کر سونے پر سُہاگہ کا کام کرتی ہے۔

اسلوب کے متعلق یہ ہے کہ غزل کے اسلوب میں، ہیئت، زبان و بیان کی تدریجی ترقی، خیالات کی جدّت طرازی، احساسات کی نزاکتیں، معاشرے اور تمدّن کے بَدلتے ہوئے تقاضے، سیاسی اور معاشی شعور کی بیداری، قاری اور سامعین کے ذہن کی رفعتیں، اور پھر شاعر کی اپنی قوتِ بیاں، لطافتِ احساس فکری بلندی، زبان اور بیان پر قدرت، اس کا تہذیبی تجربہ اور تمدّنی اور معاشرتی قدروں سے اُس کے اپنے لگاؤ اور تعلّق کو بڑا دخل ہے۔ غزل میں اسلوب پیدا کرنے کے لئے آدمی مظہر جانِ جاناں کی طرح گمبھیر شخصیت رکھتا ہو یا میر تقی میرؔ کی طرح ایک درد مند دِل، یا غالبؔ کی طرح شوخ و فطین ہو یا پھر فانی کی طرح پامرد!! شاعری کی مروّجہ اقدار کا باغی بننا آسان نہیں، دَم توڑتے ہوئے ایک بھرپُور معاشرہ کا ماتم بچّوں کا کھیل نہیں، بگڑتے ہوئے عظیم سیاسی نظام کے اثرات پر زہر خند کرنا ہنسی ٹھٹھا نہیں، اور ساری عمر کی سوگواری دل لگی نہیں۔

صرف اسلوب غزل کو جدید اور جدید تر بناتا ہے، جھگڑے اور راکٹ کے زمانے کے اسلوب میں بدیہی فرق ہونا چاہیئے اور ہوتا بھی ہے ؎

مَیں چاہا حالِ دل اپنا کہوں جس پاس عالم میں
بیاں کرنے لگا قصہ وہ اپنی ہی خرابی کا

کے مقابلے میں یہ شعر ؎

رہی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ کشتۂ تیغِ ستم نکلے

زیادہ جدید ہے اور یہ شعر ؎

اِدھر سے بھی ہے سوا کچھ اُدھر کی مجبوری
کہ ہم نے آہ تو کی اُن سے آہ بھی نہ ہوئی

زیادہ جدید تر ہے اور اسلوب کا یہی فرق ہے جو زمانے اور حالات کے مطابق پیدا ہوتا ہے مگر یہ اسلوب بڑے شاعروں کا ہے۔ آج بھی میرؔ، غالب اور فانیؔ جدید ہیں اور اپنے اسلوب کے اعتبار سے صاحبِ طرز!! ظاہر ہے یہ لوگ زمانے کے اعتبار سے جدید نہیں بلکہ "ذہنِ شاعری" کے اعتبار سے لیکن ابھی اِس "ذہن شاعری" کو اور آگے لے جانے والا پیدا نہیں ہوا جسے جدید تر کہا جا سکے۔

وہ لوگ جو فن (آرٹ) کو وجدانی اور محض وجدانی سمجھتے ہیں آرٹسٹ اور آرٹ کے عوامل سے ناآشنا ہیں، میرے نزدیک فن (آرٹ) آمد اور آورد کی مجموعی صورت ہے۔ آمد سے میری مُراد وہ وجدان ہے جو کسی تخلیق کے وقت آرٹسٹ پر طاری ہوتا ہے اور آورد سے میرا مطلب وہ محنت اور جفاکشی ہے جو اس وجدان کو متشکل کرنے اور اُسے مُقید کرنے اور گرفت میں لانے کے لئے کرنی پڑتی ہے۔ دُوسرے الفاظ میں یُوں کہیئے کہ آرٹسٹ کا "تخلیقی تصوّر" آمد ہے اور اُسے تخلیق دینا آورد!! جو لوگ آرٹ کو صرف وجدان سمجھتے ہیں وہ اس کے تصوری پہلو پر نظر رکھتے ہیں اور تخلیقی عوامل سے خود بھی ناآشنا ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی بے بہرہ رکھنا چاہتے ہیں۔ اُردو ادب کے وہ سینکڑوں شعر جو اپنی برجستگی کے سبب زبان زدِ خاص و عام ہیں نہ معلوم کتنی کاوش، کتنی تراش خراش اور کتنی راتوں اور دنوں کی دِلسوزی کے بعد موجودہ شکل میں آئے ہوں گے اور آج بظاہر وہ کسی غیر معمولی آمد کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں۔

غزل کے خلاف ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ وہ فارسی کی نقالی ہے اور یہ بات وہ لوگ کہتے ہیں

جو خود اُردو شاعری کو "ہنس" بنا دینا چاہتے ہیں اور خود اپنی چال بھول جانے پر مُصر ہیں۔ یہ درست ہے کہ اُردو غزل فارسی غزل کا اتباع ہے یا بقولِ معترض نقّالی ہے مگر اس عمل کو تین چار سو سال گزر گئے اور اب یہ اتباع اتباع نہیں رہا۔ یہ نقّالی نقّالی نہیں رہی بلکہ ہمارے ادب میں خود "اصل" کی حیثیت رکھتی ہے ویسے بھی تمدّنی اعتبار سے ہم فارسی سے زیادہ قریب ہی نہیں بلکہ اسی تہذیب کے پروردہ ہیں۔ انگریزی تہذیب و تمدّن سے ہم مزاجاً ابھی ہزاروں میل باوجود نقّالی کے دُور ہیں۔

ہم نے فارسی شاعری کے اتباع یا فارسی شاعری کے مزاج کو اپنانے میں جو کوشش کی ہے اس میں اردو کے مزاج اور اس کے مزاج اور اس کے خواص کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھا مگر انگریزی ادب کے پیرو اُردو کے مزاج کا خیال نہیں رکھتے اور اسے ایک ایسا تیتر بنا دینا چاہتے ہیں جو آدھا بٹیر بھی ہو۔ اس اندھی تقلید کا نتیجہ یہ ہے کہ اُردو کا سارا خمیر ہی بگڑا جا رہا ہے اور شاعری تو ایک طرف خود اُردو ہی کے لالے ہیں۔

ہم نے مروّجہ اقدار سے بغاوت کو جدّت کا نام دے رکھا ہے خواہ وہ بغاوت بالشتیوں ہی نے کی ہو، لوگ نہیں جانتے کہ روایت سے دامن چھڑانا کس قدر مشکل ہی نہیں بلکہ محال ہے بروایت سے دامن چھڑانے والے اُصولِ ارتقاء سے نابلد ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ آدمی کو لکیر کا فقیر نہیں ہونا چاہیئے بدلتے ہوئے زمانے کے تقاضوں کو پُورا کرنا لازمی ہے اور جدید حالات اور جدید خیالات کے ساتھ چلنا زندگی کا اصول ہونا چاہیئے اور ہوتا بھی یہی ہے کہ زندگی آپ سے آپ جدید حالات سے متاثر ہوتی چلی جاتی ہے کوشش سے اس رفتار کو تیز ضرور کیا جاسکتا ہے۔ مگر ان تقاضوں کی آڑ میں تبدیلی کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اپنی روایات اور اقدار میں اس قدر مسخ ہو کر رہ جائیں کہ ہماری نسل ہی کا پہچاننا مشکل ہو جائے۔

راکٹ کے اس زمانے میں یہ ممکن ہی نہیں کہ آدمی حالات سے متاثر نہ ہو مواصلات نے ہماری دنیا کو اس قدر چھوٹا کر دیا ہے کہ اب لندن اور کراچی کے رہنے والے ایک ہی خاندان کے افراد ہیں۔ ان کی خواہشات اور ان کی ضروریات یکساں ہیں۔ ان کی داخلی اور خارجی کیفیات ایک جیسی ہیں اسی لئے اُن کے متاثر ہونے اور متاثر کرنے کے وسائل بھی مختلف نہیں۔ لہٰذا ایک غزل کہنے والا بھی وہی کچھ

محسوس کرتا ہے جو ایک سونیٹ یا FREE VERSE کہنے والا محسوس کرتا ہے۔ صرف ذریعۂ اظہار کا فرق ہے اور یہ فرق قائم ہے اور رہے گا۔

غزل کے CANVAS کی یہ وسعت کہ اُس میں حیات انسانی کے تمام پہلو سما جاتے اور سمو جاتے ہیں۔ دوسری اصنافِ سخن کے لئے باعثِ رشک ہے، ماحول اور جدید تقاضوں سے متاثر ہونے اور متاثر کرنے کی جس قدر صلاحیت غزل میں ہے دوسری اصنافِ سخن میں کہاں؟ دو سو سال پُرانا غزل کا کوئی شعر اپنے تاثر کے اعتبار سے آج بھی نیا ہے اور آج کل کے حالات کی ایسی ترجمانی کرتا ہے کہ اس کی قدامت پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ اچھا شاعر اپنے ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مظہر جانِ جاناں، میر، مومن، غالب، فانی اور یگانہ ان میں سے کون ہے جو اپنے زمانے کے سیاسی یا معاشی حالات سے متاثر نہ ہوا ہو اور معاشرہ کا کون سا ایسا مسئلہ ہے جو غزل کی زبان میں ان بزرگوں نے بیان نہ کیا ہو۔

غزل پر ایک الزام یہ ہے کہ اس میں سوائے عشق عاشقی کے اور ہے کیا؟ لیکن کبھی یہ بھی سوچا گیا کہ خود عشق حیاتِ انسانی کا کتنا بڑا مسئلہ ہے۔ عشق اور اس کے احساسات کا بیان کس طرح فرسودہ قرار دیا جا سکتا ہے جبکہ عشق ازل سے کار فرما ہے اور ابد تک کار فرما رہے گا۔ عشق کوئی فیشن نہیں جسے ہر چھٹے مہینے بدل دیا جائے۔ مجنوں کے ہجر اور آپ کے ہجر میں کوئی فرق نہیں صرف اس کے فعالی اور انفعالی تاثرات میں فرق ہو سکتا ہے۔ ایک شخص عاشق ہو کر خودکشی کر لیتا ہے اور دوسرا عاشق ہو کر محبوب ہی کو ہلاک کر دیتا ہے۔ ہجر و وصال کی کیفیات ہر شخص پر گزرتی ہیں۔ صرف ان کا فعالی اور انفعالی تاثر ہی فرق پیدا کرتا ہے اور یہی فرق بیان اور اظہار کے طریقے بھی اُسی مناسبت سے مُقرر کرتا ہے۔

شاعری عوام کے جذبات کی ترجمانی ضرور کرتی ہے لیکن عوام کے لئے نہیں ہوتی اور یہی حال ہر آرٹ کا ہے۔ مصوری کی کتنی باریکیاں عوام سمجھتے ہیں، موسیقی کی کتنی نزاکتوں سے عام آدمی لُطف اندوز ہوتا ہے، یہ نعرہ لگانا کہ شاعری کو عوامی ہونا چاہیئے، عام آدمی کو فریب دینا ہے۔ میر کا یہ شعر لیجئے۔

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے

اور عام آدمی سے پُوچھئے کہ اس کا کونسا لفظ ایسا ہے جو سمجھ میں نہیں آتا وہ کہے گا کوئی لفظ ایسا نہیں، پھر اس سے اس کے معنی پوچھئے، وہ نہیں بتا سکے گا۔ معلوم ہوا کہ عوام (آرٹ) شاعری کے پرکھنے والے نہیں ہوتے، اور اچھی شاعری کو قبولِ عام کی سند عوام سے نہیں خواص سے ملتی ہے۔ شاعری پہ "عوامی" اور غیر عوامی کا لیبل لگانا ایک خاص ذہنیت کے لوگوں کا کارنامہ ہے جن کو ادب کی "تحریک" مُلک کے باہر سے ملتی ہے ان کی یہ کوشش دانستہ ہے کیونکہ وہ اس آڑ میں سیاسی تحریکیں چلانی چاہتے ہیں اور اگر وہ ادب کو "غیر عوامی" رہنے دیں تو وہ طبقہ جو اس "غیر عوامی" ادب کی طرح خود بھی "غیر عوامی" ہے ان کی سیاسی تحریکوں سے متاثر نہیں ہوگا اور اس طرح ان کا وہ مقصد ہی فوت ہو جائے گا جو وہ عوامی ادب کی آڑ میں پُورا کرنا چاہتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس عوامی ادب میں سیاست زیادہ اور ادب بالکل نہیں ہوتا۔

ادب کا کوئی ٹکڑا خواہ وہ نظم ہو یا نثر بالکل سپاٹ نہیں ہونا چاہیئے، لطافت اور نزاکت ادب کی جان ہے ورنہ صحافت اور ادب میں کیا فرق رہ جائے گا۔ شاعر کو سمجھنے کا یہ طریقہ غلط ہے کہ شاعر کو اپنے ذہن کے برابر لایا جائے اور پھر اس کے فن کو پرکھا جائے۔ حالانکہ ہونا یہ چاہیئے کہ اپنے ذہن کو شاعر کے ذہن کے برابر لایا جائے اور پھر اس کے فن کا مطالعہ کیا جائے۔ جب تک غالبؔ کے ذہن کے برابر لوگ اپنا ذہن نہیں لائے غالبؔ کو لوگ نہیں سمجھ سکے۔

غزل جدید کا دَور غالبؔ سے شروع ہوتا ہے، غزلِ جدید کو آگے لے جانے والوں میں فانیؔ اور یگانہؔ ہیں۔ مگر زمانے کی ناقدری نے ان دونوں کو ابھی وہ مقام نہیں دیا جس کے وہ مستحق ہیں۔ فانیؔ اور یگانہ کا اسلوب اپنے تمام پیشروں سے مختلف ہے۔ فانیؔ نے نطشے کے قول کے مطابق "درد کو روحانی بنالینا ترقی ہے۔" پر عمل کیا اور یگانہ نے سقراط کی طرح تلخاب کو شیریں بنا کر قبول کیا۔

یادِ ایّامِ صحبتِ فانی

جناب تابش دہلوی اُردو کے خوش فکر نوجوان شاعر ہیں۔ برسوں تک جناب فانی بدایونی کے ساتھ رہے ہیں۔ اس مضمون میں انھوں نے اپنی اور فانی مرحوم کی چند صحبتوں کا ذکر کیا ہے جو آئندہ ان کے سوانح نگار کے لئے کار آمد ہوگا۔

(برہان)

دہلی سے پہلے پہل حیدرآباد (دکن) جاتے ہوئے ایک ہم سفر دوست نے فانی بدایونی مرحوم کی "باقیات" پڑھنے کے لئے دی، باوجود کوشش کے کچھ پلّے نہ پڑا، دماغ تو "کس نے بوسے تیرے گن گن کے لئے" پر دل کی طرح دھڑکنے کا عادی تھا اور ذہن میں "غیر کی ہو کے رہے یا شب فرقت میری" کے رشک کے علاوہ ہر احساس ناپید تھا اور فکر اس بار سے دبی پڑی تھی کہ "بوجھ اٹھواتے ہیں اب ناز اٹھانے والے" بھلا اس حال میں "ٹوٹا طلسم ہستیٔ فانی کے راز کا۔ احسان مند ہوں الم جانگداز کا" جیسے اشعار دل و دماغ میں کیا پیوست ہوتے، غرض تمام حواس "شعری کثافت" سے آلودہ تھے۔ "باقیات" ایک ہی دفعہ میں کیا جلا کرتی!! میں نے تنگ آکر واپس کر دی۔

حیدرآباد (دکن) میں جن عزیز کے یہاں مقیم ہوا ان کے پاس بھی "باقیات" دیکھی اور ان کو فانی

کا مداح بھی پایا، انھوں نے مجھے پڑھنے کے لئے دی، میں نے رشید احمد صدیقی کے مقدمے سے لے کر "عرضِ حال" تک پڑھ ڈالی، کچھ پتے نہ پڑا، پھر پڑھی، اب دماغ میں کہیں کہیں "باقیات" کے اشعار پیوست ہونے لگے، پھر پڑھی پھر پڑھی، یہاں تک کہ آدھی سے زیادہ ازبر ہوگئی اور دماغ کو بھی نصف سے زیادہ مجلی کر گئی۔ غرض یہ تھا وہ غائبانہ نیاز جو فانی سے حاصل ہوا اور اب جو ایک مستقل یادگار بن کر دل کی زندگی ہو کر رہ گیا ہے۔

مہاراجہ کشن پرشاد صدر اعظم دولتِ آصفیہ ہندوستان کی اُن ذی مرتبت ہستیوں میں سے تھے جن پر ہندوستان ہمیشہ فخر کرے گا۔ اُن کا قرب گنگا اور زمزم کا سنگم معلوم ہوتا تھا۔ ان کی ذات ہندوؤں اور مسلمانوں کی تہذیب کا بہترین نمونہ تھی، مہاراجہ وہی آداب و مراتب ہر شخص کے ساتھ برتتے تھے جو خود ان کے شایانِ شان ہوتے تھے، وہ خود بھی عمدہ شاعر تھے، اربابِ ذوق اور اہلِ کمال کے ہجوم ان کے درباروں کی زینت تھے، فانی پر ان کی خاص چشمِ کرم تھی، مہاراجہ بہادر فانی اور کلامِ فانی کو بہت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، چنانچہ جب فانی کی وکالت آگرہ میں غیر معمولی ادبی شغف اور دوست پرستی کی وجہ سے نہ چلی تو مہاراجہ ہی نے ان کو حیدرآباد آنے کی دعوت دی۔

جامعہ عثمانیہ کے ایک اقامت خانہ (غالباً فرحت منزل عدنان باغ) میں جب جامعہ عارضی طور پر جولس کمپنی کے قرب و جوار کی عمارتوں میں تھی، فانی کے اعزاز میں مہاراجہ بہادر کی صدارت میں ایک بزم مشاعرہ ترتیب دی گئی جس میں حیدرآبادی اور غیر حیدرآبادی تمام معروف شعراء شریک ہوئے۔ میں بھی اپنے عزیزوں اور دوستوں کے ہمراہ ایک طویل شوق کے ساتھ مشاعرہ میں شریک ہوا، ظاہر ہے کہ اس قدر ستھری محفل میں کس قدر لطف نہ آیا ہوگا، مگر وہ لطف آج بھی ویسا ہی محسوس ہوتا ہے جب کسی نے "سرورِ عقل و غمِ عشق کے دور لے پر" بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا دیئے تھے اور جب کسی نے "شبِ غم کو بے نیازِ سحر بنا کر تعینات کے پردے اٹھا دینے" پر آسمان کی طرف شکر آمیز نگاہوں سے دیکھا تھا! فانی کو پہلی دفعہ دیکھ کر یقین نہ آیا کہ "باقیات" انہی کی تصنیف ہے کیونکہ آج کل بڑے شاعروں کی صورت بھی خاص قسم کی ہوتی ہے۔ ان کا بھرا بھرا جسم تھا، موزوں قد تھا، گندمی رنگ تھا، خد و خال بہت صاف تھے، آنکھیں روشن اور چھوٹی تھیں، چہرہ پر غیر معمولی متانت اور ذہانت کے آثار نمایاں تھے۔ لباس سادہ مگر نفیس تھا،

غرض ہم تعجب اور شوق کی فراوانی لئے گھر واپس آئے۔

دوسرے دن محترم دوست حیرت بدایونی سے نیاز حاصل ہوا، میں نے مشاعرہ کا حال بیان کیا اور اپنا شوقِ ملاقات ظاہر کیا، انھوں نے ایک دن کا تعین کر کے مجھے متعارف کرانے کا وعدہ فرمایا۔

ہم مقررہ دن پر فانی کے گھر پہنچے، فانی تلے پلی[1] کے ایک سرکاری مکان میں قیام پذیر تھے۔ گرمیوں کے دن، شام کے وقت، گھر کے سامنے کے میدان میں چھڑکاؤ کر کے دس بارہ کرسیاں ڈال دی گئی تھیں۔ میں اور حیرت صاحب جب پہنچے تو فانی برآمد تھے، ہم کو دیکھتے ہی نہایت خندہ پیشانی سے کھڑے ہو کر حیرت صاحب کو فرمایا "آئیے آئیے۔"

ہم لوگ کرسیوں پر بیٹھ گئے، حیرت صاحب سے میرے متعلق پوچھا "آپ کی تعریف؟"

حیرت صاحب نے مجھے متعارف کرایا، فرمایا "خوب خوب آپ شعر کہتے ہیں غزل سنائیے۔"

میں نے غزل پڑھی جس کا مقطع تھا ؎

تابش یہ مختصر سی ہے رودادِ زندگی
دُنیا سے جا رہا ہوں میں دُنیا لئے ہوئے

پسند فرمایا اس کے بعد دوسری کی فرمائش کی، میں نے عذر کیا اور ان سے استدعا کی کہ اگر بارِ خاطر نہ ہو تو کچھ آپ مرحمت فرمائیے، کچھ توقف کے بعد "فیروز" کہہ کر آواز دی، یہ فانی کے بڑے صاحبزادہ تھے وہ آئے تو بیاض منگوا کر غزل سُنائی جس کا ایک شعر آج بھی نقش ہے ؎

میری نظروں میں تو بیواسطۂ دید ہے تو
میں بعنوانِ تجلی بھی تجھے یاد نہیں

غزل ایک خاص انداز سے پڑھتے تھے جس میں اپنی ذات کی طرح ایک انفرادیت رکھتے تھے۔ غزل پڑھ کر بیاض بند کر دی، میں نے مزید استدعا کی۔ فرمایا آپ نے سات شعر سُنائے ہیں، میں نے بھی اتنے ہی پڑھے ہیں۔" اس کے بعد حیرت کے اصرار پر دوسری غزل پڑھی، غرض اسی شعر و شاعری میں دو گھنٹے کی صحبت کے بعد ہم لوگ گھر آ گئے۔

اس ملاقات کے بعد میں تقریباً دو دن بیچ ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا، فانی سے مل کر میں نے اپنے آپ کو ایک بالکل انوکھے آدمی کے قریب محسوس کیا، انوکھا میں نے اس لئے کہا کہ فانی عام

---

[1] حیدرآباد کا ایک محلہ

آدمیوں سے بالکل مختلف تھے، "قوائے ظاہری" تمام آدمیوں کے یکساں ہوتے ہیں اور اکثر "قوائے باطنی" بھی، فانی اپنے "قوائے ظاہری" کے اعتبار سے عام لوگوں کی طرح نہ تھے۔ کیونکہ جب میں ان سے ملا ہوں تو وہ ساٹھ کے پیٹے میں تھے مگر وہ چھیالیس سال سے زیادہ معمر نہ معلوم ہوتے تھے اور موت سے قبل وہ اپنی عمر سے زیادہ ضعیف دکھائی دیتے تھے۔ بالفاظِ دیگر ان کے "قوائے ظاہری" کی جوانی سُست رفتار تھی اور بوڑھاپا بیحد تیز رفتار۔ عام حالتوں میں ایسا نہیں ہوتا۔ "قوائے باطنی" کے اعتبار سے وہ بالکل انوکھے تھے۔ غم ان کی زندگی تھا، اس سے مراد یہ نہیں کہ وہ رات دن رویا کرتے تھے بلکہ وہ غم سے زندگی حاصل کرتے تھے۔ غم سے غم اخذ کرنا ان کے نزدیک گناہ کے مترادف تھا بلکہ وہ غم سے خوشی حاصل کرنے کو زندگی سمجھتے تھے اور اسی کو منشائے زندگی بھی، وہ صرف نظریات کی حد تک "قنوطی" نہیں تھے بلکہ عملی طور پر بھی وہ "قنوطیت" سے خوشی کا فائدہ اٹھاتے تھے اور انھوں نے اس طرح "نظریۂ قنوطیت" کو دُنیا کے سامنے اضافہ کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کے تصورات اس دنیا کے تصورات سے مختلف تھے وہ ہر تصور میں "اجتہاد" کو بہت پسند کرتے تھے لیکن "غلط اجتہاد" کو نہیں۔

فطرتاً "جبرِ کل" کے قائل تھے لیکن آدمی کو کہیں مختارِ کل اور کہیں مجبورِ محض بھی مانتے تھے اور اس نظریہ کی ترجمانی انہوں نے شاید اس شعر میں کی ہے ؎

فانی ترے عمل ہمہ تن جبر ہی سہی　　　　سانچے میں اختیار کے ڈھالے ہوئے تو ہیں

فانی اپنی شاعری کے لئے تحریکِ شعر اپنے "اندرونی حواس" سے پیدا کرتے تھے بلکہ یوں سمجھئے کہ وہ بقول غالب "اک محشرِ خیال" تھے اور اپنی انجمن خود تھے۔ یہ تحریکِ شعر "ادراکِ غم" ہوتی تھی، یہ غم، نہ غمِ عشق تھا اور نہ غمِ روزگار اس میں شک نہیں کہ یہ "ادراکِ غم" ان میں پیدا ہوا تھا غمِ عشق اور غمِ روزگار ہی سے، نتیجتہً وہ دُنیا کی نگاہ میں غم سہی لیکن فانی کی زندگی تھا۔

وہ دُنیا کی ہر چیز کو "حِس" کی طرح قبول کرتے تھے، ان کی زندگی کی ناکامی کا ایک راز یہ بھی ہے، حالانکہ دُنیا میں بہت سی چیزیں ایسی بھی ہیں جن کو غیر محسوس ہی چھوڑ دینا عقلمندی ہے۔ کردار میں خودداری اور شرافتِ نفس کا جذبہ مکمل تھا، ایک واقعہ اس کی روشن دلیل ہے۔

فانی کی رفیقۂ حیات جس وقت ان سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوئیں، فانی کے پاس جو کچھ جمع پونجی

تھی وہ ان کے علاج میں صرف ہو چکی تھی اور اب تجہیز و تکفین کے لئے بھی کچھ نہ تھا، ایسے نازک وقت پر فانی کے ایک مخلص دوست نے جو حیدرآباد کے ایک معزز جاگیردار ہیں فانی کی مدد کرنی چاہی بجائے اس کے کہ فانی اس مدد کو شکریہ کے ساتھ قبول کر لیتے، فانی نے ایک خاص انداز میں کہا کہ آپ ایسے نازک موقع پر مجھ کو خریدنا چاہتے ہیں میں آپ کی اس محبت کا بیحد ممنون ہوں !! اگر آپ کو میری کوئی مدد کرنی ہی منظور ہے تو آپ یہ کر سکتے ہیں کہ عرفانیاتِ فانی (جو تازہ تازہ شائع ہوئی تھی) کے چند نسخے خرید لیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، ان کتابوں سے جو روپیہ جمع ہوا اس سے تجہیز و تکفین ہوئی، اللہ اللہ یہ اس شخص کی زندگی کا واقعہ ہے جو ہمیشہ زندگی میں خود دار رہنے کی ایک کامیاب کوشش بعنوانِ غم ہر نفس کے ساتھ کرتا رہا تھا اور جس نے زندگی کے وہ نشیب و فراز دیکھے تھے جو واقعی دوسروں سے اس کو ممتاز کر گئے، ایسے نازک وقت میں اپنے کردار کی انفرادیت قائم رکھنا فانی ہی جیسے لوگوں کا کام تھا۔

مزاج میں طنز اور مزاح کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ طنز میں کسی کی دلآزاری نہیں کرتے تھے بلکہ اس ڈھب سے طنز کرتے تھے کہ بیک نگاہ آدمی محسوس بھی نہیں کر سکتا تھا اور یہی حال مزاح کا تھا۔ ان کے مزاج دان ان کے طنز اور مزاح کو خوب سمجھتے تھے اور خود فانی ایک خاص انداز سے ان لوگوں کی طرف دیکھتے تھے جس کا مطلب وہی لوگ جانتے تھے جن کی طرف اُنھوں نے دیکھا تھا۔

خوش خلقی کی وجہ سے اکثر دلچسپ واقعات سے دوچار ہو جاتے تھے، کبھی ایسا ہوتا کہ فانی کی شہرت سُن کر ایسے لوگ اُن سے ملنے آتے جن کو شعر کہنے کا سلیقہ تو کُجا قدرت نے طبیعت بھی موزوں نہیں دی تھی مگر ادعائے شعر گوئی میں اپنی جگہ منفرد تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ ہم دوچار آدمی پہنچے تو دیکھا کہ محفلِ شعر و سخن گرم ہے اور فانی داد دے رہے ہیں، ہمارے پہنچتے ہی ایک صاحب کو ہم لوگوں سے متعارف کرایا کہ یہ قمر صاحب ہیں بہت عمدہ شعر کہتے ہیں، بیٹھ جانے کے بعد جو انھوں نے عروض کی قیود سے آزاد ہو کر شعر سُنانے شروع کئے تو خدا کی پناہ! مگر فانی، واہ! سبحان اللہ!! کہے جاتے ہیں۔ بہت دیر کے بعد جب قمر صاحب اپنی دانست میں ہم لوگوں سے کافی دادِ سخن لے چکے تو چلے گئے، بعد میں معلوم ہوا کہ فانی چھ گھنٹے سے ہلاک ہو رہے تھے۔

بعض اوقات فانی بہت دلچسپ باتیں کرتے تھے جن سے بالکل بچوں کی سی معصومیت ظاہر ہوتی، ایک دفعہ سرِشام میں اور ہادی بدایونی پہنچے تو دیکھا کہ محلّے کے چند لڑکے فانی کے ارد گرد جمع ہیں اور فانی اپنے اشعار بہت ہی کیف آور ترنم میں سُنا رہے ہیں، یہ دیکھ کر تعجب ہوا کیونکہ فانی اپنے اشعار بہت کم سُنایا کرتے تھے، ہم دونوں کو دیکھ کر کہنے لگے "خوب آئے دو غزلیں کہی تھیں کوئی تھا نہیں، ان بچوں کو سُنا رہا تھا، اب تم آ گئے ہو، تم بھی سُن لو" یہ کہہ کر دونوں غزلیں دوبارہ پڑھیں، غزلیں تھیں جن کے مقطع یہ ہیں ؎

خود تجلی کو نہیں اذنِ حضوری فانیؔ　　آئینے ان کے مقابل نہیں ہونے پاتے

اس کو بھولے تو ہوئے ہو فانیؔ　　کیا کرو گے وہ اگر یاد آیا

مجھ سے بہت مانوس ہو گئے تھے۔ اکثر موٹر بس مجھے اپنے ہمراہ لے کر سیر کو دُور دُور نکل جاتے تھے۔ کبھی شام اکبر آبادی بھی ساتھ ہوتے تھے میں اگر زیادہ عرصہ کے بعد جاتا تو شکایت کرتے اور دوسروں سے بھی مجھے دریافت کرتے اکثر خود بھی آغا پورہ[1] تشریف لے آتے۔

فانی کے حیدر آباد کے ابتدائی دوران قیام میں جوش ملیح آبادی، ہوش بلگرامی، آزاد انصاری، حیرت بدایونی وغیرہ اُن کے پاس زیادہ آتے جاتے تھے اور شعر و سخن کی دلچسپ صحبتیں گرم رہتی تھیں۔ پھر اور دوستوں میں اضافہ ہو گیا تھا، نواب نثار یار جنگ مزاج، ہادی بدایونی، مسعود علی محوی، ماہر القادری، ناظم صدیقی، ماسٹر فدا حسین، صدق جائسی، نواب تراب یار جنگ سعید اور میں اکثر ان کے یہاں آتے جاتے رہتے تھے۔ فانی بہت دوست پرست اور خلیق تھے ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی تھی کہ وہ اپنے دوستوں کو ترقی دیں لیکن بدقسمتی سے اِس کے باوجود ان کو کوئی دوست میسّر نہ آیا ورنہ زندگی کی تلخیاں شائد کم ہو جاتیں۔

جوش ملیح آبادی اور حکیم آزاد انصاری سے ان کے مراسم بہت خاص تھے ان دونوں کی قربت میں فانی بہت خوش نظر آتے تھے اور یہی حال ان دونوں کا تھا۔ پرانی صحبتوں اور انجمن آرائیوں کے تذکرے، نئی دلچسپیوں کی تمہیدیں، شعر و شاعری کی پُرکیف ساعتیں اور پھر آپس کی بے تکلفی عجب مزا دیتی تھی۔

---

[1] ایک محلہ جس میں میرا مکان تھا۔

جامعہ عثمانیہ میں "یومِ جامعہ" کے سلسلہ میں ہر سال ایک مشاعرہ منعقد کیا جاتا ہے۔ چنانچہ غالباً سنہ ۴۷ف میں مہاراجہ بہادر کی صدارت میں ایک مشاعرہ ترتیب دیا گیا، فانی اور میں اڈیکمیٹ[1] شرکت مشاعرہ کے لئے گئے، راستہ میں بارش ہو گئی جس کی وجہ سے تمام فضا بھیگ گئی، منظر کی پُرکیف تبدیلی سے فانیؔ متاثر ہو کر گنگنانے لگے، شعر پڑھا ؎

آکر حیاتِ مستعار نقش بروئے آب ہے   روح کا آنسوؤں بھری آنکھوں میں پاتراب ہے

اس کے بعد کہنے لگے کہ سید سلیمان صاحب ندوی نے اس شعر پر اعتراض کیا ہے" میں نے اُن سے پوچھا کہ ان کو اس پر کیا اعتراض ہے؟ کہنے لگے" انھوں نے 'پاتراب' کو 'پایاب' کے معنی میں سمجھا، میں نے جب واضح طور پر "پاتراب" کے معنی بیان کئے تو اپنی سہو نظری کو انھوں نے قبول کر لیا۔

پھر تمام کلام کی اشاعت کا ذکر ہونے لگا، فرمایا" مہاراجہ بہادر کا ارادہ ہے کہ وہ اس کو شائع کرائیں، اس پر وہ کچھ لکھ بھی رہے ہیں"، انہی باتوں میں ہم جامعہ پہنچ گئے۔

حفیظ جالندھری حیدرآباد آئے ہوئے تھے، مشاعرہ اپنے شباب پر تھا۔ حفیظ نے اپنا "شاہنامہ اسلام" سنایا اس کے بعد فانیؔ نے "کچھ مجھے حشر میں کہنا ہے خدا سے پہلے" اور "کچھ آپ بھی کہیں گے مری التجا کے بعد" یہ دو غزلیں پڑھیں، مشاعرہ سے کوئی ڈیڑھ کے عمل میں ہم واپس ہوئے، واپسی پر مشاعرہ پر تبصرہ ہوتا رہا۔

ایک دن میں نے کہا، فانی صاحب! "سُنا ہے کہ آپ داغ دہلوی کے شاگرد ہیں؟" کہنے لگے "میں نے صرف ایک غزل بذریعہ خط اصلاح کے لئے روانہ کی تھی اس کے بعد پھر کوئی اصلاح نہیں لی۔" اسی سلسلہ میں میں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ میں اپنے اشعار پر اصلاح ان سے لیا کروں، کہنے لگے" اگر تم کو خیاطی سیکھنی ہے تو اور بات ہے کیونکہ اس میں یہ بتایا جا سکتا ہے کہ کتر بیونت کپڑے کی کس طرح ہونی چاہیئے، اس میں شک نہیں کہ شعر کہنے کے لئے مبادیاتِ شعر سے واقفیت نہایت ضروری ہے جو مطالعہ سے آسکتی ہے مگر شاعری مطالعہ سے نہیں آسکتی وہ ودیعت ہوتی ہے اور فطری شاعر کو شاعری سیکھنے کی ضرورت نہیں اب اگر تم اپنی شاعری کو استادی کا محتاج سمجھتے ہو تو ایسی شاعری فوراً چھوڑ دو" پھر تھوڑی

---

[1] وہ علاقہ جس میں جامعہ ہے۔

دیر بعد فرمایا" بعض لوگ شعر کو صرف آرٹ سمجھتے ہیں حالانکہ شعر کو شعر پہلے ہونا چاہیئے یعنی شعریت شعر میں پہلے ہونی چاہیئے، بعد کو آرٹ، اس کے بعد ان پر عمر بھر جو اعتراضات ہوتے رہے ان کا تذکرہ کرنے لگے پھر تھوڑے وقفہ کے بعد فرمایا" میں نے نشر کرنے کے لئے ایک مضمون اسی موضوع پر لکھا ہے اس کو ضرور سُننا۔ یہ مضمون بعد کو رسالہ سب رس میں شائع ہوا۔

میں نے ایک دفعہ پوچھا کہ آپ کو فارسی شعراء میں کون زیادہ پسند ہے۔" فرمایا کہ" غالب اور نظیری" غالب کا فارسی کلام بہت یاد تھا، غالب اور نظیری کی غزلوں کے اکثر اشعار سُنائے جن میں کا یہ شعر مجھے یاد ہے۔ ؎

رندِ ہزار شیوہ را طاعتِ حق گراں نبود　　　لیک صنم بہ سنگ در ناصیہ مشترک نخواست

اردو کے متقدمین شعراء میں میرؔ، مومنؔ اور غالب کے مداح تھے، مومن کا یہ شعر اکثر پڑھتے تھے۔ ؎

ہم بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے　　　تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

موجودہ دور کے شعراء میں آرزو لکھنوی، یاس یگانہ، حسرت موہانی، عزیز لکھنوی، مانی جائسی، شاد عظیم آبادی وغیرہ کو بہت پسند کرتے تھے۔ ایک دفعہ فرمایا کہ میں اور حسرت موہانی بزمانہ تعلیم علی گڑھ میں ایک ہی اقامت خانہ میں رہتے تھے تقریباً بلاناغہ ایک دوسرے کو شعر سُنایا کرتے تھے۔ ایک دن حسرت نے غزل سُنائی جس میں شعر تھا ؎

اب عشق کو درکار ہے اک عالمِ حیرت　　　کافی نہ ہوئی وسعتِ میدانِ تمنا

مجھے بیحد پسند آیا اور میں نے سہ غزلہ کہا لیکن ایسا شعر نہ نکلا۔" اچھے شعر کی جی کھول کر داد دیتے تھے۔ حسرت موہانی کا یہ شعر اکثر پڑھتے تھے ؎

بس کھل گئی حقیقتِ نقاشیِ خیال　　　اپنے ہی رنگ بھر دیئے تصویرِ یار میں

خود اپنے پسندیدہ اشعار کی ایک بیاض مرتب کی تھی جس میں فارسی اور اُردو کے اشعار تھے جس کو طبع کرانے کا ارادہ رکھتے تھے مگر موت نے بہت سے ارادے پورے نہ ہونے دیئے۔ موجودہ دور کے" غلط اجتہادِ شعری"، پر بہت آزردہ ہوتے تھے اور کہتے تھے کہ آج کل چونکہ سامعین کا ادبی ذوق

اچھا نہیں ہے اس لئے یہ غلط اجتہاد پسند کیا جاتا ہے۔

ایک دن میں نے کہا کہ" فانی صاحب آپ نے کبھی دہلی کے کسی مشاعرہ میں شرکت نہیں کی ؟ "
فرمایا" میں ایک دفعہ ہارڈنگ لائبریری کے مشاعرہ میں مدعو تھا اور شرکت کے لئے گیا بھی تھا. ہوٹل میں ٹھہرا غزل بھی کہی تھی جس کا شعر یہ تھا ؎

وحشت بقید چاکِ گریباں روا نہیں   دیوانہ تھا جو معتقدِ اہل ہوش تھا

لیکن شرکتِ مشاعرہ کے لئے نکلا، راستہ میں ایک صاحب سے دریافت کیا کہ یہاں مشاعرہ کہاں ہے، انھوں نے جواب دیا کہ یہاں کوئی "شاعری" وغیرہ نہیں ہے یہ سُن کر مجھے بیحد رنج ہوا اور میں نے کہا کہ اللہ اکبر! یہ وہ دلّی ہے جہاں میر، مومن اور غالب پیدا ہوئے، بس اُلٹے پیروں ہوٹل آیا اور اسٹیشن چلا گیا۔

دہلی کے لوگوں میں بیخود، سائل، ساحر اور اکبر حیدری کا اکثر ذکر کرتے تھے اور کہا کرتے کہ "میں نے دہلی کی بہت خاک چھانی ہے علی گڑھ سے دوسرے تیسرے دن تھیٹر دیکھنے دلی جایا کرتا تھا" دہلی کے ذکر میں فرماتے تھے کہ علی گڑھ میں ایک مشاعرہ میر مہدی مجروح کی صدارت میں ہوا میں نے غزل پڑھی تو ایک شعر میر مجروح نے بہت پسند کیا (مجھے اس شعر کا صرف دوسرا مصرعہ یاد ہے)

ع   وہ بھی صرفِ کشمکشہائے تماشا ہو گیا

مجروح ذرا اونچا سنتے تھے میں نے ذرا اونچی آواز سے شعر مکرر پڑھا بہت پسند کیا اور دعا دی" میں نے کہا کہ" دُعا تو با اثر تھی" ہنس کر خاموش ہو گئے۔ لکھنؤ کو بہت یاد کرتے تھے۔ ان کی زندگی کی مختصر رنگینیاں ان کو زیادہ تر اٹاوہ، لکھنؤ اور کم تر آگرہ میں مقسوم ہوئی تھیں۔ لکھنؤ کے شعراء میں آرزو، وصل بلگرامی اور اثر وغیرہ کا اکثر ذکر کرتے تھے، آگرہ کے دوستوں میں امام اکبرآبادی مانی جائسی وغیرہ کی صحبتوں کا مزے لے لے کر تذکرہ کرتے تھے۔

ایک دفعہ مجھ سے پوچھا " تابش تم پر کبھی ایسا بھی واقعہ گذرا ہے کہ تم اکثر آدمیوں کو اور اکثر مقامات کو دیکھ کر ایسا محسوس کرتے ہو کہ یہ آدمی اور یہ مقام پہلے کہیں تم نے دیکھا ضرور ہے "میں نے کہا کہ "ہاں آدمیوں اور بعض واقعات کی حد تک تو ایسا محسوس ہوتا ہے۔" میں دہلی کے لال قلعہ میں گیا اور

دیوانِ خاص کے قریب جن عمارتوں میں سے ایک نہر بہتی ہے ان کو دیکھ کر یہ معلوم ہوا کہ یہ میرا محل ہے اور میں یہاں رہتا تھا اور یہاں اُٹھتا بیٹھتا تھا۔ غرض یہ جذبہ مجھ پر اس قدر طاری ہوا کہ میں بے اختیار رو دیا اور بہت دیر تک وہاں بیٹھ کر ان مقامات کو دیکھتا رہا وہاں سے اُٹھ کر اپنی اس حماقت پر خوب ہنسا۔"

تھوڑی دیر بعد کہنے لگے "بتا سکتے ہو یہ کیا بات ہے؟" میں نے کہا "میں معذور ہوں" فرمایا قرآن میں ایک آیت ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "ہم اس بات پر قادر ہیں کہ ہر روح کو جدید طور پر دوبارہ خلق کریں۔" شاید یہ دُنیا اور اس دُنیا کی ہر چیز اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت دکھانے کے لئے خدا تعالیٰ کتنی دفعہ خلق کی ہو اور ہم سب بھی جدید طور پر خلق ہوئے ہوں اور پچھلی باتیں ایک خواب کی سی کیفیت لئے ہوئے ہمیں محسوس کرائی جاتی ہوں کہ ہم نے یہ تمام چیزیں اس سے قبل بھی کہیں دیکھی ہیں" ذرا وقفہ کے بعد کہا واللہ اعلم بالصواب۔

اپنی زندگی کے آخری دنوں میں اکثر کہا کرتے تھے کہ "اس دنیا میں ایک چیز بھی بے جگہ نہیں ہے حتیٰ کہ ایک ذرّہ بھی اور موت جس کو کہتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ جو چیز اپنے ماحول میں بے جگہ (MIS - PLACED) معلوم ہوتی ہے وہ ہٹا دی جاتی ہے میں اب یہ محسوس کرتا ہوں کہ میں بھی اپنے ماحول میں اجنبی سا ہوتا جا رہا ہوں"، میں نے فوراً موضوعِ گفتگو بدل دیا۔

ہاشم علی خان صاحب رکن عدالت العالیہ سرکارِ عالی اور فانی ایک دوسرے سے بہت مانوس تھے۔ ہاشم علی خاں صاحب فانی کی مالی امداد کا بھی ذریعہ بنے، فانی کی ملازمت کا سلسلہ جب ختم ہو گیا تو ہاشم علی خاں صاحب نے ان کو عدالت سے کچھ کمیشنز (COMMISSIONS) دلانے شروع کر دیئے تھے جس سے کسی حد تک فانی کی مالی مشکلات میں آسانی ہوئی۔

حفیظ جالندھری حیدرآباد آئے، یہ ان کا دوسرا پھیرا تھا، ہاشم علی خاں صاحب نے ایک دعوت بہت اعلیٰ پیمانہ پر ترتیب دی، اپنے مخصوص دوستوں اور عزیزوں کو مدعو کیا جن میں سے علی یاور جنگ، مہدی نواز جنگ، علامہ ارحسین اور پروفیسر ضیاء الدین انصاری قابلِ ذکر ہیں، ان کے علاوہ فانی، حفیظ جالندھری، ماہر القادری اور میں بھی شریک تھے، رات گئے تک یہ پُرکیف صحبت قائم رہی۔ فانی نے ایک

عجیب انداز سے غزل پڑھی جس کا مطلع تھا ؎

دل کو مٹا کر روح کو تن سے حکم نہ دے آزادی کا　　کوئی تماشا دیکھنے والا چاہیئے اس بربادی کا

اس صحبت کے بعد حفیظ فانی سے ملنے کئی بار ان کے گھر آئے اور جب بھی آئے شاعری کی نشست ضرور ہوئی۔

فانی کا آخری مجموعہ وجدانیاتِ فانی، فانی نے ہاشم علی خان صاحب ہی کے نام سے معنون کیا تھا، مگر طباعت کی خرابی سے شاید وہ دوبارہ طبع کرایا گیا۔ اس میں عرفانیاتِ فانی کے بعد کی چند غزلیں اور کچھ قطعات شامل ہیں۔

کئی سال ہوئے جگر مراد آبادی حیدرآباد تشریف لے گئے۔ فانی کے یہاں مقیم ہوئے، شعر و سخن کی مجلسیں سجنے لگیں، دن رات شاعری اور شعراء موجود رہتے ان میں سے اکثر شعراء ایسے تھے جن سے خود جگر صاحب بھی گریز کرتے تھے مگر وہ ہیں کہ موجود ہیں اور مع بیاض موجود ہیں۔ فانی اکثر اپنی اور ان کی جان چھڑانے کے لئے موٹر میں بیٹھ کر ایک دو آدمیوں کو ساتھ لے کر یا تو قاضی عبدالغفار کے یہاں یا نواب اصغر یار جنگ کے یہاں چلے جاتے تھے اور وہاں ایک دو گھنٹے پرلطف طریق سے صرف کر کے واپس آجاتے تھے، ہم لوگوں نے جگر صاحب کے اعزاز میں ایک مشاعرہ راجہ پرتاب گیرجی کی کوٹھی میں ترتیب دیا۔ مولوی عبدالحق صاحب (سیکرٹری انجمن ترقی اُردو ہند) کو صدر بنایا اور سامعین میں نہایت انتخاب کے ساتھ لوگوں کو جمع کیا جن میں سید ہاشمی فرید آبادی، مولانا مسعود علی محوی، نواب منظور جنگ، نواب نثار یار جنگ، راجہ پرتاب گیرجی، پروفیسر عبدالمجید اور پروفیسر سروری قابلِ ذکر ہیں، شعراء میں فانی، جگر، حیرت بدایونی، شام اکبر آبادی، وجد حیدر آبادی وغیرہ تھے۔ ان کے علاوہ مولانا محوی، سید ہاشمی فرید آبادی وغیرہ نے بھی اپنا کلام سُنایا۔ مشاعرہ کی خصوصیت اور نوعیت کو دیکھ کر فانی نے فرمایا "تابش میری عمر ساٹھ سال سے متجاوز ہے میں نے ایسا مشاعرہ نہیں دیکھا" فانی مشاعروں سے ہمیشہ دُور رہتے تھے اور اس قدر دُور رہتے تھے کہ لوگوں کو اُن کے متعلق غلط فہمی ہوگئی تھی۔ جب مشاعروں کا ذکر آتا تو ہمیشہ بیزاری کا اظہار کرتے، کہتے تھے کہ یا تو مشاعروں سے طرح کا رواج اُٹھا دینا چاہیئے یا کم از کم ایک درجن مصرعہ ہائے طرح ہونے چاہئیں تاکہ ہر شخص آزادی سے شعر کہہ سکے۔

فانی شعر کم کہتے تھے، میں نے پوچھا کہ آپ شعر کس طرح اور کب کہتے ہیں؟ کہنے لگے "دو ماہ

میں ایک غزل کی اوسط ہے وقت مقرر نہیں اور ضرورت سے بھی بعض وقت شعر کہنے پڑجاتے ہیں جو مجھے ناپسند ہوتے ہیں۔

فانی معظم جاہ بہادر کے یہاں اکثر جاتے تھے وہاں نجم آفندی، شاہد صدیقی اور معزالدین سے خوب صحبتیں رہتی تھیں، معظم جاہ بہادر فانی کا احترام کرتے تھے۔

جب سے جنگ چھڑی اس وقت سے لڑائی کے حالات پر زیادہ بحث کرتے تھے، ہندوستان کی حفاظت اور اس کے دفاع پر اکثر باتیں ہوتیں ہر خبر اور افواہ پر مدلّل حجت کرتے اور اس کا جھوٹ سچ معلوم کرکے چین لیتے۔

ان کی رفیقۂ حیات ان کے لئے زیادہ مہلک ثابت ہوئیں چنانچہ ان کے انتقال کے بعد فرمایا کہ "ہم بھی اب زیادہ نہیں جئیں گے۔" چنانچہ اپنی وفات کا مادۂ تاریخ خود ایک قطعہ میں کہا جو یہ ہے۔

اُو آں چناں بہ زیست تو گوئی خدا نہ بود　　　اُو از جہاں گذشت کہ آخر خدا نہ داشت

ثبت است سالِ رحلتِ فانی "خدا نہ داشت"　　　اُو　مزارِ　طغیانِ نازبیں کہ بہ لوحِ

۱۳۶۰ھ

میں نے اس کو نوٹ کرلیا فرمایا "جھوٹ سچ دیکھنے کے لئے لکھ لیا ہے ؟" اس کے بعد ہنسے اور خاموش ہوگئے۔

حیدرآباد (دکن) میں یہ دلچسپ صحبتیں گذارنے کے بعد میں اپنے حالات سے مجبور ہوکر ہمیشہ کے لئے دہلی آگیا۔ دو مہینہ کے بعد اخبار میں یہ خبر پڑھی کہ آج ہندوستان سے وہ اُٹھ گیا جس پر ہندوستان صدیوں ناز کرے گا۔ ایک شعر جو صرف ایک ہی شعر رہا موت سے کوئی چھ ماہ قبل کہا تھا ؎

شام سے پہلے مرتے ہیں یا آخر شب تک جیتے ہیں ؟
ان کے بغیر نہ جینے والے دیکھئے کب تک جیتے ہیں ؟

۲۶ر اگست ۱۹۴۱ء کو اُن کے اُس خوابِ مرگ کی تعبیر ملی جو انھوں نے عمر بھر دیکھا اور اس سوال کا جواب ان کو آخر مل ہی گیا۔ افسوس !!! زندگی میں تلخیوں نے ایک لمحہ بھی خوش کام نہ رہنے دیا !!! خود بھی وہ غم زدہ رہے اور اپنے احباب کو بھی ہمیشہ کے لئے غم زدہ چھوڑ گئے اور وہ دن بھی آخر آپہنچا جس دن کے لئے فانی آرزومند تھے ؎

ایسا بھی کوئی دن مری قسمت میں ہے فانی　　　جس دن مجھے مرنے کی تمنّا نہ رہے گی

حضرت جگر مراد آبادی ۔ کچھ یادیں

اِس دور کے غزل کے عناصرِ اربعہ میں حضرت جگرؔ مرُاد آبادی کا نامِ نامی ایک اہم عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔

جگرؔ صاحب نے شاعری اور شخصیت دونوں اعتبار سے ہماری شاعری اور تہذیب پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں، شاعری میں ہمیشہ پاکیزہ خیالات کا اجراء، اور محبت کے صالح جذبات کی اشاعت ان کا موقف رہا انھوں نے حُسن و محبّت کے محاکات میں ہمیشہ تہذیب کا خیال رکھا اور اس طرح وہ اپنی پاکیزہ سرشار شاعری کی نغمگی سے دلوں کو گرماتے رہے۔ اس مضمون میں ان کی شاعری موضوعِ گفتگو نہیں ہے بلکہ بعض یادوں کو تازہ کرنا مقصود ہے۔

جگرؔ صاحب نہایت اعلیٰ کردار کے مالک تھے، وہ پرانی تہذیبی قدروں کی پاسداری اور حفاظت اپنی میراث کی طرح کرتے اور اسلاف کی ثقافتی نشانیوں کو حرزِ جاں رکھتے۔ بزرگوں کا ادب، دوستوں کی خاطر مدارت، اہلِ علم و دانش کی خدمت، ناداروں کی دستگیری، ہم عصروں کا احترام، چھوٹوں سے محبّت، عیب بینی اور غیبت سے اعراض، غرض انسانی اقدارِ اعلیٰ کا فروغ ان کا وتیرہ تھا اور انہی خوبیوں نے

جگرؔ صاحب کی شخصیت کو نہایت دل پذیر بنا دیا تھا، اُن سے ایک بار ملنے کے بعد بار بار ملنے کی خواہش ہوتی۔ وہ لوگوں سے، لوگوں کا ذہن اور اپنا ذہن ایک سطح پر لاکر ملتے اور اس طرح احساسِ برتری یا احساسِ کمتری سے خود کو بھی محفوظ رکھتے اور دوسروں کو بھی۔ جگرؔ صاحب ہر مذاق کے لوگوں میں اپنے لئے جگہ بنا لیتے۔

مجھے جگرؔ صاحب سے نیازمندی کا شرف ۱۹۳۸ء سے حاصل رہا لیکن ۱۹۵۴ء اور ۱۹۵۵ء میں جگرؔ صاحب کا کراچی میں طویل قیام اس شرف میں مزید اضافہ کا سبب بنا۔ ان کی شفقت اور محبت میرے لئے

ع کر مہائے تُو مارا گستاخ کرد

کا مصداق تھی۔ میرے علاوہ ماہرؔ القادری، اقبال صفی پوری، ادیب سہارنپوری، شعیب حزیں رُوز کیا بلکہ ہر وقت کے حاضر باش تھے اور گستاخانہ حد تک اُن سے بے تکلف تھے اور جگرؔ صاحب کا بھی یہ عالم تھا کہ ہم میں سے اگر کوئی بھی کسی روز غیر حاضر ہو جاتا تو بے چین رہتے۔ جگرؔ صاحب کا فرصت کا بہترین مشغلہ رمی (تاش کا کھیل) تھا وہ اس قدر انہماک سے رمی کھیلتے کہ دوسری باتوں کا انہیں بالکل ہوش نہ رہتا اور اس سلسلہ میں لطائف بھی ظہور میں آتے مثلاً ایک شاعر نے جگرؔ صاحب کی فرمائش پر رمی کے دوران میں اپنا کلام سُنایا اور داد کی بجائے جگرؔ صاحب کے مُنہ سے نکلا "یہ ہے پان کا چوّا" اور شاعر ہکا بکّا رہ گیا کہ یہ کیا ہوا۔ جگرؔ صاحب ملنے والوں کی یلغار سے تنگ آکر نہایت خاموشی سے اصطفٰی منزل سے نکل کر میرے غریب خانہ آجاتے اور دو تین دن میرے یہاں رہتے، میری چھوٹی بیٹی رشیقہ سے دو تین سال کی تھی بہت پیار کرتے تھے، میرا قیام جہانگیر روڈ کے سرکاری کوارٹروں میں تھا انہی کوارٹروں میں سلیمؔ احمد اور جامؔ نوائی بدایونی بھی رہتے تھے، میرے یہاں بھی رمی کی بھڑ جمتی اور یہ دونوں بھی جگرؔ صاحب کے ساتھ رمی کھیلتے اور یوں کئی کئی راتیں اور دن گزر جاتے

ایک عقیدت مند نے عمدہ قسم کی دو قراقُلی ٹوپیاں جگرؔ صاحب کو پیش کیں، ایک صاحب نے ان میں سے ایک ٹوپی چُرا لی اور وہ اُسے رُوز پہن کر جگرؔ صاحب کے پاس آتے رہے۔ لیکن جگرؔ صاحب سے یہ نہ ہوسکا کہ وہ اُن سے کہتے،

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

ایک روز ایک صاحب نے کھونٹی پر لٹکی ہوئی جگر صاحب کی شیروانی سے ان کا بٹوہ نکال لیا اور

یہ حرکت جگر صاحب نے دیکھ لی لیکن جگر صاحب نظریں چرا گئے اور ان کو شرمندگی سے بچا لیا۔

جگر صاحب اور جوش صاحب ایک دوسرے کو ناپسند کرتے تھے اور یہ بات سب کو معلوم تھی، جگر صاحب کی خوشنودی کے لئے ایک صاحب نے جگر صاحب سے جوش کے عیب بیان کرنے شروع کر دیئے، جگر صاحب نہایت خفا ہوئے اور کہا کہ جوش کو میں برا کہہ سکتا ہوں آپ ان کے مرتبہ کے آدمی نہیں اور یہ حق آپ کو ہرگز نہیں ہے کہ آپ بڑے شاعر کی برائی مجھے خوش کرنے کے لئے کریں۔

ہم عصر شعراء میں جگر صاحب حضرت اصغر گونڈوی کے بعد سب سے زیادہ حضرت فانی بدایونی کو بحیثیت شاعر اور بحیثیت انسان پسند کرتے تھے، اور ان کے قصے اکثر بیان کیا کرتے تھے، کہنے لگے ایک دفعہ کسی نے ایک مصرع دیا۔ ؎

تیرے وحشی کے گریبان سئے جاتے ہیں

اور فی الفور دوسرا مصرع کہنے کی فرمائش کی۔ حضرت فانی کا مصرع سب سے اچھا تھا ؎

"دل پہ پڑتے ہیں وہ ٹانکے جو دیئے جاتے ہیں" — تیرے وحشی کے گریبان سئے جاتے ہیں

جناب فضلی صاحب نے ملیر میں ایک پکنک کا اہتمام کیا یہ پکنک دو تین روز کی تھی۔ اس میں جگر صاحب کے علاوہ میں، ماہر القادری، ادیب سہارنپوری، اقبال صفی پوری، اسمٰعیل احمد مینائی، خود فضلی صاحب اور دوسرے لوگ شریک تھے، وہاں بھی رمی کی محفلیں جمیں، کرکٹ کھیلی گئی، ایک روز طے پایا کہ "حاضر مشاعرہ" کیا جائے اور مصرع طرح کا جگر صاحب دیں گے۔ چنانچہ جگر صاحب نے مصرع دیا۔ ؎

شمع میں جتنا نظر آیا ہے پروانہ مجھے

شعر کہنے کے لئے دو گھنٹے مقرر ہوئے، سب نے دو دو تین تین شعر کہہ لئے لیکن خود جگر صاحب سے ایک شعر بھی نہ ہو سکا۔

ریڈیو پاکستان حیدرآباد نے ایک کل پاکستان طرحی مشاعرہ کا اہتمام کیا طرحی مصرع تھا۔

؎ خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

کراچی سے جگر صاحب، میں، ماہر القادری، ارم لکھنوی، اقبال صفی پوری، ادیب سہارنپوری، سراج الدین ظفر اور پاکستان کے دوسرے علاقوں کے شعراء بھی مدعو تھے۔ ان میں حفیظ جالندھری بھی تھے

جگر صاحب راستے بھر طرح میں شعر کہتے رہے، کوئی شعر ہو جاتا مجھے سُناتے، ایک شعر بہت خوش ہو کر سُنایا ؎

غنیمت ہے چشم تغافل بھی ان کی ۔ بہت دیکھتے ہیں جو کم دیکھتے ہیں

میں نے کہا جگر صاحب یہ شعر جہاں اُستاد حضرت داغ دہلوی کا ہے۔ فوراً کاٹ دیا اور کہا

لاحول ولا قوۃ اِلاّ باللہ

جگر صاحب کی اگر کسی نے دعوت کی ہے تو دعوت میں جاتے وقت جتنے حضرات موجود ہوں گے ان کو جگر صاحب بہ اصرار دعوت میں لے جائیں گے، دعوت کرنے والے بھی جگر صاحب کی اس عادت سے واقف ہوتے اور وہ اسی حساب سے دسترخواں کا اہتمام رکھتے، اور اسی طرح ناخواندہ مہمان اور میزبان شرمندگی سے بچ جاتے ۔

ایک دفعہ اُردو کالج کراچی کے پرنسپل میجر آفتاب حسن نے اُردو کالج کے لئے چندہ جمع کرنے کے سلسلے میں ایک وفد لے کر کوئٹہ جانے کا پروگرام بنایا کیونکہ کوئٹہ بلوچستان کے اکثر سردار علی گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے اور اُنھیں یقین تھا کہ وہ اُردو کالج کی مالی امداد کریں گے ۔ اس وفد میں جگر صاحب، ماہر القادری ادیب سہارنپوری، سیّد محمد جعفری، اقبال صفی پوری اور اسمٰعیل مینائی شامل تھے، کوئٹہ پہنچ کر بعض لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں اور کچھ رقم بھی مل گئی۔ میرا تعلق چونکہ ریڈیو سے تھا اس لئے میں کوئٹہ ریڈیو پاکستان گیا اور اسٹیشن ڈائریکٹر کے۔ جی۔علی سے جو آل انڈیا ریڈیو دلّی میں میرے شریک کار تھے ملا، انھوں نے بتایا کہ کوئٹہ ریڈیو اسٹیشن کا باقاعدہ افتتاح کرنے زیڈ۔ اے بخاری کنٹرولر ریڈیو پاکستان آرہے ہیں، اور اس سلسلے میں خاص پروگرام ترتیب دیا گیا ہے۔ جس میں ایک مشاعرہ بھی رکھا ہے۔ میں نے مشورہ دیا کہ اتفاق سے کوئٹہ میں جگر صاحب وغیرہ موجود ہیں کیوں نہ ان کو بھی مدعو کر لیا جائے ۔ کے۔ جی۔علی نے کہا کہ ہم مدعو تو کریں لیکن مقامی فیس سے زیادہ ہم نہیں دے سکیں گے کیونکہ ہم نے انہیں کوئٹہ میں مدعو نہیں کیا ہے' میں نے ان سے کہا کہ میں شعراء کی رضامندی لے لوں گا، چنانچہ میں نے جگر صاحب وغیرہ سے رضامندی لے کر ان کو آگاہ کر دیا اور اس طرح ریڈیو پاکستان کوئٹہ کا مشاعرہ بہت کامیاب رہا۔ دوسرے روز جگر صاحب کہنے لگے کہ بعض اوقات دوستی میں مالی نقصان بھی برداشت کرنا پڑتا ہے ، یہ اشارہ مشاعرہ کی مقامی فیس

،اس گفتگو کے بعد میں کبیدہ خاطر رہا اور کراچی آنے کے بعد جگرؔ صاحب کی خدمت میں حاضر
،دن گزر گئے، جگر صاحب نے احباب سے میری غیر حاضری کا ذکر کیا، احباب نے مجھے بتایا،
بمر صاحب سے کبیدہ میں خفا ہوں۔ آپ یقین کریں گے جگرؔ صاحب مجھے منانے آئے، سوئے اتفاق
فلیتوں کی وجہ سے اس کے بعد بھی میں حاضر خدمت نہ ہو سکا۔ جگرؔ صاحب دوبارہ آئے اور اس
نفد نہیں آئے۔ مٹھائی کا ڈبہ، میری بیوی کے لئے عطر کی شیشی، اصغر حسین، دلدار حسین کا پان کا
لے کر آئے، ہائے کیا لوگ تھے، کیسی محبتوں سے ان کا خمیر اٹھا تھا !!
،معلوم تھا کہ بخاریؔ صاحب اور جگر صاحب ایک دوسرے سے کبیدہ ہیں اور ایک دوسرے
رتے ہیں اور میرے دل میں بار بار یہ خیال پیدا ہوتا کہ ان دونوں کا میل ہو جانا چاہیئے، چنانچہ
ی صاحب سے اِس خواہش کا اظہار کیا، بخاری صاحب آمادہ ہو گئے، میں نے کہا شرط یہ ہے
ریں گے۔ اُدھر میں نے جگر صاحب کو بھی آمادہ کر لیا، غرض ایک دن میں اور بخاریؔ صاحب جگر
یام گاہ پہنچے، سوء اتفاق سے جگر صاحب موجود نہیں تھے، بخاری صاحب اپنی آمد کے متعلق
ھوڑ آئے تھوڑی دیر بعد جگر صاحب آ گئے، انھیں بخاری صاحب کے آنے کا علم ہوا۔ فوراً بخاری
ے دفتر پہنچے دونوں دیر تک ایک دوسرے سے بغل گیر رہے اور دونوں آب دیدہ تھے، یہ منظر
ا، پھر بخاری صاحب نے خود جگرؔ صاحب کی کئی غزلیں ریڈیو پاکستان کے لئے ریکارڈ کیں اور جگر
ے اصطفیٰ منزل میں دو مشاعرے بخاری صاحب کی صدارت میں کیئے۔
ِ صاحب ہونہار نوجوان شعراء کی بڑی حوصلہ افزائی کرتے، رازؔ مراد آبادی، شکیل بدایونی، مجروحؔ
ی، دورؔ ہاشمی، خمار بارہ بنکوی، نظرؔ امروہوی وغیرہ کو دراصل انھوں ہی نے متعارف کرایا، برصغیر
ے مشاعرے میں ان کو مدعو کرتے اور اس طرح ان شعراء کی شہرت میں جگرؔ صاحب کا بڑا دخل رہا۔
چی میں ایک مشاعرہ طیلسانینِ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن نے، سابق کنٹرولر آل انڈیا ریڈیو ،
کے ڈپٹی سیکریٹری جنرل جناب پطرسؔ بخاری کی صدارت میں کرایا اس میں پاکستان کے دوسرے
،شاعر بھی شریک تھے انہی شاعروں میں ساحرؔ صدیقی بھی تھے انہوں نے مشاعرہ لوٹ لیا، ساحرؔ
ے یہاں مقیم تھے، دوسرے روز علی الصباح جگر صاحب ساحرؔ صدیقی سے ملنے آئے اور ان کی

بہت حوصلہ افزائی اور تعریف کی ہیں نے کہا جگر صاحب آپ نے کیوں زحمت کی، ساحرہ صدیقی خود آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے، جگر صاحب ہونہار شاعروں کی حوصلہ افزائی میں اپنے مرتبہ کا بھی خیال نہیں رکھتے تھے۔

کراچی میں ہندوستان کی ایک مقبوضہ مسلم ریاست کی شہزادی کو شاعروں اور شاعری سے بڑا شغف تھا وہ خود بھی بہت عمدہ ترنم سے شعر پڑھتی تھیں، اُن کے یہاں روز دعوتیں اور مشاعرے ہوتے، میرے سوا کراچی کے تمام شعراء اِن محفلوں میں شریک ہوتے رہتے، ایک دن جگر صاحب نے مجھ سے ان کے یہاں چلنے کے لئے کہا میں نے عرض کیا کہ میں بغیر دعوت کے نہیں جاؤں گا۔ چنانچہ ایک دن شہزادی صاحبہ خود مجھے مدعو کرنے آئیں، مقررہ تاریخ پر میں جگر صاحب کے ہمراہ ان کے یہاں شریک محفل ہوا۔ تمام انتظام نہایت شاہانہ تھا، کھانے کے وقفہ میں مَیں نے دیکھا کہ جگر صاحب موجود نہیں ہیں اور جگر صاحب کی عدم موجودگی سے میں نے اپنے آپ کو اس محفل میں بیگانہ بیگانہ محسوس کیا اور جگر صاحب کا یہ انداز مجھے بڑا عجیب لگا گویا اس طرح جگر صاحب مجھے وہاں چھوڑ کر خود غائب ہو گئے اور میں صبح تک اِس محفل میں شعر سُناتا اور سُنتا رہا۔

یہ ہیں ایک انسان کی شخصیت کی مختلف جھلکیاں، اِن جھلکیوں میں کردار کی عظمت کی کتنی جہتیں ہیں اور یہی مختلف جہتیں انسان کو فرشتوں پر فضیلت دیتی ہیں، جگر صاحب بھی فرشتہ نہیں انسان تھے اور یہی شرف ان کی عظمت کی دلیل ہے۔

مصرع: خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

جوشؔ حیدرآباد دکن میں

میں ۱۹۲۵ء میں حیدرآباد دکن پہنچا۔ میرے نانا مولوی عنایت اللہ صاحب جو شمس العلماء منشی ذکاءاللہ صاحب کے صاحبزادے تھے ناظم دارالترجمہ تھے۔ حیدرآباد کا یہ زمانہ گوناگوں ترقیوں کا زمانہ تھا اور اسی کے ساتھ حیدرآباد کی علمی اور ادبی فضا بھی نہایت سازگار تھی۔ جامعہ عثمانیہ کا قیام ہو چکا تھا اور برصغیر کے تقریباً تمام اہلِ علم اور اہلِ کمال یہاں جمع تھے۔ ان میں مولانا نظم طباطبائی، مرزا ہادی رُسوا اور جلیل مانک پوری کے علاوہ، الیاس برنی، مولانا عبداللہ عمادی، وحید الدین سلیم پانی پتی، مولوی عبدالحق، پروفیسر سجاد مرزا، مولوی عبدالقدیر بدایونی، ہوش بلگرامی، نواب نثار یار جنگ، یاس یگانہ، ضامن کنتوری، حیرت بدایونی، باغ بدایونی، آغا حیدر دہلوی وغیرہ وغیرہ بھی علمی اور ادبی محفلوں کی رونق تھے۔

۱۹۲۷ء میں حضرت جوشؔ حیدرآباد پہنچے اور چند مہینوں قیام کرنے کے بعد واپس چلے گئے اور ۱۹۲۹ء میں دوبارہ حیدرآباد آئے اور دارالترجمہ میں ناظر ادبی کی حیثیت سے ملازم ہو گئے۔ جوشؔ صاحب حیدرگوڑہ (قدیم نام نرائن گوڑہ) میں رہتے تھے اور ان کا گھر مولوی عنایت اللہ صاحب کے گھر سے زیادہ دُور نہ تھا۔ جوشؔ صاحب نہایت خوبصورت آدمی تھے، بھرا بھرا جسم، سُرخ و سفید رنگت، حسین خط و خال، دراز قد،

حضرت جوشؔ کی آخری تحریر

کشادہ پیشانی، آنکھوں میں غیر معمولی ذہانت، غرض اُن کی پُرکشش شخصیت ہر آدمی کے لئے جاذبیت رکھتی تھی وہ بہت جلد حیدرآباد کی سوسائٹی میں مقبول ہو گئے اور ادبی محفلوں میں اُن کی شخصیت کی گونج سنائی دینے لگی۔

مولوی عنایت اللہ صاحب چونکہ ناظم دارالترجمہ تھے۔ اس لئے ان کے گھر جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ کے علاوہ شہر کی تقریباً تمام بڑی شخصیتیں آتی جاتی رہتی تھیں اور اسی لئے مجھے ان بزرگوں کو قریب سے دیکھنے اور سننے کا موقع ملا۔

حیدرآباد شہر کی فضا علمی اور ادبی فضا تھی۔ ایک طرف مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد کی درباری محفلیں تھیں۔ دوسری طرف ضامن کنتوری اور باغ بدایونی کے ماہانہ مشاعرے۔ اس کے علاوہ خود جامعہ عثمانیہ کے ادبی ہنگامے تھے۔ جامعہ میں عبدالقیوم باقی۔ اکبر وفاقانی، جم ایم خاں، یدشکیب، بدرالدین بدر، محی الدین قادری زور، نصیرالدین ہاشمی اور نوعمروں میں مخدوم محی الدین، ہیکش حیدرآبادی، سکندر علی وجد، شعیب حزیں، زیبا ردولوی اور صمد ساز وغیرہ تھے۔

مہاراجہ کی محفلوں میں ابر بدایونی، حیرت بدایونی، ثاقب بدایونی، بیگم لکھنوی، یاس یگانہ، غبار لکھنوی، اجلال لکھنوی، ماہرالقادری اور دوسرے مقامی شعراء شریک ہوتے۔ جوش ۱۹۲۹ء میں اور اور فانی بدایونی ۱۹۳۲ء میں حیدرآباد پہنچے۔ یہ لوگ بھی ان محفلوں میں باقاعدہ شریک ہونے لگے۔

فانی ۱۹۳۲ء میں حیدرآباد آئے۔ ان کے مکان پر بھی روز شام کو ادبی جمگھٹا ہونے لگا۔ ان محفلوں میں جوش، یگانہ، آزاد انصاری، حیرت بدایونی، ماہرالقادری، نثار یار جنگ سعید، علی اختر، صدق جائسی، ہوش بلگرامی شریک ہوتے۔ انہی محفلوں میں غالب کے بام شہرت پر کمندیں ڈالی گئیں۔ انہی محفلوں میں نظیر اکبرآبادی کو عوامی شاعر کہا گیا۔ (پہلی مرتبہ) اور ان کی شاعری سے ریختہ کا بچہ برآمد کیا گیا۔ انہی مجلسوں میں علی اختر اور جوش کی شاعری کے قد ناپے گئے اور نہ جانے کتنے ادبی موچے لگائے گئے اور تنقید اور تنقیص کے نہ جانے کتنے نشتر توڑے گئے۔ یگانہ کی غالب دشمنی نے یہاں بھی محاذ قائم کیا اور جوش جو غزل کے دشمن تھے اور یگانہ اور کچھ دوسرے حضرات ایک طرف اور فانی، آزاد انصاری، حیرت بدایونی اور ہوش بلگرامی وغیرہ دوسری طرف ایک دوسرے کے مقابل صف آراء ہو گئے۔ جوش نے غزل گو

شاعر سے خطاب، والی نظم فانی پر کہی۔ اسی طرح یگانہ نے بھی کچھ رباعیاں فانی کے خلاف کہیں اور فانی نے بھی کچھ رباعیاں کہیں جن میں سے ایک یہ ہے ؎

کیا خضرِ طریق کہہ کے رہزن کہتے — ملتی نہیں موم کہہ کے آہن کہتے!
ورنہ وہ دوستوں نے ایذا دی ہے — شرم آتی ہے دشمنوں کو دشمن کہتے

شہر کے ایک مشہور حکیم محمد شعیب تھے۔ ان کے گھر بھی شام کو محفلیں منعقد ہوتیں یہاں بھی جوش بڑے اہتمام اور پابندی سے شریک ہوتے۔ ان محفلوں میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، ابوالخیر مودودی (مولانا ابوالاعلیٰ کے بڑے بھائی) مولانا اعجاز الحق قدوسی، لیفٹیننٹ اشرف الحق عریاں اور شہر کے دوسرے دانشور جمع ہوتے اور سیاست سے لے کر ادب تک شاید ہی کوئی موضوع ہو گا جو زیرِ بحث نہ آیا ہو گا۔

غرض جوش کی آواز، مہاراجہ کے مشاعرے ہوں یا شہر کی ادبی نشستیں ہوں یا جامعہ کے ادبی جلسے ہر طرف گونجنے لگی۔ درباداری سے جوش کو دُور کا بھی واسطہ نہیں تھا لیکن جوش اعظم جاہ ولی عہد نظام دکن کی شام کی محفلوں میں اکثر شریک ہوتے غالباً انہیں دربار داری کے آداب سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا تھا۔

جوش سچے آدمی تھے اور ان کی سچائی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ ان کے کردار کا کوئی بُرا یا بھلا پہلو ایسا نہیں تھا جو ہر آدمی پر روشن نہ ہو اور کردار کے اسی رُخ نے انہیں بعض کی نگاہوں میں نہایت محبوب بنا دیا تھا اور بعض ان کی اسی روش سے اُن کے جانی دشمن تھے۔ طعن و تشنیع کا کون سا نشتر ہے جو ان کے دل میں پیوست نہ کیا گیا ہو۔ ایذا رسانی کے تمام سیلابوں کا رُخ ان کی طرف موڑا گیا، کُفر کے فتوے لگائے گئے۔ انہیں کافر و زندیق کہا گیا اور بعض اوقات ان پر عرصۂ حیات تنگ کرنے کے حربے بھی استعمال کئے گئے۔ حیدرآباد کی ریاستی سازشوں کا بالآخر وہ بھی شکار ہوئے اور نظام دکن کی سالگرہ کے موقع پر شائع ہونے والی ایک بہاریہ نظم کے اس شعر کو ؎

کبھی جوش کے جوش کی مدح فرما
کبھی دلبروں کی ثنا خوانیاں کر

بہانہ بنا کر انہیں ریاست سے نکال دیا گیا۔

جوشؔ کی قدر اور شخصیت اس معاشرے میں ایسی ہی ہے جیسے بونوں کی بستی میں گلیلیو۔ ہزار نظام دکن اور ہزار کفر کے فتوے لگانے والے مل کر بھی اُن کی شخصیت کو دُھندلا نہیں سکتے۔ جوشؔ زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔

عظیم لوگوں کو ایک نظر دیکھ لینا بھی عظمت ہے اور مجھے یہ عظمت حاصل ہے کہ میں نے بعض عظیم لوگوں کو قریب سے دیکھا ہے ان عظیم لوگوں میں جوشؔ بھی ہیں۔

جب میں حیدرآباد میں تھا

میں تیرہ سال کا تھا جب حیدرآباد پہنچا۔ یہ بات ۱۹۲۵ء کی ہے، تیرہ سال کی عمر بڑی عجیب ہوتی ہے۔ ایک طرف لڑکپن کی آخری منزلیں ہوتی ہیں اور دوسری طرف جوانی کے ابتدائی مراحل، لڑکپن اور جوانی کا یہ ملا جلا دور آدمی کو عجیب عجیب سنہرے خواب دکھاتا ہے، اس کے احساسات ناپختگی میں پختہ اور اس کی عقل پختگی میں ناپختہ ہوتی ہے۔ فطرت نے مجھے ایک حساس دل بخشا تھا، جو آگے چل کر میری شاعری کی خشتِ اول ثابت ہوا مگر یہ خشتِ اوّل کج نہاد نہیں رہی بلکہ وہاں کے ادبی اور شعری ماحول نے اسے میری تعمیری بنیاد میں اس طرح رکھا کہ میری روح کی ساری عمارت آج تک اسی پر کھڑی ہے اور پینسٹھ سال سے بہت سے زلزلوں اور موسموں کی تخریبی قوتوں کا اس پر کوئی اثر نہیں۔

تیرہ سال کی عمر بڑی عجیب ہوتی ہے ریل کا طویل سفر جو کئی تمدنوں سے گذارتا ہوا مجھے حیدرآباد کے مخصوص معاشرے تک لے گیا۔ میرے لئے بڑا دلچسپ تھا۔ تمدنوں کی یہ تبدیلی گوالیار کے بعد ہی سے شروع ہو گئی، نہ صرف تمدن بدلتا گیا بلکہ جغرافیائی ماحول بھی بدلتا تھا۔ میدان، اونچے نیچے پہاڑوں میں، ہرے بھرے کھیت، جنگلوں اور لق دق صحراؤں میں، چشمے اور آہستہ خرام دریا، تیز رو برساتی ندی نالوں میں تبدیل ہوتے گئے، اردو کی جگہ مرہٹی، گجراتی، کنڑی اور تلنگی نے لے لی۔ چُنے ہوئے کُرتوں اور چُست پاجاموں کی جگہ مرہٹی

لنگیاں اور ساڑیاں نظر آنے لگیں، کھانوں میں بھی نمایاں فرق محسوس ہوا، سالن روٹی کی جگہ خشک چٹنیاں اور سبزیاں ترکاریاں کھانے کو ملیں۔ غرض یہ فرق میرے لئے ایک نیا تجربہ تھا مگر بڑا دلچسپ۔ میں ایسے تمدّنوں سے بھی گذرا جہاں مجھے یہ محسوس ہوا کہ میں رام لچھمن کے زمانے میں آگیا ہوں اور یہ محسوسات مجھ پر بڑے گہرے نقوش چھوڑ گئے جو آج بھی تازہ ہیں۔

میں متاثر ہوتا ہوا چھوٹی لائن سے اورنگ آباد سے گذرتا حیدرآباد پہنچا یہ واقعہ ۱۹۲۵ء کا ہے لیکن کل کی بات معلوم ہوتا ہے، ماضی ہمیشہ خوبصورت ہوتا ہے اور خوبصورت ماضی ہو تو خوبصورت تر!!

حیدرآباد کا شہر بڑے بڑے تالابوں اور اونچی نیچی پہاڑوں سے گھرا ہوا نہایت خوبصورت شہر ہے۔ ریاست حیدرآباد کی زمین بھی اونچی نیچی ہے، کہیں میدان، کہیں چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں، کہیں سبزہ، کہیں زمین بالکل بنجر اور غیر آباد۔ برساتی ندی نالوں کی اسی سرزمین نے تاریخ کے سینکڑوں بہاؤ دیکھے ہیں۔ بودھوں کا تقدس، راجہ بل کا جاہ و جلال، رام اور ستیا باس باس، ایرانی اور عرب تاجروں کی آمد قطب شاہی، بہمنی اور بریدشاہی سلطنتوں کا عروج و زوال، مغلوں کی تگ و تاز، انگریزوں کی فریب کاریاں غرض مختلف تہذیبوں کے سینکڑوں دھارے اس سرزمین میں خشک ہو چکے ہیں۔

میں جس تمدن سے گیا تھا اس میں اور یہاں کے تمدن میں زمین و آسمان کا فرق تھا، یہاں کے لوگ نہایت مہذب اور شائستہ تھے، مسلمانوں اور ہندوؤں کا عام لباس شیروانی اور پاجامہ تھا۔ لبعض ہندو بھی سُرخ ترکی ٹوپی جو کرسٹی کہلاتی ہے پہنتے اور بسا اوقات ہندو مسلمان کا فرق مشکل ہو جاتا، رعایا عام طور پر خوشحال اور مطمئن تھی، ہندو مسلمان شیر و شکر تھے۔ یہاں کی تعلیمی اور دفتری زبان اردو تھی۔ دفتروں کی کارکردگی کا طریقہ نہایت عمدہ تھا بلکہ میں یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ برطانوی ہند کے دفاتر سے بہتر تھا، سرکار نظام کی اپنی پولیس، اپنی ریل، ڈاک اور تار کا اپنا نظام، اور اپنا سکہ رائج تھا جسے حالی کہتے تھے۔

نشریات کا محکمہ بھی اپنا تھا۔ شروع شروع میں نشریات کا سلسلہ محبوب علی صاحب نے نجی طور پر شروع کیا تھا بعد میں یہ انتظام سرکار نظام نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ اس نشرگاہ کے غالباً پہلے اناؤنسر ظفر الحسن تھے۔ پھر سرونگر میں ایک خوبصورت ریڈیو اسٹیشن تعمیر ہوا تھا اس نشرگاہ سے مجھے بھی اپنا کلام نشر کرنے کا شرف حاصل رہا ہے۔ مگر یہ واقعہ ۱۹۳۲ء کے بعد کا ہے۔

حیدر آباد کا تمدن دیکھ کر اُس تہذیب کا ضرور اندازہ ہوتا تھا جو انگریزی قبضہ کے ساتھ ساتھ پورے ہندوستان سے ختم ہو گئی اور حیدر آباد کا نظامِ حکومت دیکھ کر یہ یقین کرنے کو کسی طرح جی نہیں چاہتا کہ مسلمان حکومت کرنے کے اہل نہیں تھے۔

میرا قیام نرائن گوڑے میں ہوا جو بالکل نیا نیا آباد ہوا تھا کیونکہ اس وقت وہاں بمشکل بیس پچیس مکان ہوں گے۔ یہاں میرے نانا مولوی عنایت اللہ صاحب ناظم دارالترجمہ ایک بڑے سے بنگلے میں رہتے تھے مولوی صاحب میری والدہ کے سگے ماموں تھے، اتنے بڑے بنگلے میں، صرف تین نفوس مولوی عنایت اللہ صاحب ہیں، اور ایک بیرا، اس صاف ستھرے بنگلے میں ہم تینوں کی حیثیت کچھ باپ بیٹا اور روح القدس جیسی تھی، اس خاموش اور پُرسکون فضا کا تقدس بالکل ایسا ہی ہو جاتا۔ مولوی عنایت اللہ صاحب تجرد کی زندگی بسر کرتے تھے وہ اپنے کمرے سے بہت کم برآمد ہوتے، ان کا خوبصورت نورانی چہرہ، بسا اوقات بالکل الوہی معلوم ہوتا، بیرے کے صاف شفاف سفید کپڑے میرے سامنے فرشتوں کا سا ہیولا پیش کرتے اور میں اکثر الہامی کیفیات میں ڈوب جاتا۔

مولوی صاحب کے کمرے میں آنے جانے کی کوئی پابندی نہ تھی، گھر میں وہ ہمہ وقت کتب بینی یا ترجمہ میں مصروف رہتے ان کی عادت تھی کہ وہ صبح کا ناشتہ چار ساڑھے چار بجے کر لیتے، ناشتے کے سوا دونوں وقت کے کھانے اور شام کی چائے پر میری حاضری نہایت ضروری تھی پھر اگر دن بھر ملاقات نہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔ مولوی صاحب بڑے معصوم آدمی تھے، وہ کم سخن تھے اور تہذیب و شائستگی کا مجسمہ تھے۔ ان کے رات دن باقاعدہ اور بااصول گذرتے، انہیں غصہ بالکل نہیں آتا تھا۔ ان کے گنے چنے دوست تھے۔ انہوں نے پہلی تاریخ کو کبھی تنخواہ وصول نہیں کی۔ ساری تنخواہ دفتر کے محاسب کے پاس جمع رہتی ضرورت کے مطابق پرچی بھیج کر وہ روپیہ منگا لیتے، چنانچہ جب وہ ریٹائر ہوئے تو محاسب نے کوئی چالیس ہزار روپے لاکر دیئے، وہ پچھلا قرض ادا نہ کرنے والوں کو بھی بار بار قرض دے دیتے تھے اور کبھی تقاضا نہیں کرتے تھے وہ اکثر کتاب میں تبرک کے طور پر نوٹ رکھ دیا کرتے یا تو عادتاً یا میری ہنگامی ضرورتوں کے پیش نظر۔

عنایت اللہ صاحب خشک آدمی نہیں تھے، ایک دفعہ میں نے پوچھا نانا ابا آپ نے شادی کیوں نہیں کی۔ کہنے لگے میاں ایک جگہ ابا نے (یعنی شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ صاحب نے) ہمارا رشتہ بھیجا تھا وہاں

سے انکار آگیا تو ہم نے سمجھا کہ ہم میں کوئی کمی ہے جو انکار ہوا ہے۔ ان کا یہ دلچسپ مشغلہ تھا کر وہ مجھ سے کھانے پر کہتے اچھا میاں مسعود ذرا چڑیوں کے نام تو لو دیکھیں تمہیں کتنے نام یاد ہیں، میں کہتا نانا ابا یہ بھی کوئی مشکل بات ہے مگر جب نام لینے شروع کرتا تو معلوم ہوتا کہ دو چار ناموں کے بعد نام لینے بہت مشکل ہیں۔ اسی طرح کبھی درختوں کے نام پوچھتے اور مجھے محسوس ہوتا کہ املی، جامن، آم اور نیم کے بعد درخت ہی نہیں ہوتے، کبھی وہ رشتے پوچھتے غرض اسی طرح کی دلچسپ باتوں میں کئی کئی گھنٹے گزر جاتے، وہ اُس زمانے میں کہا کرتے تھے کہ لوگ عام طور پر اردو غلط لکھتے اور بولتے ہیں، اس زمانے کے متعلق ان کے نہ جانے کیا رائے ہوتی۔ یہ تھا وہ گھر اور اس کا ماحول جہاں میں جا کر ٹھہرا۔

مجھے دارالعلوم میں آٹھویں جماعت میں داخلہ ملا، اس وقت ہمارے ہیڈ ماسٹر ظہور علی صاحب تھے۔ معمر دراز خوبصورت کتابی چہرہ، سُرخ سفید رنگ، درمیانہ قد گداز جسم، جھالر دار سفید داڑھی اور اس وضع قطع پر وہ نہایت اعلیٰ سوٹ پہنتے تھے وہ ہمیشہ پیدل چلتے اور بہت تیز چلتے تھے۔ ان کے ہزاروں شاگرد تھے جن میں سے بعض اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ ظہور علی صاحب بڑے نامور استاد تھے اور علمی ادبی حلقوں میں ان کی بڑی عزت تھی۔ دارالعلوم چارکمان میں تھا۔ میں ریذیڈنسی سے ہوتا ہوا موسیٰ ندی کے کنارے کنارے افضل گنج کے پُل سے گذرتا اسکول آتا جاتا تھا، دارالعلوم ہندوستان کے قدیم ترین اسکولوں میں سے تھا اس کی قدامت کا اندازہ اس سے لگا لیجئے کہ مہاراجہ کشن پرشاد نے بھی اسی اسکول میں تعلیم پائی تھی یہ بات خود مہاراجہ نے مجھ سے فرمائی تھی۔

حیدرآباد کا یہ زمانہ انتہائی عروج کا زمانہ تھا، عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہو چکی تھی اور ہندوستان بھر کے اہلِ علم یہاں جمع تھے، مجھے جن لوگوں کے دیکھنے کا شرف حاصل رہا ہے ان میں مرزا ہادی رُسوا، نظم طباطبائی، وحیدالدین سلیم، عظمت اللہ خاں اور مولانا مناظر احسن گیلانی جیسی ہستیاں تھیں، عثمانیہ یونیورسٹی اس زمانے میں مسرت منزل، فرحت منزل، اور غالباً نظامت منزل میں تھی۔ مولوی عنایت اللہ صاحب چونکہ ناظم دارالترجمہ تھے، اس لئے یہ حضرات بھی ان کے پاس آتے جاتے تھے۔

مرزا ہادی رُسوا یونیورسٹی میں غالباً نفسیات پڑھاتے تھے، مرزا صاحب گداز جسم اور میانہ قد کے آدمی تھے وہ چوڑی دار پاجامہ اور شیروانی پہنتے تھے، پان کی پیک کے دھبے اکثر ان کی شیروانی پر نظر آتے۔ وہ خاصے

مُعمّر ہونے کے باوجود زیادہ سے زیادہ پچاس پچپن کے معلوم ہوتے، مرزا صاحب واجد علی شاہ کے دربار میں رہے تھے۔ مال گذاری کے سامنے پٹواری کی دکان کے اُوپر والے کوٹھے میں رہتے تھے اور ان کا انتقال غالباً ۱۹۳۵ء میں ہوا۔

نظم طباطبائی بھاری جسم اور چوڑی ہڈی کے آدمی تھے، وہ بہت اُونچا سنتے تھے، میں نے جب انھیں دیکھا ہے تو وہ اسّی سے متجاوز تھے۔ ایک مشاعرہ ان کی صدارت میں فرحت منزل میں ہوا تھا۔ مجھے شاعری کا شوق بچپن سے تھا میں بھی اس مشاعرے کے سُننے والوں میں شریک تھا۔ یونیورسٹی کے جن طالب علموں نے اس مشاعرے میں شعر سنائے ان میں سے دو ایک کے نام مجھے آج بھی یاد ہیں۔ بدرالدین بدرؔ بدر شکیبؔ، عبدالقیوم باقیؔ اور زیبا ردولوی، مشاعرے کے آخر میں مولانا نظم طباطبائی نے اپنا کلام سنانے سے پہلے انیسؔ کی غزلوں کے کچھ شعر سنائے تھے ایک شعر آپ بھی سنیئے ؎

خار کو گُل کے قریں دیکھ کے میں یہ سمجھا　　چیختے چیختے بُلبُل کی زباں سُوکھ گئی!

نظم طباطبائی بھی واجد علی شاہ کے دربار کے آدمی تھے۔ بلکہ انہوں نے شہزادوں کو عربی پڑھائی تھی وہ مرزا ہادی رسوا سے عمر میں بڑے تھے۔ یہ مشاعرہ شاید ۱۹۳۰ء میں ہوا تھا۔

مولانا وحید الدین سلیم کا رہن سہن بڑا گندہ تھا، گھر کی دیواروں اور فرش پر جگہ جگہ گندگی اور پان کی پیک کے دھبّے، ٹوٹی ہوئی چارپائیاں، چیکٹ بچھونے، غرض ان کے گھر پر ایک طرح کی نحوست برستی تھی۔

غالباً ۱۹۲۹ء میں جوشؔ ملیح آبادی بھی حیدرآباد آچکے تھے، اور ۱۹۳۲ء میں فانی بدایونی بھی حیدرآباد آگئے تھے۔ فانی دوسری دفعہ حیدرآباد آئے تھے۔ وہ پہلی دفعہ ۱۹۲۲ء میں حیدرآباد گئے تھے۔ جوشؔ ملیح آبادی دارالترجمہ میں ناظر ادبی کی خدمت پر مامور ہوئے، ان کا قیام اُس زمانے میں نرائن گوڑے میں میرے گھر کے قریب تھا، شام کو ان کے یہاں احباب کا مجمع ہوتا اور شاعری اور سرمستی کے دور ہوتے اور خوب لطف رہتا، جوشؔ کے یہاں علی اختر، حیرتؔ بدایونی اور اعجاز الحق قدوسی وغیرہ کے آنے والوں میں تھے، آزاد انصاری اور ہوشؔ بلگرامی بھی آتے جاتے تھے۔ ان کے علاوہ یونیورسٹی کے طلباء اور شہر کے رہنے والے بعض دلدادگانِ شعر بھی جمع ہو جاتے۔

فانی بدایونی حیدرآباد آئے تو پہلے نام پلی اسٹیشن کے پاس جوزف ہوٹل میں پھر "صلح سرائے" میں مقیم ہوئے، اور پھر ملے پلی کے ایک سرکاری کوارٹر میں منتقل ہو گئے اور اپنی وفات تک یہیں رہے۔ فانی کی آمد پر بھی ان کے اعزاز میں ایک مشاعرہ مہاراجہ کی صدارت میں نظامت منزل میں ہوا۔ اسی مشاعرے میں میں نے پہلی بار فانی کو دیکھا اور سنا، ان کے اس مشاعرے کے دو شعر مجھے اب تک یاد ہیں ؎

گرا کے قطرۂ شبنم گلوں کے دامن پر — تجلیات کے دریا بہا دیئے تو نے
سرورِ عقل و غمِ عشق کے دوراہے پر — بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا دیئے تو نے

فانی کے شعر پڑھنے کا انداز بڑا پرتاثیر اور درد انگیز تھا وہ بڑی غمگین لے میں شعر پڑھتے تھے مجھ پر ان کا بڑا گہرا اثر ہوا اور میں دوسرے ہی روز اُن سے ملنے جا پہنچا وہ نہایت محبت اور شفقت سے پیش آئے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں ان کے یہاں تقریباً روز جانے لگا اور ان کو بھی مجھ سے ایک طرح کا لگاؤ پیدا ہو گیا تھا میں جس روز نہ جاتا، دوسرے روز میری غیر حاضری کی وجہ پوچھتے۔ فانی اب ملے پلی کے مکان میں منتقل ہو چکے تھے، شام کو ان کے گھر کے سامنے والے میدان میں دس بارہ کرسیاں پڑ جاتیں اور احباب اور شعراء کا اچھا خاصا مجمع ہو جاتا۔ یہ محفلیں رات کے دس گیارہ بجے تک جمی رہتیں، یہاں حکیم آزاد انصاری، مرزا یاس یگانہ، جوش ملیح آبادی، حیرت بدایونی، احلال لکھنوی، تراب یار جنگ سعید، نثار یار جنگ، ماہر القادری، حرماں خیرآبادی، عبدالہادی اور اسمٰعیل مینائی تسنیم وغیرہ جمع رہتے۔ ان محفلوں میں شعر و شاعری سے لے کر سیاسیات تک کوئی ایسا موضوع نہ تھا جو زیرِ بحث نہ آتا۔ انہی محفلوں میں غالب کے طرفداروں کی موجودگی میں غالب کو اصلاحیں دی گئیں، انہی صحبتوں میں نظیر اکبر آبادی کو عوامی شاعر کہہ کر ایک تحریک کی صورت دی گئی اور انہی مجلسوں میں میر اور غالب کی شاعری میں گہری اور ریچھ کا بچہ تلاش کرنے کی کوشش کی گئی، انہی انجمن آرائیوں میں جوش اور علی اختر کے شعری موازنے کی بنیاد رکھی گئی، اور انہی محفلوں میں رشک کو حسد میں بدلتے دیکھا گیا غرض یہ پُر لطف صحبتیں اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو چکی ہیں۔

حیدرآباد کے اس سنہرے دور میں ایک طرف تو عثمانیہ یونیورسٹی کی علمی اور ادبی فضا تھی اور دوسری طرف شہر کے ادیبوں اور شاعروں کا ماحول اور مہاراجہ کشن پرشاد کی ادبی محفلیں۔

عثمانیہ یونیورسٹی میں جو لوگ نمایاں تھے ان میں سید وزیر حسن، رضی الدین صدیقی، اکبر وفا قانی، بدرالدین بدر

ڈاکٹر منور علی، عبدالقیوم باقی، جی ایم خان، بدر شکیب اور زیبا ردولوی اور بعد کے لوگوں میں میر حسن، مخدوم محی الدین، نور الہدیٰ، شعیب حزیں، مرزا ظفر الحسن، سکندر علی وجد، غلام علی، صمد رضوی ساز اور صاحبزادہ میکش وغیرہ کے نام مجھے یاد ہیں۔ یونیورسٹی کے استادوں میں ڈاکٹر سید سجاد، ڈاکٹر نظام الدین، ڈاکٹر یوسف حسین خان، الیاس برنی، مولوی عبدالحق (بابائے اُردو) ہارون خاں شیروانی، ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور ڈاکٹر پروفیسر عبدالقادر سروری وغیرہ تھے۔

نظام کالج اُس زمانے میں ڈگری کالج نہیں تھا یہاں بھی بعض عمدہ شعری صحبتیں ہوئیں یہاں کا انگریز پرنسپل ان مشاعروں میں چُست پاجامہ اور کالی شیروانی پہن کر شریک ہوتا۔ آغا حیدر حسن اسی کالج میں استاد تھے۔

شہر کے لوگوں میں یہ لوگ قابلِ ذکر ہیں۔ امجد حیدرآبادی، جلیل مانکپوری (اُستاد نظام) ضامن کنتوری صفی اورنگ آبادی، علی اختر، قاضی عبدالغفار، مرزا فرحت اللہ بیگ، غلام یزدانی، آغا حیدر حسن، مولانا حسام الدین فاضل، سالار جنگ، سر نظامت جنگ، سر امین جنگ، راجہ پرتاپ گیر، اختر یار جنگ، بہادر یار جنگ، سردار نواز جنگ، اصغر یار جنگ، محبوب علی، تراب علی، مولانا مجیب احمد تمنائی، سید علی منظور، ڈاکٹر اشرف الحق، مولانا عبدالقدیر، نواب دوست محمد خاں، باغ علی گڑھی اور ہاشم علی خان، ضامن کنتوری اور باغ کے یہاں ماہانہ مشاعرے بڑی دھوم دھام سے ہوتے اور شہر کے تمام اچھے شعراء ان میں شریک ہوتے اور دادِ سخن دیتے۔

مہاراجہ کی ادبی صحبتوں میں عزیز یار جنگ، ضیا یار جنگ، شہید یار جنگ، حیرت بدایونی، بیگم لکھنوی، ڈاکٹر اشرف الحق، غبار، برتر لکھنوی، مسعود علی محوی، مولانا عبداللہ عمادی، فانی بدایونی، جوش ملیح آبادی، ثاقب بدایونی اور ماہر القادری روز کے آنے جانے والوں میں تھے۔ مہاراجہ کی ذات اسلامی ہندی تہذیب کا اعلیٰ نمونہ تھی، جیسے زمزمی میں گنگا جل، داد و دہش میں حاتم کی سی شان، بے نیازی اور استغنا میں درویشوں کی سی ادا، لحاظ اور مروّت میں دوستوں اور عزیزوں جیسا انداز، شان اور دبدبے میں بادشاہوں کا سا طمطراق، تہذیب اور شائستگی میں پرانی قدروں کا رکھ رکھاؤ، مہاراجہ کو دیکھ کر یہ اندازہ ضرور ہوتا تھا کہ یہ جس مٹی کے مُشام میں وہ مٹی نہیں اکسیر تھی، مہاراجہ کا انتقال غالباً ۱۹۳۹ء میں ہوا۔

اُسی زمانے میں نواب معظم جاہ شجیع کو بھی شاعری کا شوق ہوا اور وہاں بھی شعر و سخن کی محفلیں رت

جگوں میں بکھرتیں اور خواب سحر میں ڈوب جاتیں، یہاں کے مخصوص شاعر نجم آفندی اور شاہد صدیقی تھے، نواب معظم جاہ فانی کی بڑی عزت کرتے تھے اور ان کو بھی ان صحبتوں میں رونیاد کر لیتے تھے، مگر فانی کو اس بڑھاپے میں متواتر راتوں کا جاگنا راس نہ آیا اور ان کی جان کا روگ ہوگیا اور ان کی صحت خاصی خراب رہنے لگی۔ نواب معظم جاہ روز کے جانے والوں کے علاوہ کبھی کبھی علی اختر، آزاد انصاری اور ماہر القادری کو بھی بُلا لیتے تھے۔

۱۹۳۵ء میں جگر مراد آبادی حیدرآباد گئے اور فانی کے مہمان ہوئے، جگر کا یہ زمانہ شعر و سرمستی کے شباب کا زمانہ تھا، پورے شہر میں مشاعروں کی دھوم مچ گئی، کالجوں میں، یونیورسٹی میں احباب اور قدر دانوں کے یہاں غرض ہر جگہ مشاعرہ بپا ہوگیا، نواب بہادر یار جنگ کی ڈیوڑھی میں بھی ایک مشاعرہ ہوا اور اس میں فانی اور جگر دونوں شریک ہوئے۔ یہ مشاعرہ مولوی عبدالحق کی صدارت میں ہوا اور شاعروں میں صرف پانچ شاعر تھے، فانی، جگر، شام اکبرآبادی (فانی کے ایک مہمان ہندو دوست) سکندر علی وجد اور میں، اس مشاعرے کے لطف کا اندازہ اس سے کیجئے کہ فانی نے کہا کہ انہوں نے اپنی زندگی میں ایسا مشاعرہ نہیں دیکھا۔ سُننے والے صرف دو سو حضرات تھے۔ شعراء کی اس مختصر فہرست کے باوجود یہ مشاعرہ رات کو دو بجے ختم ہوا ہر شاعر نے تقریباً دس دس غزلیں سُنائیں اور پھر فانی اور جگر سے بے شمار غزلیں سُنیں۔ جگر کے اعزاز میں ایک مشاعرہ فوقانیہ مدارس (ہائی اسکولوں) کی انجمن اساتذہ کی طرف سے مہاراجہ کی صدارت میں ہوا یہ مشاعرہ بڑے معرکے کا مشاعرہ تھا۔ اس میں جگر کو بہت داد ملی تھی۔ ان کے بعد فانی کا نمبر تھا، میں حیران تھا کہ اب کیا ظہور میں آنے والا ہے مگر اس مطلع ہی پر داد سے چھتیں اُڑ گئیں ؎

منہ پھیر لیا ہم نے تو دنیا نہ رہے گی　　　بے ذوقِ نظر بزم تماشا نہ رہے گی

اب یونیورسٹی اپنی نئی عمارت میں منتقل ہو چکی تھی اور یوم جامعہ کے سلسلے میں وہاں بھی بڑے بڑے علمی و ادبی اجتماع اور مشاعرے ہوتے انہی میں سے ایک مشاعرے میں حفیظ جالندھری بھی حیدرآباد گئے۔ یہ ان کا پہلا پھیرا تھا۔ حفیظ کی وجہ سے بھی شہر میں بہت سی دعوتیں اور مشاعرے ہوئے ایک مشاعرہ ہاشم علی خان کے یہاں ہوا، اس میں مرزا فرحت اللہ بیگ، فانی بدایونی، حیرت بدایونی اور بہادر یار جنگ شریک ہوئے۔ حفیظ نے بہت سی نظمیں سنائیں اور آخر میں فانی کے کلام پر یہ عمدہ دعوت اور مشاعرہ

ختم ہوا، قاضی عبدالغفار مدیر پیام نے بھی حفیظ کو چائے پر بلایا تھا اور اسی چائے پر سبط حسن سے میری وہ ملاقات ہوئی جس کی تجدید ان سے کراچی میں کرنی پڑی۔ خیر!!

میں میٹرک کے بعد نظامت پٹنہ (نظامت ڈاک خانہ جات) میں ملازم ہو گیا، اُس زمانے میں پوسٹ ماسٹر جنرل (ناظم پٹنہ) محمد احمد صاحب تھے، وہ مجھ سے بڑی شفقت سے پیش آتے پھر نواب علی صاحب ناظم ہوئے، نواب علی صاحب بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ وہ تنخواہ میں کبھی نوٹ نہیں لیتے تھے۔ صرف روپئے لیتے اور روپئے بھی باقاعدہ دھوئے جاتے، وہ ہمیشہ بالکل ٹھیک وقت پر دفتر آتے جاتے اور اس پابندی میں ایک منٹ بھی اِدھر اُدھر نہیں ہوتا۔ دفتر کے اہلکاروں اور افسروں پر ان کا بہت رعب تھا۔ مگر میں ایک دفعہ بیمار پڑا تو وہ میری بیمار پُرسی کو آئے اور بہت پھل بھی ساتھ لائے۔ وہ گھر سے نکالے ہوئے نوکر کو دوبارہ ملازم نہیں رکھتے تھے مگر پرانا ملازم ان کے گھر جاتا تو تنخواہ سے زیادہ انعام اکرام دے دیتے، کھانا مچھر دانی میں بیٹھ کر کھاتے ان کا وطیرہ تھا کہ وہ شام کو موٹر میں بیٹھ کر سڑک پر کھیلتے ہوئے بچوں میں پیسے تقسیم کرتے مگر اس طرح کہ کوئی دیکھ نہ لے۔

حیدرآباد کے روز کے اُٹھنے بیٹھنے والے دوستوں میں مرزا مظہر الحسن، برادر مرزا ظفر الحسن یا پھر حیرت بدایونی، محمد مہدی، حمید الدین شاہد، عبدالہادی، اعجاز الحق قدوسی، ناصر حسین، عبدالسبحان، غلام دستگیر، نواب محی الدین، علی خان اسیر، بشیر میاں، حبیب احمد خمور وغیرہ کے ساتھ میرا وقت زیادہ گذرتا۔

۱۹۳۹ء میں دو حادثے گذرے، ایک جنگِ عظیم کا اور دوسرا میری شادی کا شادی میری دہلی میں ہوئی اور اب میں اپنی بیوی کے ساتھ حیدرآباد واپس آیا اور پہلے آغا پورے میں پھر عظیم پورے میں مکان کرائے پر لے کر رہنے لگا۔ مولوی عنایت اللہ صاحب ۱۹۳۸ء میں ریٹائر ہو کر دیرہ دون چلے گئے تھے، ۱۹۴۰ء میں میں شدید بیمار پڑا اور تبدیلِ آب و ہوا کے لئے دلّی گیا تو والدہ صاحبہ نے پھر مجھے حیدرآباد نہ جانے دیا۔ میں ۱۹۴۱ء میں آل انڈیا ریڈیو میں ملازم ہو گیا اور اگست ۱۹۴۱ء میں فانی کے انتقال کی خبر سُنی۔ دل پر بڑا اندوہناک اثر ہوا، ایک فانی ہی کیا وقت کے دھندلکوں میں نہ جانے کتنی صورتیں مٹتی دیکھیں۔ حیدرآباد نے میری تہذیبی تربیت میں جو حصّہ لیا ہے اُس کا اثر مجھ پر آج تک

نہایت گہرا ہے۔ میں حیدرآباد اور اس کی ہستیوں کو زندگی بھر فراموش نہیں کر سکتا۔ بلکہ یہ نقوش اس بے ادبی اور بے تہذیبی کے دور میں مجھ پر اور گہرے ہوتے جاتے ہیں مستقبل حال میں، اور حال ماضی میں تیزی سے تحلیل ہوتا چلا جارہا ہے اور رفتارِ وقت کی یہ تیزی ایک دن مجھے بھی کنارے لگا دے گی مگر میرا حال اب تو یہ ہے ؎

اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں
وے صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں

میرزا یاس یگانہ

تیس چالیس سال پہلے تک شہر تو شہر قصبات میں بھی ایسی ہستیاں موجود تھیں جن سے تہذیبی و ثقافتی رہنمائی ملتی تھی۔ بڑے شہروں میں اہل علم وادب نہ صرف اپنی ذات میں ایک انجمن ہوتے بلکہ ہر انجمن ان کی آئینہ دار ہوتی۔ تاریخ ادب میں ایسی انجمنوں کے تذکرے ملتے ہیں اور ایسی ہستیوں کا ذکر آتا ہے جن کے دم قدم سے ہر انجمن رونق پذیر ہوتی۔

ہمارے ہوش میں لالہ سری رام کا دیوان خانہ، مسیح الملک حکیم اجمل خان کی صحبتیں، ناصر نذیر فراق اور حسن نظامی کی مجلسیں، پنڈت امرناتھ ساحر کی محفلیں اور آخر آخر میں یارانِ کتب خانہ علم و ادب کے جمگھٹے دلی کی ادبی اور تہذیبی روایات کا سرمایہ تھے۔

حیدر آباد دکن میں بھی ایسے ٹھکانے تھے جہاں ادیب اور شعراء جمع ہوتے، ان میں سب سے بڑا مرکز مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد کی حویلی تھی۔ اس کے علاوہ ضامن کنتوری باغ بدایونی کے دولت کدے اور جامعہ عثمانیہ کے بعض طلبہ کی محفلیں تھیں۔

فانی بدایونی تیسری بار ۱۹۳۲ء میں مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد کی دعوت پر حیدر آباد آئے۔ ناملی ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک ہوٹل ڈیوڈز میں مقیم ہوئے۔ پھر صلح سرائے میں قیام پذیر ہوئے اور سرکاری ملازمت کے ساتھ جب ملے پلی میں سرکاری مکان ملا تو اس میں منتقل ہو گئے۔ مکان کے سامنے میدان تھا۔ شام کو چھڑکاؤ کر کے کرسیاں ڈال دی جاتیں اور اس طرح یہاں فانی کے دوستوں اور قدردانوں کا مجمع لگتا، یہ محفلیں شام کے جھٹپٹے میں شروع ہوتیں اور رات بھیگنے تک جاری رہتیں۔ تقریباً روز کے آنے والوں میں حکیم آزاد انصاری، علامہ حیرت بدایونی، تراب یار جنگ سعید، نواب نثار یار جنگ مزاج، ہوش بلگرامی، جوش ملیح آبادی، علی اختر، یاس یگانہ (جب وہ شہر میں ہوتے) ماہر القادری، شاہد صدیقی، نجم آفندی، قاضی عبدالغفار اور حرماں خیر آبادی وغیرہ تھے۔ انہی محفلوں میں ادب اور ثقافت کے بہت سے موسم گئے۔ انہی محفلوں میں معاصرانہ چشمکوں کی کوکھ سے بعض تاریخی واقعات نے جنم لیا۔ انہی محفلوں میں غالب کے بام شہرت پر کمندیں ڈالی گئیں۔ انہی مجلسوں میں نظیر اکبر آبادی کی عوامی شاعری سے ریجھ کا

بچہ برآمد کیا گیا۔ انہی صحبتوں میں جوشؔ اور علی اخترؔ کی شاعری کے قد ناپے گئے اور انہی جھگھٹوں میں ادب پاروں کی جراحی میں نہ جانے کتنے نشتر توڑے گئے۔

فانیؔ اپنے ہم عصروں میں آرزوؔ لکھنوی، حسرتؔ موہانی اور یاسؔ یگانہ کی شاعری کے مداح تھے۔ آرزوؔ لکھنوی سے لکھنؤ کے دورانِ قیام میں بےتپاک ملاقات تھی، حسرتؔ اور فانیؔ علی گڑھ کی تعلیمی زندگی میں ایک دوسرے کے ساتھ تھے اور یگانہؔ سے ان کی دوستی تھی۔ فانی کا یہ شعر۔؎

وہ نامرادِ اجل بزمِ یاسؔ میں بھی نہیں	یہاں بھی فانیؔ آوارہ کا پتا نہ ملا

یاسؔ یگانہ ہی کی محفلوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ فانیؔ اپنے مخصوص ترنم میں یاسؔ کا یہ شعر؎

چتونوں سے ملتا ہے کچھ سراغ باطن کا	چال سے تو کافر کی سادگی برستی ہے

زانو پر ہاتھ مار مار کر پڑھا کرتے تھے۔

مرزاؔ صاحب اس زمانے میں غالباً عثمان آباد میں سب رجسٹرار تھے، جب وہ بلدے میں ہوتے تو باقاعدہ ان محفلوں میں شریک ہوتے اور اپنی ذات سے جانِ محفل ثابت ہوتے۔

مرزا صاحب بڑے طنطنے کے آدمی تھے۔ علمی تمکنت کے ساتھ ساتھ نازک مزاجی بھی مرزاؔ صاحب کا خاصہ تھی۔ مرزا صاحب جوشؔ اور فانیؔ کے دوست تھے، یہ الگ بات کہ انہوں نے ان دونوں کے متعلق (مخالفانہ) رباعیاں بھی کہی ہیں۔ مگر شاعری میں مرزاؔ صاحب کی دوستی کسی سے نہیں تھی اور ویسے بھی اس دوستی میں سب سے بڑی رکاوٹ فانی کی غالبؔ دوستی تھی، فانیؔ غالبؔ کے پرستار اور مرزا صاحب غالب کے دشمن۔

غالبؔ سے مرزا صاحب کی نفرت کا سبب یہ تھا کہ وہ غالبؔ کو ہرگز اس شہرت کا مستحق نہیں سمجھتے تھے جو اُسے حاصل تھی۔ فارسی شاعری جس پر غالبؔ کو ناز تھا اور جس کے متعلق اس کا اپنا دعویٰ تھا۔

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ	بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگِ من است

مرزا صاحب کے نزدیک پوچ تھی اور وہ غالبؔ کو متقدم فارسی شعراء کے کلام کا سارق سمجھتے تھے۔ غالبؔ نے خود بھی تقریباً انتیس شعراء کا اپنے کو متتبع بتایا ہے اور وہ عرفیؔ، صائبؔ، نظیریؔ، بیدلؔ، شوکتؔ اور علی حزیں وغیرہ کے پورے کے پورے مضامین لے کر ذرا سے ردوبدل کے بعد اپنا کر کے

پیش کہتے ہیں اور اس طرح غالب نے چوری اور سینہ زوری کا فارسی گوئی میں مظاہرہ کیا ہے۔

غالب کی اردو شاعری کے متعلق مرزا صاحب کا یقین تھا کہ غالب جس رنگ سخن کے موجد سمجھے جاتے ہیں، ان سے پہلے ہی رنگِ سخن ناسخ نے اور ان کے لعبد مومن نے ایجاد کیا اور غالب ایک طرح سے ان دونوں کے متبع ہیں۔ ویسے بھی محمد حسین آزاد کی طرح مرزا صاحب کا یہ دعویٰ تھا کہ غالب کو اردو نہیں آتی۔

فانی کی ان صحبتوں میں اکثر غالب کی شاعری زیر بحث آتی اور غالب کے "طرفدار" اور "سخن فہم" ان بحثوں میں شریک ہوتے، غالب کے طرفداروں میں فانی، حکیم آزاد انصاری، علامہ حیرت، ہوش بلگرامی اور نواب نثار یار جنگ وغیرہ ہوتے جبکہ سخن فہموں میں یاس یگانہ، جوش ملیح آبادی، نجم آفندی وغیرہ ہوتے، خوب خوب بحثیں ہوتیں اور ایک ایک شعر کی وہ جراحی ہوتی کہ بس!! مرزا یاس یگانہ نے غالب کے تمام اردو کلام پہ اصلاح کا سلسلہ شروع کیا تھا، ممکن ہے یہ مسودات کہیں محفوظ ہوں۔

غالب کے مطلع دیوان پہ مرزا صاحب کو اعتراض یہ تھا کہ "ہر پیکر تصویر" غلط ہے کیونکہ تصویر کا ایک ہی پیکر ہوتا ہے اور "پیکر ہر تصویر" کہنا چاہئے تھا۔ مرزا صاحب نے اس پہ جو اصلاح دی وہ غالباً کچھ یوں تھی۔

کاغذی ملبوس میں پیکر ہے ہر تصویر کا

اسی طرح غالب کا یہ شعر ؎

آئے ہے بیکسیِ عشق پہ رونا غالب　　　　کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

مرزا صاحب کے نزدیک اصلاح طلب تھا اور انہیں سیلابِ بلا پہ اعتراض تھا، یہ درست ہے کہ اب "سیلاب" بہ معنی طوفان استعمال ہوتا ہے لیکن "سیلاب" کے معنی ہیں "سیلِ آب" پھر ویسے بھی "سیلابِ بلا" میں لفظی تنافر ہے۔ مرزا صاحب کی اصلاح یہ تھی۔

کس کے گھر جائے گا یہ سیلِ بلا میرے بعد

ان کا کہنا تھا کہ حرفِ اشارہ "یہ" سے شعر زیادہ پُر معنی ہوگیا ہے اور تنافر لفظی کا عیب بھی جاتا رہا۔ ؎

ہنگامۂ زبونیٔ ہمت ہے انفعال!　　　　حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

اس شعر میں مرزا صاحب کو لفظ "ہنگامہ" پر اعتراض تھا اور ان کا کہنا تھا کہ یہ لفظ اس شعر میں کوئی معنی نہیں دیتا۔ مرزا صاحب نے اصلاح اس طرح دی۔

پیرایۂ زبونیٔ ہمت ہے انفعال　　　　حاصل نہ کیجئے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

مرزا صاحب نے غالبؔ کے بعض شعروں میں ذم بھی تلاش کر لیا تھا مثلاً:

بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے

یا اس شعر میں:

کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند　　　　کس کی حاجت روا کرے کوئی!

اگر کوئی کم علم دونوں مصرعوں کے ابتدائی الفاظ کو اعراب کی تبدیلی کے ساتھ پڑھے تو یا یہ مرزا صاحب کی سراسر زیادتی تھی لیکن غالب کے باب میں وہ ایسی زیادتیوں کو روا رکھتے تھے۔

مرزا صاحب غالبؔ کی شاعری سے قطع نظر غالبؔ کے ذاتی کردار پر بھی بھرپور وار کرتے اور اس کو کاسہ لیس، خوشامدی، بے غیرت اور نہ جانے کیا کیا تاریخی شواہد سے ثابت کرتے اور اس طرح اس کی مذمت میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھتے۔

ان صحبتوں میں بعض اوقات ادبی بحثیں ذاتیات کا رنگ اختیار کر جاتیں اور جن کے نتیجے میں بعض ادب پارے بھی تخلیق ہوئے۔ جوشؔ کی نظم "غزل گو شاعر سے خطاب" خالصتاً فانیؔ کے متعلق ہے فانیؔ اور یگانہؔ نے بھی ایک دوسرے کے متعلق رباعیاں کہی ہیں۔ مثلاً فانیؔ کی یہ رباعی:

کیا خضرِ طریق کہہ کے رہزن کہتے　　　　بنتی نہیں موم کہہ کے آہن کہتے
ورنہ وہ دوستوں نے ایذا دی ہے　　　　شرم آتی ہے دشمن کو بھی دشمن کہتے

غرض یہ صحبتیں اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہیں۔ لیکن دل کے ساتھ ساتھ ذہن بھی آج تک انہی صحبتوں میں دھڑکتا ہے۔ ان بزرگوں کی دشمنی بھی آج کل کی دوستی سے زیادہ وقیع تھی۔ وہ لوگ صاحبِ علم تھے۔ آج کل کے ادیب کم سواد ہیں۔ وہ لوگ اختلافِ رائے کے باوجود احترام دوستی میں خلل نہ آنے دیتے تھے۔ ہائے کیا لوگ تھے!

دے صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

(۷۵)

بُرا آدمی

"تابش میں کیسا آدمی ہوں ؟"

"بخاری صاحب آپ بہت بُرے اور بہت اچھے آدمی ہیں !!"

"یہ کیا بات ہوئی ؟ آدمی اچھا ہوتا ہے یا بُرا ۔ !"

"یہ ٹھیک ہے ۔ آپ جب تک آدمی رہتے ہیں اس وقت تک بہت اچھے رہتے ہیں اور جب آدمی کی ایکٹنگ کرتے ہیں تو بہت بُرے ہو جاتے ہیں ۔"

"مگر میں بُرے آدمیوں سے آدمی کی ایکٹنگ کرتا ہوں اچھے آدمیوں سے نہیں !!"

عید کے دن محمد علی بوگرہ کے عید ڈنر میں جاتے ہوئے مجھے دفتر چھوڑتے وقت یہ گفتگو ہوئی ، وہ مجھے دفتر چھوڑ کر چلے گئے اور میں دیر تک "میں بُرے آدمیوں سے آدمی کی ایکٹنگ کرتا ہوں ، اچھے آدمیوں سے نہیں " کا فقرہ اپنے ذہن میں دُہراتا رہا ۔ کیا واقعی بخاری صاحب آدمی کی ایکٹنگ صرف بُرے آدمیوں سے ملتے وقت کرتے تھے یا وہ خود بھی بُرے آدمی تھے ؟ وہ خوشامد سے ناخوش بھی ہو جاتے ، نجی اور بے تکلف صحبتوں میں وہ ایک دم افسر بن جاتے ، کم سوادوں کو اعلیٰ درجے پر فائز کرتے ، تک بندوں کو اچھی اچھی نوکریاں دیتے ، مشاہیر شعراء اور ادیبوں پر ذاتی پسند اور ناپسند کے لیبل لگاتے ، اہل پنجاب انہیں پنجابی ، لکھنؤ والے انہیں لکھنوی ، دِلّی والے انہیں دِلّی والا ، اہلِ تشیع انہیں شیعی اور اہل سُنّت انہیں سُنّی سمجھتے ۔ وہ بچّوں میں بچّے ، نوجوانوں میں نوجوان اور بوڑھوں میں بوڑھے تھے ، مزاج میں فقیری مگر رہن سہن شاہانہ ، لوگوں سے ان کے تہذیبی خول اُتار کر ملتے ، اچھائیوں کی طرح لوگوں کی بُرائیاں بھی ایک ایک آدمی سے بیان کرتے ۔ بخاری صاحب کے اسی مختلف جہت کردار نے انہیں مشکل آدمی بنا دیا اور دُنیا والوں کی نظر میں ان کی یہ سب سے بڑی بُرائی تھی ۔

وہ پشاور کے رہنے والے تھے مگر ہندکو ، سرائیکی ، پنجابی ، فارسی ، انگریزی اور اُردو کے واقف اور دلدادہ تھے اور اسی طرح مختلف تہذیبوں سے ان کا خمیر اُٹھا ۔ شعر و ادب میں وہ رحمٰن بابا ،

خوشحال خان، وارث شاہ، بھلے شاہ، بابا فرید، شیکسپیئر، حافظ سعدی، اقبال، میر، غالب اور حسرت کے عاشق تھے۔ ذوق، مومن، جوش، فانی اور جگر کو ناپسند کرتے نشست و برخاست میں دہلوی اور لکھنوی انداز، رسم و رواج میں کبھی پنجابی اور گھر کی آرائش بالکل انگریزی، انہی مختلف تہذیبوں کے خمیر نے ان کے کردار کے بہت سے رُخ قائم کئے اور کوئی ایک متعین شکل نہیں دی۔

وہ ہر قبیل کے آدمی سے کچھ نہ کچھ اخذ کرتے، افسرین کر آدمی کی نفسیات کا مطالعہ کرتے کم سوادوں سے کردار کی بلندی اور لقمان کی طرح بے ادبوں سے ادب سیکھتے، ادب و شعر کی ذاتی پسند اور ناپسند سے وہ ادبی ذوق کی تربیت کرتے۔

آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت کے دوران میں مجھے ان سے ملاقات کا شرف کبھی حاصل نہیں ہوا۔ وہ بمبئی میں تھے اور میں دلّی میں، ان سے پہلی ملاقات ۱۹۴۷ء میں لاہور میں ہوئی، ایک روز مجھ سے فرمایا "تابش صاحب پاکستان بن گیا ہے۔ اب دہلوی دہلوی نہیں چلے گا"۔ میں نے عرض کیا بخاری صاحب دلّی بخارا سے تو قریب ہے۔ اس جواب سے خوش ہوئے۔ اسی طرح ایک روز میں خبریں پڑھ رہا تھا۔ خبروں کے بعد مجھے طلب کیا کہنے لگے آپ دِلّی کے ہیں۔ یہ لفظ نِشَست ہے یا نَشِست، میں نے کہا میں دلّی کا ہوں اور لفظ فارسی کا ہے۔ اس کا تلفظ نِشَست ہے اس جواب پر مجھے غور سے دیکھا اور پھر محبت سے اپنے پاس بٹھا لیا۔ سنہ ۱۹۴۹ء میں خبروں کا شعبہ کراچی میں منتقل ہوا تو میں کراچی آگیا اور بخاری صاحب کے اصرار پر ان کے یہاں شام کی صحبتوں میں حاضر ہونے لگا۔ شام کے حاضر باشوں میں محشر بدایونی، ارم لکھنوی، حمید نسیم، حفیظ ہوشیارپوری، سلیم گیلانی، رشید تبسم، زیبا ردولوی اور ریڈیو کے بعض افسر ہوتے۔ ان صحبتوں میں نہایت دلچسپ موضوع زیرِ بحث آتے۔ ہم لوگ رات کا کھانا اکثر بخاری صاحب کے یہاں کھاتے اور رات گئے جب یہ محفلیں برخاست ہوتیں، تو اپنی موٹر میں بخاری صاحب ہر شخص کو گھر چھوڑ کر آتے۔

میں ۱۹۵۰ء میں حلقۂ اربابِ ذوق کراچی کا سیکرٹری تھا حلقہ کا سالانہ اجلاس بڑے دھوم دھام سے ہوا۔ اسٹیٹ بنیک کے گورنر زاہد حسین نے صدارت کی۔ اسی سلسلے میں ایک ہند و پاکستان مشاعرے کا بھی اہتمام ہوا۔ اس کو کامیاب بنانے میں ممتاز حسن، الطاف گوہر اور ضیاء جالندھری پیش پیش تھے۔ یہ مشاعرہ وائی ایم سی اے میں ہوا۔ ہندوستان سے ہری چند اختر، جگن ناتھ آزاد اور رزم ردولوی

نے شرکت کی، مشاعرے کے دوسرے روز بخاری صاحب نے اپنے یہاں عشائیہ اور مشاعرہ ترتیب دیا۔ شعراء میں آل رضا، احسان دانش، حفیظ جالندھری، بہزاد لکھنوی، حامد لکھنوی، قمر جلالوی، ارم لکھنوی نہال سیوہاروی، ادیب سہارنپوری، ماہر القادری، شمس زبیری، شعیب حزیں، جگن ناتھ آزاد، رزم ردولوی، حمید نسیم، حفیظ ہوشیار پوری، ندیم قاسمی، احمد فراز، محشر بدایونی، جمیل الدین عالی، شان الحق حقی، سیما انصاری، غرض تمام خوش گو شعراء تھے۔ مشاعرے میں حفیظ جالندھری پاؤں پھیلائے بیٹھے تھے حفیظ سے کہا یہ بزم ادب ہے ادب سے بیٹھئے اور اس طرح انہوں نے میر درد کی تہذیبی روایت کو زندہ کر دیا۔ ہر چند بخاری صاحب نہ خواجہ میر درد تھے اور نہ حفیظ شہزادے۔

غالباً ۱۹۵۲ء میں آرزو لکھنوی کراچی آگئے۔ ان کے آنے سے کراچی کی ادبی زندگی میں گہما گہمی پیدا ہوگئی۔ روز کہیں نہ کہیں دعوت اور مشاعرے ہونے لگے، بخاری صاحب کے یہاں بھی ادبی محفلیں جمنے لگیں۔ ان میں شہر کے تمام خوش گو شعراء مدعو کئے جاتے اور خوب خوب دادِ سخن پاتے۔ اسی زمانے میں ریڈیو پاکستان کراچی میں ایک مشاعرہ ہوا اس میں لکھنوی شعراء زیادہ مدعو تھے، دِلّی کے ایک معروف شاعر حیدر دہلوی بھی مدعو تھے۔ بخاری صاحب پر اس زمانے میں لکھنوی رنگ زیادہ غالب تھا۔ دورانِ نشر بخاری صاحب نے مشاعرے کی داد کو کچھ ایسا رنگ دیا جس سے حیدر دہلوی کی سبکی ہوتی تھی جمیل الدین عالی نے اس انداز کو بھانپ لیا اور وہیں بکھر گئے۔ غرض مشاعرے کے بعد بخاری صاحب اور عالی میں خاصی بدمزگی ہو گئی، اتفاق سے مشاعرے کے بعد ایک دعوت میں جانا تھا۔ شعیب حزیں اور ارم لکھنوی دعوت میں بخاری صاحب کے قریب ہی بیٹھے تھے۔ فرمایا: "تابش آج کے واقعے کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟" سوال ٹیڑھا تھا، میں نے عرض کیا، "صاحب زیادتی آپ کی تھی،" کہنے لگے "اگر دِلّی والوں کے مقابلے میں لکھنؤ والے شعر اچھا کہتے ہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔" میں نے عرض کیا کہ "لکھنؤ والوں نے پوری ادبی تاریخ میں شعر اچھا نہیں کہا ایک لے دے کے آتش ہیں۔ ان پر بھی دہلویت کی چھاپ ہے اور ویسے بھی لکھنوی شاعری میں سوائے چونچلے اور نخرے کے کیا ہوتا ہے؟" فوراً بولے۔ "اور داغ کے یہاں کیا ہے؟" میں نے کہا۔ "جی ہاں۔ داغ کے یہاں بھی چونچلے اور نخرے ہیں۔ لیکن رنڈی بازکے ہیں۔ رنڈی کے نہیں!!" اس فقرے کے بعد ان کا سارا غصہ دُور ہوگیا اور میرے فقرے کا دیر تک مزہ لیتے رہے!!"

ریڈیو بخاری صاحب کی زندگی تھا۔ وہ زندگی ہی کی طرح اس کی آرائش کرتے تھے۔ یہ گملہ یہاں رکھا جائے گا یہ بلب یہاں لگے گا۔ اس اسٹوڈیو کی میز کا کپڑا اور پردے اس رنگ کے ہوں گے۔ اس دیوار پر یہ رنگ ہوگا چھت کی زیبائش اس طرح ہوگی۔ غرض ریڈیو کی ہر آواز، ہر پروگرام بخاری صاحب کو زندگی کی طرح عزیز تھا۔ ذرا خرابی پیدا ہوئی اور اُن کی روح نے کرب محسوس کیا۔ وہ ہمہ وقت ریڈیو اور ریڈیو والوں کی بہبود میں منہمک رہتے اور اپنے آپ کو اسی ایک لگن میں لگائے رکھتے، دراصل بخاری صاحب دکھی آدمی تھے۔ اُن کا سب سے بڑا دُکھ احساسِ تنہائی تھا جسمانی اور ذہنی تنہائی

بخاری صاحب کے مزاج میں فقیری کا عنصر اُنہیں وراثت میں ملا تھا۔ وہ پیروں کی اولاد تھے اور یہی وجہ تھی کہ وہ کسی کو مفلوک الحال دیکھ کر بے چین ہو جاتے۔ لوگوں کی مدد چھپا کر کرتے، کسی کو روپے دیتے کسی کو اپنے کپڑے دے دیتے اور کانوں کان کسی کو خبر نہ ہونے دیتے اور پھر یہ بھی ہوتا کہ اپنے سگریٹوں کے لئے وہ دوسروں سے بھی پیسے مانگ لیتے نہ کبھی لے کر واپس کرتے اور نہ کبھی دے کر مانگتے۔

دوسروں کی ذرا سی خوشی کے لئے وہ بڑی سے بڑی بات کرنے پر آمادہ ہو جاتے۔ ایک دفعہ انجمن ترقی اُردو کراچی نے چندے کی فراہمی کے لئے ایک وفد میجر آفتاب حسن کی سرکردگی میں کوئٹہ بھیجا اور کوئٹہ ہی میں ایک کل پاکستان مشاعرے کا انتظام کیا، اس مشاعرے میں جگر مراد آبادی (جو اِن دنوں کراچی آئے ہوئے تھے) ادیب سہارنپوری، تسنیم مینائی، سید محمد جعفری، ماہر القادری، اقبال صفی پوری اور کوئٹہ کے کچھ مقامی شاعر شریک ہوئے۔ بخاری صاحب ان دنوں کوئٹہ ریڈیو اسٹیشن کے افتتاح کے لئے کوئٹہ گئے ہوئے تھے ان کو جب اُردو کے لئے چندے کی فراہمی کی تحریک ہوئی تو وہ چار پانچ روز تک ہم لوگوں کو ساتھ لے کر ایک ایک سردار کے پاس گئے اور کچھ پشتو اور کچھ اردو بول کر ان سے کئی ہزار روپے وصول کر لائے۔

بخاری صاحب کے کردار کے اتنے پہلو ہیں کہ انہیں کسی مقررہ اور متعین کردار کا آدمی نہیں کہا جا سکتا۔ وہ با ہمہ رَد و بے ہمہ شو پر عامل تھے۔ وہ تنہائی میں ایک انجمن اور انجمن میں تنہا تھے۔ زندگی کے معاملات پر ان کی گہری نظر تھی۔ وہ انسان کا اچھا مطالعہ رکھتے تھے میں نے ان کا طنطنہ بھی دیکھا ہے اور انہیں معمولی معمولی باتوں پر روتے بھی دیکھا ہے۔ ان کی افسری بھی دیکھی ہے اور ماتحتوں سے ان کا سلوک بھی دیکھا ہے۔ دوستوں پر ان کی شفقت اور رنجشیں بھی نظر سے گزری ہیں۔ بزم شعر و ادب میں ان کی شائستگی اور تہذیب کے منظر

بھی سامنے ہیں اور ان کی داد و دہش اور ان کی جزرسی بھی نظر میں ہے۔

بخاری صاحب محمد علی بوگرہ کے عید ڈنر میں نہیں اب بہت دُور چلے گئے ہیں۔ مگر میرے ذہن میں اب بھی یہ فقرہ کبھی کبھار گونجتا ہے۔ "میں آدمی کی ایکٹنگ بُرے آدمیوں سے کرتا ہوں اچھے آدمیوں سے نہیں۔"

کیا واقعی بخاری صاحب آدمی کی ایکٹنگ کرتے تھے یا وہ تھے ہی بُرے آدمی۔

اتوار کے اتوار

آغا سلیم بیگ میرے رشتے کے سالے تھے، وہ رشتے میں مجھ سے چھوٹے مگر عمر اور اخلاق میں مجھ سے بڑے تھے، اتوار کے اتوار ان کے گھر احباب کی بیٹھک ہوتی، سفید چاندنی کا فرش، قرینے سے گاؤ تکیے اور گل تکیے رکھے ہوئے، اُگال دان، پانی کا جگ اور گلاس سلیقے سے دھرے ہوئے اور بیچوں بیچ آغا کا خوبصورت اور مُسکراتا ہوا جسم کسی تکیے کے سہارے ٹکا ہُوا۔ احباب کی اس بیٹھک میں پکڑ پن سے لے کر شعروادب کے مسائل تک غرض سبھی کچھ ہوتا۔ اکثر دوپہر کا کھانا ہم لوگ مل کر کھاتے کبھی آغا اہتمام کرتے اور کبھی احباب ایک ایک ڈش لے آتے۔ اِن محفلوں میں جگر مرادآبادی اور حیرت بدایونی بھی شریک ہوئے ہیں، یہ دونوں اس زمانے میں کراچی آئے ہوئے تھے

بخاری صاحب اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ ان محفلوں میں شریک ہوتے اور کہتے کہ مجھے آغا کے پاس آکر دلّی کی تہذیب کے مزے ملتے ہیں۔ وہ ہر محفل کو اپنی بذلہ سنجی اور دلچسپ باتوں سے یادگار محفل بنا دیتے' کبھی فارسی شعراء زیرِ بحث آتے اور وہ ان کے مدارج مقرر کرتے کبھی وہ ذوق کی مخالفت میں غالب کے طرفدار بن جاتے اور خوب خوب باتیں کرتے، اُردو شعراء میں میر و سودا، غالب و اقبال اور حسرت ان کے پسندیدہ شاعر تھے۔ فانی، جگر اور جوش کو وہ ناپسند کرتے تھے۔ اِن شعراء کے متعلق اکثر گفتگو رہتی مگر ان کی مخالفت میں ان کی دلیلیں اکثر کمزور ہوتیں۔ ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا تم فانی کے بڑے پرستار ہو کوئی اچھا شعر سناؤ، مطلب یہ تھا کہ فانی نے اچھا شعر کہا ہی نہیں ہے، جہاں سے فرمائیں پڑھنا شروع کردوں اس سے میرا مطلب تھا کہ فانی کا سارا کلام منتخب ہے اور مزید انتخاب کی ضرورت نہیں، میں نے شعر

پڑھنے شروع کئے۔ اور جب یہ شعر پڑھا ؎

خود تجلّی کو نہیں اذنِ حضوری فانیؔ　　　آئینے ان کے مقابل نہیں ہونے پاتے

تو فرمایا اماں تابشؔ اس میں تو زباں کی بھی غلطی ہے مصرع یوں ہونا چاہیئے تھا۔ ع

آئینہ ان کے مقابل نہیں ہونے پاتا

میں نے عرض کیا بخاری صاحب آپ آئینے کو LOOKING GLASS سمجھ رہے ہیں یہاں آئینے سے مراد وہ اعیان و مظاہر ہیں جس میں حُسنِ ازل منعکس ہوتا ہے اور جمع کا صیغہ عمومیت کے لئے استعمال ہوا ہے، غرض خوب بحث ہوتی۔ جاتے وقت مجھ سے کہنے لگے، فانیؔ کی کتابیں کل دفتر میں مجھے پہنچا دینا۔

ایک دفعہ بخاریؔ صاحب آئے تو ان پہ غالبؔ کی طرفداری کا موڈ زیادہ طاری تھا اور وہ یہ شعر پڑھ کر جھوم رہے تھے۔ ؎

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا　　　دل جگر تشنۂ فریاد آیا

اور پڑھتے پڑھتے وہ اس شعر کو گنگنانے لگے، شعر گنگنانے میں انھوں نے " دل جگر ایک ساتھ پڑھا اور تشنۂ فریاد" کو الگ کر کے پڑھا، مجھے شرارت سوجھی میں نے کہا بخاریؔ صاحب غالبؔ کا یہ شعر سمجھ میں نہیں آتا گنجلک ہے، فرمایا سیدھی بات ہے دل اور جگر تشنۂ فریاد تھے اس لئے بار بار دیدۂ تر یاد آتا ہے۔ میں نے عرض کیا غالبؔ کا غالباً دل تشنۂ فریاد تھا کہنے لگے اور " جگر بھی " میں نے کہا جگر کا تو اِس شعر میں کہیں ذکر نہیں کیونکہ یہ مصرع یوں ہے " دل۔ جگر تشنۂ فریاد آیا " یعنی غالب دل کو جگر تشنۂ فریاد کہتے ہیں اور فارسی اور بعض شعراء اُردو کے یہاں " جگر خام ، اور جگر تشنۂ " ایک ہی لفظ کے طور پہ استعمال ہوا ہے۔ جیسے میر دردؔ کا مصرع ہے ع

دل وہ کباب تھا کہ جگر خام رہ گیا

اس جواب کو سُن کر خاموش ہو گئے، میرا خیال ہے وہ میرا امتحان لینا چاہتے تھے۔ بخاری صاحب کی ہمہ جہت شخصیت نئے نئے رُوپ دکھاتی تھی، ایک دفعہ بخاریؔ صاحب اپنے ہاتھ کے پکائے ہوئے سالن اور صوفی صاحب کے تنور کی روٹیاں لائے۔ یہ صوفی صاحب صوفی غلام مصطفٰے تبسّم کے بھائی ہیں اور ان کے تنور کی روٹی واقعی بہت عمدہ ہوتی ہے۔ بخاری صاحب خود نہایت کم خوراک تھے مگر احباب

کو کھلا کر خوش ہوتے اور اس کے لئے بڑا اہتمام کرتے، اُس روز کا کھانا واقعی نہایت لذیذ تھا اور حیرت ہوئی کہ بخاری صاحب نہ صرف یہ کہ کھانا کھانے میں خوش مذاق ہیں بلکہ خود بھی عمدہ کھانا پکا لیتے ہیں۔

آغا سلیم بیگ کی یہ محفلیں جب تک احباب زندہ ہیں دلوں کو اپنی یادوں سے گرماتی رہیں گی، مجھے ان محفلوں میں بیٹھ کر حیدرآباد دکن میں چند ولعل کا دیوان خانہ جس کا ذکر اکثر سُنا اور دتی میں لالہ سری رام کا دیوان خانہ جسے میں نے دیکھا اکثر یاد آجاتے۔ اِن یادوں کے ساتھ بعض بزرگوں اور دوستوں کی بھی یاد حرزِ جاں ہے۔ بخاری صاحب اب ہم میں نہیں مگر یہ یقین کرنے کو کسی طرح دِل آمادہ نہیں ہوتا کہ وہ مر گئے ہیں۔

فانی کی شاعری میں انبساط

دراصل منفی مسرت کا نام غم ہے۔

اتنا ہنسنا کہ آنسو نکل پڑیں، اس قدر تیز روشنی، کہ نگاہیں خیرہ ہو جائیں اور کچھ نظر نہ آئے، ایسا زہر، کہ دواؤں کے کام آئے، کیا ہے؟ ہنسی کے آنسوؤں کو غم کے آنسو، تیز روشنی کو اندھیرا اور زہر کو دوا پھر بھی نہیں کہا سکتا، حالانکہ آنسو غم میں نکلتے ہیں، چیزیں صرف اندھیرے میں نظر نہیں آتیں اور زہر ہمیشہ مہلک ہوتا ہے۔ اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ ایک ہی چیز کے داخلی اور خارجی عوامل ہر آدمی پر مختلف کیفیات مرتب کرتے ہیں اور ہم انہیں ممیّز کرنے کے لئے مسرت اور غم، روشنی اور اندھیرا، زہر اور دوا کا نام دے دیتے ہیں۔ مسرت کو غم کا، روشنی کو اندھیرے اور زہر کو دوا کا ضد نہیں کہا جاسکتا، بلکہ غم مسرت کا، اندھیرا روشنی کا اور زہر دوا کا منفی پہلو ہے۔

سائنس کی رُو سے چیزوں کا اپنا کوئی رنگ نہیں ہوتا، بلکہ تمام رنگ نور میں ہوتے ہیں اور صرف "قبولیت کی صلاحیت"، مختلف چیزوں کو مختلف رنگوں میں دکھاتی ہے۔ یہ بات صرف مسرت و غم، روشنی اور اندھیرے اور زہر اور دوا تک ہی محدود نہیں، بلکہ ہر حُسن و قبح کے متعلق کہی جاسکتی ہے حُسن و قبح کا معیار اور اس کی اثر پذیری بھی مختلف آدمیوں کے لئے مختلف ہوسکتی ہے۔ اسی لئے نہ حسن و قبح کا کوئی ایک معیار مقرر کیا جاسکتا ہے اور نہ اثر پذیری کا۔ یہ اپنی اپنی "قبولیت کی صلاحیت" پر منحصر ہے۔ دراصل حسن و قبح کا راز تسویہ اور تناسب میں ہے۔ ایک حسین پیکر، یا ایک حسین منظر، جس قدر متناسب ہوگا ہم اس سے متاثر ہوں گے اسی طرح ایک قبیح پیکر یا قبیح منظر جس قدر متناسب ہوگا اسی قدر نفرت یا کراہت ہم پر اثر انداز ہوگی۔

معلوم ہوا کہ جس طرح حُسن کے لئے تناسب یا تسویہ ضروری ہے، اسی طرح قبح کے لئے بھی تناسب اور تسویہ ضروری ہے، ورنہ اثر پذیری معلوم؟ مثال کے طور پر متناسب سُروں کا ایک نغمہ ہم کو متاثر کرتا ہے اسی طرح ہم بجلی کی مہیب کڑک سے بھی ڈر جاتے ہیں۔ نغمے کے سُروں میں اگر تناسب نہ ہوتا تو ہم کوئی اثر قبول نہ کرتے۔ اسی طرح اگر بجلی کی کڑک میں سروں کا تناسب اور تسویہ نہ ہوتا تو ہم بالکل نہ ڈرتے۔ نغمے میں جمالی سُروں کا تناسب ہے اور بجلی میں جلالی سُروں کا۔

ارسطو بھی قبح کو حُسن ہی کی ایک ناگزیر صفت سمجھتا ہے اور اس بات کو مختلف طریقوں سے ثابت کرتا ہے۔ ۱؎ اس کے نزدیک ہر قابلِ تضحیک شئے طربیہ کا موضوع ہوتی ہے اور اس طرح چونکہ

قبح فنِ لطیف کی ضمن میں آجاتا ہے ، اسی لئے خوبصورت شئے کی ضروری صنف ہوا حسن و قبح دونوں میں سب سے زیادہ اہم اثر پذیری ہے اور جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں ، اثر پذیری تناسب اور تسویہ کی پابند ہے . قرآنِ پاک کا دعویٰ ہے : اَلَّذِیْٓ اَحْسَنَ کُلَّ شَیْءٍ خَلَقَہٗ ○ (۳۲ : ۷) یعنی کائنات میں جو کچھ ہے ، (اِن چیزوں سمیت جنہیں ہم قبیح سمجھتے ہیں) حسین ہے ۔ اصل میں قرآنِ پاک عام مفہوم سے الگ حسن کا مفہوم بیان کرتا ہے ۔ یعنی ہر چیز تناسب اور تسویہ کے ساتھ پیدا کی گئی ہے ، اسی لیے وہ حسین ہے ایک اور جگہ قرآنِ پاک میں اس بات کو اور زیادہ وضاحت سے بیان کیا گیا ہے

اَلَّذِیْ خَلَقَکَ فَسَوّٰکَ فَعَدَلَکَ ۙ فِیْٓ اَیِّ صُوْرَۃٍ مَّا شَآءَ رَکَّبَکَ ○ (۸۲ : ۷-۸)

اس (باری تعالیٰ) نے تیری تخلیق کی (تیرا ہیولا تیار کیا) پھر تیرے (عناصر ترکیبی) میں تناسب اور ہم آہنگی بہ حدِ کمال پیدا کی ، پھر تناسب و اعتدال کو جگہ دی ، اس کے بعد جیسی صورت بنانی چاہی ، بنا دی ۔"

ان آیات میں انسانی تخلیق سے لے کر اس کی صورت گری تک قرآنِ پاک نے چار[۱] ارتقائی مرحلے بیان کئے ہیں :

اوّل : تخلیق — اس سے مراد وجودِ انسانی کا خاکہ یا ہیولا بنانا ہے

دوم : تسویہ — کسی چیز کے عناصر ترکیبی میں مطلق اور اضافی ، ہر حیثیت سے اسی طرح مناسبت اور ہم آہنگی پیدا کرنا کہ وہ موزونی اور کمال کا مظہر بن جائے ۔

سوئم : تعدیل — انفرادی اور مجموعی ، جزوی اور کلّی ، مطلق اور اضافی ، ہر حیثیت سے کسی چیز کے مختلف اجزاء میں تناسب اور اعتدال پیدا کرنا ۔

چہارم : ترکیب صوری — صورت شکل بنانا (اس میں ڈیزائین بنانا بھی مضمر ہے)

تخلیقی فعلیت کے ان ارتقائی مرحلوں سے حُسن کا راز تسویہ اور تعدیل ہی میں مضمر ہوتا ہے ، چنانچہ ثابت ہوا کہ جس چیز میں تسویہ اور تعدیل ہے ، وہ حسین ہے ، خواہ وہ کوئی نغمہ ہو یا مہیب آواز ، مسرت ہو یا غم ، رات ہو یا دن ۔

اگسٹائن (THE HARMONY OF HARMONIES) میں کہتا ہے ۔

۱ے THE RHETORIC AND POETIC VII)

"بلاشبہ کاروبارِ فطرت کے بعض مظاہر ایسے بھی ہیں جن میں تمہیں حسن و خوبی کی کوئی گہرائی محسوس نہیں ہوتی۔ تم کہتے ہو کہ قمری و بُلبل کی نغمہ سرائی کے ساتھ ساتھ زاغ و زغن کا شور و غوغا کیوں؟ لیکن تم بھول جاتے ہو کہ ہستی کے ساز کا نغمہ کسی ایک سُر کے آہنگ سے نہیں بنتا اور بننا بھی نہیں چاہیئے تھا جس طرح آلاتِ موسیقی میں زیروبم کے تمام آہنگ ہوتے ہیں، اسی طرح سازِ فطرت میں بھی اُتار چڑھاؤ کے تمام آہنگ موجود ہیں۔ فطرت کی تالیف کے لئے جس طرح قمری و بلبل کا ہلکا سُر ضروری تھا، اسی طرح زاغ و زغن کا بھاری اور کرخت سُر بھی ناگزیر تھا۔"

نوائے بُلبل اگر نیست صوتِ زاغ شنو   بر اہلِ ذوق درِ فیض در نمی بندند

اس بحث سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ دُنیا میں کوئی چیز قبیح نہیں ہے۔ یہاں تک کہ غم بھی۔ غم مادی ہو یا روحانی، اُسی صورت میں متاثر کرے گا۔ اگر اس کے اجزائے ترکیبی متناسب اور معتدل ہوں گے۔ رُوح اُسے شدّت سے محسوس کرے گی اور اس کا اظہار بھی شدید ہوگا، لیکن دوسروں کو متاثر کرنے اور خود کو متاثر کرنے اور خود متاثر ہونے میں فرق ہے۔ غم کے اظہار میں بھی تناسب اور اعتدال ضروری ہے۔ فانؔی کا غم اور اس کا اظہار ان کا اپنا ہے۔ وہ اظہار سے پہلے اس غم کو شدّت سے محسوس کرتے ہیں اور اسی لئے ان کے اظہار کا پیرایہ بھی شدید ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار متاثر کرنے کی اعلیٰ صلاحیت رکھتے ہیں اور ان کے غم کے "متناسبات" اس قدر ہم آہنگ ہیں کہ قاری ان کے غم کو اپنا غم اور ان کے پیرایۂ اظہار کو اپنا پیرایۂ اظہار سمجھنے لگتا ہے ؎

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے   دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا!

ایک فن کار کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ جذبے اور اظہار، دونوں میں سچّا ہو۔ یہ بات فانی اور ان کی شاعری پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ انھوں نے جذبے کی سچّائی میں "دکھ کی روحانیت پسندی ترقی ہے۔" (THE SPIRITULISATION OF PAIN IS PROGRESS) پر عمل کیا ہے اور اظہار کی سچائی کے ثبوت میں ان کا سارا کلام پیش کیا جا سکتا ہے، جو تاثیر سے بھرپور ہے، کیونکہ جن اجزاء سے وہ مرکب ہے، وہ متناسب اور معتدل ہیں اور اس طرح فانؔی کا غم حُسن بن کر سامنے آتا ہے اور ان کا کلام پڑھنے والے پر نہایت گہرا اثر چھوڑتا ہے۔ فانؔی کا غم، غمِ محبّت ہے۔ میؔر کی طرح غمِ روزگار نہیں اور

اگر کہیں یہ جھلکیاں ملتی ہیں تو وہ بھی غم محبت کے پرتو سے اپنا جلوہ الگ دکھاتی ہیں ؎

غم ہائے روزگار سے ممکن نہیں گریز
یہ بھی ترے ستم میں سموئے ہوئے سے ہیں

ان کے غم محبت کے اجزائے ترکیبی سوز و گداز، ہجر و وصال کی محرومیاں اور نامرادیاں، صبر و رضا، وفاکیشی و وفا دوستی، شکر و شکایت، سپردگی و جاں سپاری، جبر و اختیار اور احساس حُسن و عشق ہیں۔ وہ انہی سے اپنی شاعری کا تانا بانا بنتے ہیں، اور اس طرح حسنِ فکر و رعنائی خیال کے جلوے دکھاتے ہیں۔

ان کے بعض قاری اور ناقد انہیں قنوطی اور موت کا شاعر کہتے ہیں اور میں یہ بات سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ایسا کیوں ہے؟ جب کہ ان کی تمام شاعری ادراکِ غم اور شعورِ غم سے دلوں میں حوصلہ مندی اور عیش کوشی کی تڑپ پیدا کرتی ہے اور اس کے ثبوت میں ان کے یہ شعر ملاحظہ ہوں ؎

ممکن نہیں ہے راحتِ دُنیا کی آرزو
غم پر گمانِ راحتِ دنیا کیے بغیر

غم کو جو خوشی بنا کے چھوڑے!
فانی وہ نصیب چاہتا ہوں

غم بھی گزشتنی ہے خوشی بھی گزشتنی
کر غم کو اختیار کہ گزرے تو غم نہ ہو

جیتے بھی ہیں تجھ پہ مرنے والے
غم زہر نہیں جو کام کر جائے

حالات سے مجبور ہو کر مرنے کی تمنا سب نے کی ہے حتّٰی کہ یہ تک کہہ دیا کہ مرنے کے بعد چین نصیب نہ ہوا تو پھر کیا کریں گے، لیکن فانی کی فکرِ بلیغ اس منزل سے آگے ہے۔ وہ ایسے دن کی تمنا کرتے ہیں جب مرنے کی تمنا دل میں باقی نہ رہے۔ یہ ترکِ دنیا نہیں، ترکِ عقبیٰ نہیں، شائد ترکِ ترک والی منزل کے ہم پلّہ ایک ایسی آرزو ہے، جس کی مثال زبانِ اُردو ہی میں نہیں۔ شائد دنیا کی کسی شاعری میں نہ مل سکے۔ فرماتے ہیں ؎

ایسا بھی کوئی دن مری قسمت میں ہے فانی
جس دن مجھے مرنے کی تمنا نہ رہے گی

وہ زندگی کو جاوداں بنانے کے آرزومند ہیں اور یہی حوصلہ مندی وہ دوسروں میں بھی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ غم کو حسین اور دلکش بنانے کے تمنائی ہیں اور یہی کوشش ان کے سارے کلام میں نظر آتی ہے۔ وہ بعض کے نزدیک اندوہ پسند (SADISTIC) ہوں گے، لیکن میری ذاتی رائے اس سے مختلف

ہے۔ ان کی عیش کوشی کی اس سے بڑی دلیل کیا ہوگی کہ وہ غم تک سے خوشی اور مسرت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔
میں یہ بات دہرانی چاہتا ہوں کہ فانی نے "درد کو روحانی" بنا کر انسانیت کی بہت سی بلندیوں کو چھوا ہے۔ پھر غور کیا جائے تو تہذیبی اور مذہبی ارتقاء کی تمام کوششیں بھی تو انہی منزلوں کی طرف آدمی کو لے جانا چاہتی ہیں، جہاں زندگی سوائے راحت اور مسرت کے اور کچھ نہ ہو اور اسی تگ و دو میں انسان نے کتنی "ناگواریوں" کو "گوارا" کا مقام دے رکھا ہے۔ تو پھر اگر فانی "غمِ ناگوار" کو "گوارا" بنانا چاہتے ہیں تو ان پر قنوطی ہونے کا لیبل کیوں لگایا جائے؟

فانی کے غم کے اجزائے ترکیبی جو خمیر اُٹھاتے ہیں وہ روح میں بالیدگی اور تازگی پیدا کرتے ہیں، نہ کہ زندگی سے اُکتاہٹ اور گھٹن۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں ؎

شام سے پہلے مرتے ہیں یا آخرِ شب تک جیتے ہیں
تیرے بغیر نہ جینے والے دیکھیے کب تک جیتے ہیں

زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں
ہائے اس قید کو، زنجیر بھی درکار نہیں

ایک شعر ملاحظہ ہو۔ موت کے مقابلے میں زندگی کو کتنا بے وقعت بتا کر دُنیا پر اور بھی زیادہ حقارت کی نظر ڈالی ہے۔ اندازِ بیان میں کس درجہ استغنا ہے ؎

دنیا، میری بلا جانے مہنگی ہے یا سستی ہے
موت ملے تو مفت نہ لوں ہستی کی کیا ہستی ہے

اور فرماتے ہیں ؎

بوئے خزاں تنے مست ہیں، یاد نہیں بہار کیا
ہم تو چمن پرست ہیں پھول کہاں کے خار کیا

تسکین عجیب چاہتا ہوں
دشمن کا نصیب چاہتا ہوں
تم دل میں بھی رہ کے دُور سے ہو
کچھ اور قریب چاہتا ہوں!

غالب نے تو یہ کلیہ بیان کر دیا تھا کہ درد حد سے بڑھ کر دوا بن جاتا ہے اور گویا اس طرح اس کا ازالہ خود بخود ہو جاتا ہے، لیکن فانی کے نزدیک دردِ محبت سے کبھی چھٹکارا نصیب نہیں ہوتا، بلکہ

یہ اعتمادِ محبّت کی انتہا ہے کہ کوئی فائدہ نہ ہونے کے باوجود محبوب کو ہر درد کی دَوا سمجھا جائے ؎

اللہ رے اعتمادِ محبت کہ آج بھی ! ہر درد کی دَوا ہیں وہ، اچھا کئے بغیر

اور پھر یہ اندازِ بیان بھی خوب ہے ؎

نامراد رہنے تک نامراد جیتے ہیں ! سانس بن گیا اک اک نالۂ نارسا ہو کر

مہربانی کی آس رہنے دے ! کون جیتا ہے مہربانی تک

جوانی کو قیامت خیز تو سبھی نے کہا ہے، لیکن اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے اور تبادلۂ خیالات کرنے کے بعد جب موضوعِ گفت گو کو انتہائی عروج پر لانا چاہا تو محبوب کی جوانی کا ذکر کیا گیا، اس کی سب سے زیادہ اہمیت پر دلالت کرتا ہے ؎

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا ! بات پہنچی تری جوانی تک

مر مر کے جیئے جانے کا دعویٰ تو بہت سے شاعروں نے کیا ہے لیکن یہ خیال انوکھا بلکہ نادر ہے کہ موت کی مشکلات کے پیشِ نظر برابر جیتے رہنے کی صورت گوارا کی گئی ہے۔

؎ تو دشنہ و پہلو میں حائل نظر آتا ہے جیتے ہیں کہ مرجانا مشکل نظر آتا ہے

فانؔی کے مخصوص طرزِ نگارش کی چند اور مثالیں حسبِ ذیل ہیں :

خود تجلّی کو نہیں اذنِ حضوری فانؔی ! آئینے ان کے مقابل نہیں ہونے پاتے

دِل کے سِوا یہاں کوئی محرمِ رازِ دل نہیں بے خبروں سے کیوں کہیں اہلِ خبر سے کیا کہیں ؟

رہ گئی حسرتِ وفا باقی !! دل کو اندازۂ ستم نہ ہوا

بے ذوقِ نظر بزمِ تماشا نہ رہے گی منھ پھیر لیا ہم نے تو دُنیا نہ رہے گی

فانؔی کے ان اشعار میں وہ تمام اجزا آ گئے، جن کا ذکر اوپر کیا گیا۔ یہ اجزا فانؔی کی شاعری کو سراسر حُسن بناتے ہیں اور حُسن ہمیشہ انبساط کا سبب ہوتا ہے نہ کہ غم گینی اور قنوطیت کا۔ اسی اعتبار سے فانؔی کے اندازِ فکر اور حُسنِ بیان کو منفرد کہا اور سمجھا جاتا ہے۔

مرثیہ نگاری میں اثر جلیلی کا مقام

مرثیہ ـــــ وہ نظم ہے جس میں کسی شخص کی موت پر حسرت و غم کا اظہار کیا جائے اور مرنے والے کی خوبیاں اور اوصاف بیان کئے جائیں ۔

اردو میں عام طور پر مرثیہ کا لفظ شہادت اہلِ بیت ہی کی طرف ذہن کو منتقل کرتا ہے لیکن دراصل مرثیہ صرف واقعاتِ کربلا کے بیان سے مخصوص نہیں ہے ، دوسروں کے مرنے پر بھی جو نظمیں لکھی گئی ہیں۔ ان کو بھی مرثیہ ہی کہتے ہیں، لیکن اب اُردو شاعری میں مرثیہ سے مراد صرف واقعاتِ کربلا کا بیان ہے ۔

عرب میں شاعری کا آغاز فخریہ نظموں سے ہوا، ان نظموں میں وہ اپنے بہادروں کے کارنامے بیان کرتے اور اس کے ساتھ وہ ان نظموں میں ان کی موت پر اظہارِ افسوس بھی کرتے اور چونکہ اہلِ عرب کی زندگی تصنع سے پاک تھی اس لئے ان کی ان نظموں میں بھی سچائی اور جوش و جذبہ ہوتا جو دل پر نہایت اثر کرتا اور اس طرح ان فخریہ نظموں کی ایک شاخ مرثیہ بھی قرار پائی ۔ عرب کی شاعرات میں خنسا کے مرثیے نہایت مشہور ہیں ۔

عرب میں واقعۂ کربلا کے متعلق مرثیے شاذو نادر ہی ہیں ، وہ دور چونکہ بنی اُمیہ کا دور تھا اس لئے حکومت کے خوف سے لوگ عام طور پر اپنے اندوہ و غم کے جذبات کا اظہار کھُلے بندوں نہ کر سکے ہوں گے ۔ اور ایران اور ہندوستان میں جس طرح محرم منایا جاتا ہے اور جس طرح مجالس کا انعقاد اور مرثیہ خوانی ہوتی ہے ۔ یہ عرب میں کبھی نہیں ہوا ۔ اس لئے جس طرح ہندوستان میں واقعۂ کربلا کے ایک ہزار سال بعد مرثیے لکھے گئے یہ صورت اہلِ عرب کو کبھی پیش نہیں آئی ۔

فارسی شاعری جس زمانہ میں شروع ہوئی وہ زمانہ مرثیہ نگاری کے لئے موزوں نہ تھا کیونکہ مرثیہ اور غزل ہی ایسی اصناف ہیں جن کا کوئی صلہ یا انعام نہیں ہے، فارسی شاعری کے آغاز اور عروج کے زمانے میں مُلکی انقلاب اور شخصی حادثات کتنے ہی پیش آئے لیکن فارسی میں شہر آشوب اور مرثیے برائے نام ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانے میں ستائش اور صلہ کی کوششیں زیادہ تھیں اور درباروں کی باریابی کو لوگ اپنے لئے زیادہ منفعت بخش سمجھتے تھے ۔ فارسی کا پہلا مدحیہ قصیدہ مامون الرشید کا عباس مروزی

نے لکھا۔

پھر بھی فارسی مرثیہ سے بالکل خالی نہیں۔ شعرالعجم میں علامہ شبلی لکھتے ہیں کہ فارسی میں فرخی سے پہلے مرثیہ کے اشعار بہت کم پائے جاتے ہیں اور جو ہیں بھی وہ بہت معمولی درجے کے ہیں۔ لیکن فرخی نے سلطان محمود کا جو مرثیہ لکھا ہے وہ نہ صرف پُرتاثیر ہے بلکہ اس فن کے تمام اصول اور آئین اس سے قائم ہو سکتے ہیں۔

مرثیہ نگاری کے بڑے بڑے اصول یہ ہیں :-

۱۔ ممدوح کی عظمت اور شان کا ذکر کرنا تاکہ عبرت حاصل ہو کہ اس پایہ اور مرتبہ کا شخص دُنیا سے اُٹھ گیا۔

۲۔ اس کے مرنے سے جو رنج و غم اور ماتم برپا ہوا اس کا ذکر

۳۔ اس کو مخاطب کر کے ایسے خیالات ظاہر کرنا جس سے ظاہر ہو کہ مرنے والے کی موت کا یقین نہیں ہے بلکہ وہ زندہ ہے۔

فرخی کے بعد خلیفہ مستعصم باللہ کا سعدی کا مرثیہ مشہور ہے جس کا مطلع یہ ہے۔

آسماں راحق بود گر خوں ببارد بر زمیں　　بر زوالِ ملکِ مستعصم امیرالمومنین!

یہ عجیب بات ہے کہ فارسی شاعری کے آغاز یعنی ۳۰۰ھ سے تقریباً چھ سات سو برس تک ایران میں بھی شہادتِ عظمیٰ کے مرثیے نہیں لکھے گئے، سلاطینِ صفویہ کے زمانے میں مرثیہ نگاری کا آغاز ہوا یعنی طہماسپ صفوی کے حکم سے پہلے محتشم کاشی نے اپنا بے نظیر مرثیہ لکھا جو اپنی خوبیوں کے لحاظ سے پہلا اور آخری ہے اس کے بعد محسن کاشی، ظہوری اور مُقبل وغیرہ نے مرثیے لکھے اور اس کو ایک مستقل صنفِ شاعری بنا دیا۔

ہمارا اصل مقصد اردو مرثیہ ہے، غالباً سب سے پہلا مرثیہ نگار محمد قلی قطب شاہ ہے، لیکن دکن میں سولہویں صدی تک جو مرثیے لکھے گئے انہیں خالص اردو مرثیہ نہیں کہا جا سکتا وہ دکنی اُردو کے مرثیے ہیں۔

دکن کی طرح دلّی میں مرثیے نہ لکھے جانے کا سبب یہ ہے کہ یہاں کے بادشاہ گولکنڈہ اور بیجاپور کے بادشاہوں کی طرح شیعی نہیں تھے، پھر بھی دلّی میں مرثیہ گو شاعر پیدا ہوئے ان میں سب سے پہلے فضلی

ہیں جن کی کربلا کتھا یا وہ مجلس مشہور ہے اور ان کے ہمعصر امامیؔ، آبروؔ اور عاصمیؔ ہیں امامی میر انیسؔ کے اجداد میں سے ہیں، ان کے بعد مسکینؔ، سکندرؔ اور گداؔ ہیں

سوداؔ نے قصیدہ کی صورت میں بھی مرثیے کہے ہیں اور ترجیع بند، ترکیب بند، مثلث، مربع مخمس، مسدس اور مستزاد کی صورت میں بھی، میر تقی میرؔ نے بھی سلام اور مرثیے کہے ہیں۔ ان میں سوداؔ کی طرح مضمون آفرینی اور جدت طرازی نہیں ہے مگر سوداؔ سے زیادہ پُر تاثیر اور پُر سوز ہیں۔

دلی کے شعراء میں سوداؔ اور میرؔ کے بعد درخشاںؔ اور صابرؔ وغیرہ نے بھی مرثیے کہے ہیں، لکھنؤ کے شعراء میں میر ضاحکؔ اور اُن کے بیٹے میر حسنؔ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، صرف اس وجہ سے نہیں کہ انہوں نے فنِ مرثیہ گوئی میں کوئی ترقی کی ہے بلکہ ان کے شعری خصائص ان کی اولاد میں وراثتاً منتقل ہوئے اور میر حسنؔ کے بیٹے میر خلیقؔ نے فن مرثیہ گوئی میں اضافے کئے اور اس کو ترقی دی اور میر خلیقؔ کے بیٹے میر انیسؔ نے تو زمینِ مرثیہ کو آسمان سے بھی زیادہ بلند کر دیا۔

میر خلیقؔ کا کلام مفقود ہے لیکن ظاہر ہے وہ میر حسنؔ کے بیٹے تھے ورثہ میں نہ صرف جوہر شاعری ملا تھا بلکہ سوز و گداز بھی باپ سے پایا تھا، جو کلام اُن کے نام سے منسوب ہے نقّادوں کو اس میں تامل ہے، اس کے باوجود میر خلیقؔ کا نام مرثیہ گوئی کے فن میں نہایت معتبر اور مقتدر نام ہے۔ میر خلیقؔ کے ہمعصر میر ضمیرؔ کو یہ فخر اولیّت حاصل ہے کہ انہوں نے اپنے علم، فطری صلاحیت اور جودتِ طبع سے مرثیہ کو ایک مستقل فن بنا دیا، ان سے پہلے نہ مرثیہ کی بحریں مخصوص، نہ نظم کی کوئی خاص قسم، نہ مرثیے کے اجزا مقرر تھے، نہ مضامین میں کوئی وسعت تھی، صرف اہل بیت کی یاد اور ان کے مصائب کا ذکر مجلس میں ہوتا تھا اور مرثیے پچیس تیس بندوں سے زیادہ نہیں ہوتے تھے، مرثیہ میں چہرہ اور سراپا میر ضمیرؔ ہی کی ایجاد ہے، مرثیہ کو رزمیہ نظم کی صورت بھی انہوں نے ہی دی، جنگ کے سامان کا تعین، تلوار اور گھوڑے وغیرہ کے شاعرانہ اوصاف کا بیان بھی میر ضمیرؔ ہی کی فکرِ بلیغ کا نتیجہ ہے، میر خلیقؔ نے میر ضمیرؔ کے ساتھ مرثیہ گوئی کے فن کو ترقی دی بلکہ اپنی افتادِ طبع سے میر خلیقؔ کے مرثیوں میں سوز و گداز زیادہ ہے اور یہی فرق ان کے شاگردوں یعنی میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ میں ہے۔

انیسؔ اور دبیرؔ نے مرثیہ کو بامِ عروج پر پہنچا دیا اور کوئی مضمون ایسا نہیں ہے جس کو انہوں نے درجۂ کمال پر پہنچا کر نظم نہ کیا ہو، اخلاقی مضامین نظم کئے تو اس طرح کو مرثیہ کو اخلاقی شاعری کا اعلیٰ

نمونہ بنا دیا۔ چنانچہ اعلانِ حق، پاسِ صداقت، ایفائے عہد، خود داری، صبر و رضا، ہمت و استقلال، ایثار، دشمن سے حسن سلوک، عفو و درگزر، صلح پسندی، چھوٹوں پر شفقت، بزرگوں کا ادب، انسانی ہمدردی وغیرہ یہ تمام محاسن ان حضرات کے کلام میں نہایت وضاحت سے پائے جاتے ہیں۔ نیچرل شاعری کا سراغ ان مرثیوں میں لگائیے تو نہایت اعلیٰ پیمانے کی شاعری ملے گی۔ مناظرِ فطرت کی عکاسی میں ان مرثیوں میں ایسے نمونے ملیں گے کہ عقل دنگ رہ جائے پھر لطف یہ کہ مرثیہ کے مزاج کو مجروح نہیں ہونے دیا، ان حضرات کے بعد مونسؔ، اُنسؔ، سلیسؔ اور وحیدؔ تک مرثیہ کے اجزائے ترکیبی وہی رہے جو ان بزرگوں نے قائم کئے تھے، پیارے صاحب رشیدؔ نے مرثیہ میں بہار اور ساقی نامہ کو داخل کیا اور اس طرح مرثیہ کو ایک نئے مضمون سے آشنا کیا، مگر اس طرح مرثیہ میں سوز و گداز کا عنصر کم ہو گیا اور مرثیہ داد و تحسین کا ایک ذریعہ بن کر رہ گیا۔

پیارے صاحب رشیدؔ کے بعد جو لوگ مرثیہ گوئی میں نمایاں ہوئے ان میں افسر الشعراء آغا شاعر قزلباش دہلوی، نسیمؔ امروہوی، نجم آفندی، سید آل رضا اور جوشؔ ملیح آبادی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان حضرات نے مرثیے کے اجزاء تو وہی رکھے لیکن روحِ کربلا اور شہادتِ عظمیٰ کو ایک تحریک کی صورت دی اور یہ طریقہ کامیاب بھی رہا۔ کیونکہ اگلے مرثیہ گوؤں نے ہر مضمون ایسے اسلوب اور ندرتوں کے ساتھ نظم کیا ہے کہ اس پر ترقی یا اضافہ کی سر مو گنجائش نہیں چھوڑی اور اگر یہ صورت اختیار نہ کی جاتی تو اندیشہ تھا کہ مرثیہ کی صنف ہی ختم ہو جاتی، مرثیہ کو اسی صورت میں زندہ رکھا جا سکتا تھا کہ اس کو شہادت کے اعلیٰ مقاصد کے اظہار کا ذریعہ بنا دیا جائے اور دورِ حاضر کے تقاضوں کے ساتھ اُسے مربوط اور منظم کر دیا جائے اور اس طرح اس کی ایک نئی جہت مقرر کی جائے۔

ان بزرگوں کے بعد جو نام سامنے آتے ہیں اُن میں صبا اکبر آبادی، ڈاکٹر یاور عباس، سردار نقوی اُمید فاضلی، ڈاکٹر ہلال نقوی اور اثر جلیلی قابلِ ذکر ہیں۔

اثر جلیلی فارسی اور اُردو شعر و ادب پر بڑی اچھی نگاہ رکھتے تھے، انہوں نے اپنی شاعری کا آغاز روایتی غزل گوئی سے کیا اور اپنے ایک عزیز معین الدین اجمیری سے کسبِ فیض کیا۔ میری ان کی ملاقات اجمیر کے ایک مشاعرہ میں ہوئی اور پھر یہ ملاقات ان کے دلی کے قیام کے زمانہ میں گہری دوستی میں بدل گئی، انہوں نے اپنی زندگی کا زیادہ عرصہ دلی میں گذارا اور وہاں کی ادبی فضا سے بھی فیض حاصل کیا تقسیم ملک

کے بعد وہ کراچی آگئے اور یہاں کی ادبی محفلوں کی رونق بنے، میں نے ان کی قادرالکلامی کے پیشِ نظر انہیں مشورہ دیا کہ وہ مرثیہ کہیں کیونکہ مرثیہ جذبات نگاری کے علاوہ بیانیہ اندازِ نگارش کا بھی مطالبہ کرتا ہے اور اس کے لئے شاعر کا قادرالکلام ہونا نہایت ضروری ہے۔ چنانچہ میری ترغیب پر انہوں نے مرثیے کہنے شروع کئے اور اس طرح اردو کی رزمیہ شاعری میں ایک اور خوشگوار اضافہ ہوا۔

اثر جلیلی رقیق القلب تھے اور سوز و گداز کی دولت سے مالا مال تھے انہیں یہ سوز، زندگی کے نامساعد تجربات اور حالات نے فراہم کیا تھا چنانچہ یہی سوز ان کی شاعری کا سرمایہ ہے اور اس کی چھوٹ ان کی غزل پر بھی پڑتی ہے اور ان کی مرثیہ نگاری پر بھی۔

سانحۂ کربلا کے واقعات اور قدسی نفوس افراد سے کون واقف نہیں اور خاص کر مرثیہ نگار حضرات تو اس سانحہ کی تمام جزئیات سے بخوبی واقف ہوتے ہیں اور یہی جزئیات نگاری مرثیہ میں تاثیر کا مواد فراہم کرتی ہے۔ اثر جلیلی نے بھی اسی جزئیات نگاری سے اپنے مرثیوں میں تاثیر اور تاثر کی ایسی فضا قائم کی ہے جو قاری اور سامع دونوں کو اپنی گرفت سے آخر تک آزاد نہیں ہونے دیتی اور یہی ان کے مرثیوں کا طرۂ امتیاز ہے۔

مرثیہ نگاری کی جو روایت انیس اور دبیر سے چلی تھی اس کی پابندی آج تک نہ صرف قائم ہے بلکہ ضروری بھی ہے۔ یعنی مرثیہ کی مخصوص بحریں، اس کے اجزائے ترکیبی یعنی چہرہ (تمہید) سراپا، رزم، بزم، گھوڑے تلوار اور مصائب کا بیان۔ ان اجزا کو انیس اور دبیر نے اپنے اپنے انداز میں برتا ہے اور ان کے شاگردوں یا ان کی پیروی کرنے والوں نے بھی انہی دونوں کے اسلوبِ نگارش کو ملحوظ رکھا ہے، اثر جلیلی دبیر کے مکتبۂ فکر سے تعلق رکھتے ہیں وہی لفظی شکوہ، وہی دقیق مضامین، وہی منفرد اسلوب اظہار اور وہی تشبیہہ اور استعارے کا ابداع۔ اس سلسلے میں ان کا وہ مرثیہ جس کا چہرہ انہوں نے کوئٹہ کی برفیلی فضا سے سجایا ہے خاص طور پر قابلِ ذکر ہے اور غالباً اس اعتبار سے منفرد بھی ہے کہ انہوں نے اس برفیلی فضا میں جذبوں کی حرارت کا جس طرح دروبست کیا ہے وہ یقیناً قابلِ داد ہے۔ میں نے مثالوں سے دانستہ گریز کیا ہے تاکہ قاری خود میری نگارش سے متاثر ہوئے بغیر کوئی رائے قائم کرسکیں اور مرثیہ نگاری میں اثر جلیلی کا وہ مقام متعین کرسکیں جس کے وہ حقدار ہیں۔

سچّی شاعری

شاعری میں ہجو اور مدح دونوں پیرایۂ اظہار نہایت مشکل ہیں، مادح کے لئے لازمی ہے کہ وہ وہی صفات بیان کرے جو فی نفسہٖ ممدوح میں موجود ہوں اور ان کا اطلاق کسی دوسرے شخص پر نہ ہوتا ہو اور اگر ایسا نہ کیا تو مدح پر مدح بالذم کا اطلاق ہوگا اور یہی ہاجی کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہجو میں وہی بیان کرے جس کا اطلاق کسی اور پر نہ ہو۔ درباری شاعروں نے بادشاہوں کے ایسے قصیدے کہے ہیں جو مبالغہ کی نہایت اعلیٰ مثال ہونے کے علاوہ مدح بالذم کی بھی نہایت عمدہ مثال ہیں مثلاً بہادر شاہ ظفر کے متعلق ذوق اور غالب کے قصیدے نمونے کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں، ذوق کہتے ہیں ۔؎

بعد شاہانِ سلف رکھتا ہے تُو یوں تفضیل — جیسے قرآں پسِ توریت و زبور و انجیل
تو ہے اس طرح سے عزت دہِ اولادِ تمور — جیسے موسیٰ شرف افزائے بنی اسرائیل

وغیرہ وغیرہ

غالب کہتے ہیں ؎

قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ — مظہرِ ذوالجلال والاکرام
شہسوارِ طریقۂ انصاف — نوبہارِ حدیقۂ اسلام

بزم میں میزبانِ قیصر و جم | رزم میں اوستادِ رستم و سام
وارثِ ملک جانتے ہیں تجھے | ایرج و تور و خسرو بہرام

دیکھئے یہ قصیدے ایسے بادشاہ کی شان میں ہیں جو سیاسی اور جسمانی دونوں اعتبار سے نہایت کمزور اور جس کا گذارہ انگریزوں کے وظیفہ پر تھا اور جس کا حکم صرف قلعہ تک محدود تھا۔

حجاج بن یوسف نہایت جابر حکمراں تھا لوگ اس کے ظلم سے پناہ مانگتے تھے، ایک عرب شاعرہ اُمِ کلثوم نے اس کا قصیدہ کہا اور اس کو دربار میں سنا کر حجاج بن یوسف سے انعام واکرام بھی پایا لیکن اس قصیدہ میں اُس نے یہ صنعت رکھی تھی کہ اس کا ہر شعر تعریف بھی تھا اور ہجو بھی، اُمِ کلثوم کے قادرالکلام ہونے کے ساتھ ساتھ یہ کمال عربی زباں کی وسعت کا بھی ہے

اردو شاعری میں یہ کمال حاصل نہیں کیا جا سکتا، لہٰذا شعراء کو بڑی احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہے اور پھر جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل بیت رسولؐ کا ذکر یا مدح مقصود ہو تو اور بھی زیادہ احتیاط لازمی ہے۔

اردو شاعری میں نعت ومنقبت کا سرمایہ خاصا وافر ہے مگر اس سرمایہ میں ایک بڑا حصہ افراط و تفریط سے پُر ہے اور شعراء نے نہ صرف افراط و تفریط سے کام لیا ہے بلکہ ان نفُوس قدسی سے ایسی باتیں منسوب کی ہیں جو نعوذ باللہ شرک کے دائرہ میں آتی ہیں۔

نعت ہو منقبت ہو یا مرثیہ شعراء کو ان اصناف میں بڑی احتیاط سے کام لینا چاہیئے، حالی سے قبل اردو نعت گوئی میں عام طور پر شمائل رسولؐ کی خوبیوں کے بیان پر زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ اور اسوۂ حسنہ یا تعلیمات رسول پر زیادہ توجہ نہیں تھی۔ حالی کے بعد اب نعتِ رسولؐ کا موضوع زیادہ تر حضورؐ کی تعلیمات اور اسوۂ حسنہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ اب نعت گوئی میں تاثیر اور تاثر کی فضا زیادہ نمایاں ہے اور شعراء نے اس صنف کو نہایت فخر و مباہات کے ساتھ قبول کیا ہے اور شاید ہی اردو کا کوئی شاعر ایسا ہو جس نے نعت یا اہلِ بیت اطہار کی مدح میں شعر نہ کہے ہوں بلکہ ان دس بیس برسوں میں نعت و منقبت کے لاتعداد مجموعے منظر عام پر آئے ہیں اور بعض شعراء کی پہچان ہی نعت و منقبت ہے اور ان کو دوسری اصناف سے سروکار نہیں۔

فارسی شعراء نے یقیناً اُسوۂ رسولؐ کو بھی شمائل رسولؐ کے ساتھ ساتھ اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے

اور آپؐ کے کمالات کی ستائش کی ہے، سعدیؒ کا یہ قطعہ تو قبول عام کی سند کے لئے نہایت مشہور ہے ؎

بَلَغَ الْعُلٰی بِکَمَالِہٖ　　　کَشَفَ الدُّجیٰ بِجَمَالِہٖ
حَسُنَتْ جَمِیْعُ خِصَالِہٖ　　　صَلُّوْا عَلَیْہِ وَ آلِہٖ

اور اسی طرح شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کا یہ قطعہ بھی زبانِ زدِ عام ہے ؎

یا صاحب الجمال و یا سید البشر　　　من وجہک المنیر لقد نور القمر
لا یمکن الثناء کما کان حقہٗ　　　بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

معلوم ہوا کہ شعری تخلیقات میں صرف موضوع ہی اہم نہیں ہوتا بلکہ موضوع کا برتنا بھی اہمیت رکھتا ہے، اور اسی کو شاعر کا اسلوب کہتے ہیں۔ یہ اسلوب شاعر کی ذاتی، قوت فکر، تخلیقی ندرت اور فنی مہارت سے حاصل ہوتا ہے اور اسلوب ہی کسی تخلیق کو ادنیٰ و اعلیٰ، عارضی اور دائمی یا صحافیانہ اور ادبی مقام پر فائز کرتا ہے لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ موضوعات غیر اہم ہیں، یہ ضرور ہے کہ بعض موضوع اہم بعض غیر اہم اور بعض اہم تر ہوتے ہیں لیکن شاعری میں ان کا انحصار فنی دلکشی اور اسلوبِ اظہار ہی پر ہوتا ہے۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ شاعری میں بعض اہم موضوع غیر اہم اور بعض غیر اہم موضوع اہم بن جاتے ہیں اور یہ صرف اس لئے ہوتا ہے کہ شاعر کی خوش مذاقی، فنی صلاحیت، احساس جمال، روایت کا پاس اور مشاہدے اور تجربہ کا تنوع اور فکر و خیال کی ندرت کم اہم موضوع کو اہم بنا دیتی ہے، مثال کے طور پر لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد یا ایسی ہی بہت سی داستانوں اور واقعات کو شاعروں نے اپنی فنی صلاحیت سے ابدی بنا دیا حالانکہ ایسے واقعات نہ جانے کتنے روز ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

حضورؐ کی ذات اور تعلیمات اور ان نفوس قدسی کی زندگیاں جنہوں نے حق و باطل کے معرکے میں نہایت پاکیزہ کردار ادا کیا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نہ کسی پہلو سے وابستہ رہیں، موضوع اور واقعات کے لحاظ سے نہایت اہم بھی ہیں اور رمز دری بھی ہیں۔ اسی لئے شعراء نے موضوع کی اہمیت کے پیش نظر اس موضوع کو نہایت خوش اسلوبی، فنی مہارت، ندرت خیال اور پاکیزگی کے ساتھ اپنی شاعری میں برتا ہے اور شاعری کے نہایت اعلیٰ نمونے حاصل کئے ہیں۔

آئیے اب ان خیالات کی روشنی میں نعیم میرٹھی کے نعتیہ اور منقبتی کلام کا جائزہ لیں۔

نعیم میرٹھی رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم سے اپنی محبت کا اظہار بڑے والہانہ انداز میں کرتے ہیں لیکن یہ والہانہ انداز ادب کے دائرہ سے تجاوز نہیں کرتا اور تمام کمال احترامات کے ساتھ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے اسوۂ حسنہ اور تعلیمات کے دائرہ میں رہ کر ہی نعت کے حسین اور خوبصورت شعر تخلیق کرتا ہے۔ نعیم میرٹھی کا بیان نہایت سادہ ہے اور اندازِ بیاں کی اسی سادگی نے تاثیر اور تاثر کی بھرپور فضا پیدا کی ہے جو ذہن و دل کو دیر تک سرشار رکھتی ہے، ان کی تشبیہیں اور استعارے بعید از قیاس نہیں ہیں اور آدمی کی فہم و ذکاوت کا امتحان نہیں لیتے۔ وہ رسولِ مقبولؐ کی صفات کو یا رسولِ مقبولؐ کی ذات سے اپنی محبت کی وابستگی کو نہایت سہل انداز میں بیان کرتے ہیں، ویسے بھی محبت کی زبان سادہ ہی ہوتی ہے اور صرف محبت کرنے والے دل ہی اس کے مفاہیم سے واقف ہوتے ہیں ؎

دُعائیں زندگی کی دینے والے یہ دُعا بھی دے — شعورِ ذاتِ پیغمبرؐ بھی مل جائے مقدر سے
نعیمِ خستہ جاں جس نے کھلائے پھول صحرا میں — وہی ابرِ کرم آ کر کبھی گھر پہ مرے برسے

بھٹک سکتے نہیں وہ اک قدم بھی منزلِ حق سے — جو رہرو اس سفر میں راہِ پیغمبرؐ سے چلتے ہیں

عملِ نبیؐ کا ہمیشہ تری نظر میں رہے — کہ امتیاز تو کچھ تجھ کو خیر و شر میں رہے

جو چاہتا ہے کہ منزل پہ سُرخرو پہنچے — تو نقشِ پائے محمدؐ تری نظر میں رہے
بس ایک بار محمدؐ کہا تھا اس کے بعد — تمام عمر اُجالے ہمارے گھر میں رہے

ہر نفس ذکرِ خیر البشرؐ چاہیئے — لمحہ لمحہ مجھے معتبر چاہیئے
راہِ طیبہ میں یادِ نبیؐ ساتھ ہو — اس سفر کے لئے ہمسفر چاہیئے
خُلد نظارہ ہے جلوہ گاہِ نبیؐ — ہر قدم احتیاطِ نظر چاہیئے

نبیؐ کا نام جب میں نے لیا ہے　　　اُجالوں سے مرا گھر بھر گیا ہے

ان اشعار میں احترامات رسولؐ کے ساتھ ساتھ اپنی محبت کا اظہار نہایت والہانہ انداز میں کیا گیا ہے، ہر نفس میں ذکرِ خیر البشرؐ کی تمنا ہی زندگی کو اعتبار بخشتی ہے اور یہی اعتبار نعیم میرٹھی کا مقصود و منشاء ہے اور زندگی کی مسافت میں یادِ نبیؐ کی ہمسفری بھی منزلِ حق کی رسائی کی ضمانت ہے اور اس سفر میں احتیاطِ نظر بھی نہایت ضروری ہے کیونکہ طیبہ کا چپّہ چپّہ انوار رسولِ مقبول سے جنّت نگاہ ہے۔ یہاں جنیدؒ و بایزیدؒ بھی گم کردہ نفس آتے ہیں۔ یہ اشعار خانہ پُری کے لئے نہیں کئے گئے ہیں بلکہ رسولؐ کی محبت کے حوالے سے زندگی گذارنے کا ایک واضح تصور دیتے ہیں نہ صرف نعیم میرٹھی کو قاری اور سامع کو بھی۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم سے محبت ہی نے ان نفوسِ قدسی سے بھی محبت کے رشتے استوار کرائے ہیں جو نبیؐ کی ذات سے وابستگی کی بناء پر خود بھی مقدس و محترم ہیں اور اپنے اتقاء اور دینِ حق کی سربلندی کے لئے اپنی قربانیوں سے ہماری عقیدت و احترام کا محور و مرکز ہیں۔ نواسۂ رسولؐ حضرت امام حسینؓ اور ان کے رفقاء نے دینِ حق کی سربلندی کے لئے اپنی جانوں کے جو نذرانے پیش کئے وہ یقیناً تاریخ اسلام کا روشن باب ہیں اور ہماری رہبری اور رہنمائی کے لئے منارۂ نور ہیں ان کی مدح و ستائش اور ان کے کارناموں کو بار بار دہرانا ہمارا دینی فریضہ ہونا چاہیئے۔ نعیم میرٹھی نے ان نفوسِ قدسی کو جو نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے وہ بھی ان کی شاعری کا درخشاں پہلو ہے ؎

جو سر پہ ہمیشہ رہی خاتونِ جناں کے　　　تطہیر کی آیتہ اسی چادر کے لئے ہے

باپ ختم المرسلینؐ، شوہر ولیؓ، بیٹے امامؑ　　　اہلِ دنیا دیدنی ہے اقتدارِ فاطمہؓ

ہے تربیت کا نمونہ حسینؓ جیسا پسر　　　ادائے حق میں بہت کامیاب ہیں زہراؓ

اصولِ سرفروشی مسلکِ آلِ ابو طالب　　　کوئی دنیا میں ان جیسا وفا پرور نہیں ملتا

روان ہو جس کی رگوں میں دلائے آلِ رسولؐ بڑھائے ہاتھ وہی ہم سے دوستی کے لئے

ہو جس کی گھٹی میں سرکارؐ کا لعابِ دہن اُسی کو زیب ہے کہلائے ترجمانِ رسولؐ

جس کو خوشنودی نبیؐ کی اور علیؑ کی ہو عزیز وہ مدینہ اور نجف سے پہلے جائے کربلا

اِن اشعار میں صرف اور صرف وہی اوصاف بیان کئے گئے ہیں جو فی نفسہٖ ممدوحین میں موجود ہیں، کسی مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیا گیا ہے، پھر شاعری کے تمام تقاضے بھی ملحوظ رکھے ہیں، تاثیر اور سرشاری کی فضا بھی قائم ہے۔ بغرض ہر لحاظ سے یہ اندازِ مدح سرائی قابلِ ستائش ہے اور یہی سچی شاعری ہے نعیم میرٹھی قابلِ مبارکباد ہیں کہ انہوں نے اپنی نعتیہ اور منقبتی شاعری کو دوسروں کے لئے قابلِ تقلید بنا دیا ہے، الہم زد فرد!!

محمد ذاکر علی خاں کا رختِ سفر

عربی لغت میں نعت کے معنی ہیں اچھی اور قابلِ ستائش صفات کا کسی شخص میں پایا جانا، جیسا کہ عربی کے اس فقرہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ "نعت الرَّجُلُ" یعنی اس شخص میں بہترین خصلتیں پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح فارسی میں بھی یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے جیسا کہ اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے۔

جاوید ہمیں باشں بہ ایں نعت بہ ایں وصف
پاکیزہ بہ اخلاق و پسندیدہ بہ افعال

اب فارسی اور اردو میں نعت کی اصطلاح صرف اور صرف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدح اور توصیف کے لئے مخصوص ہے۔ نعت کی اصطلاح کسی ہیئت سے مخصوص و منسوب نہیں ہے بلکہ اس سے مراد صرف موضوع ہے، نعت تو قصیدہ، مثنوی، رباعی، قطعہ، مسدس غرض ہر ہیئت میں یہاں تک کہ نثر میں بھی کہی جا سکتی ہے

مسلمان اپنے عقائد لے کر دُنیا میں پھیل گئے اور اپنے عقائد کے ساتھ ساتھ جہاں جہاں بھی گئے وہاں کے مقامی اثرات مثلاً ان کے معاشرتی اور تہذیبی اثرات کو انہوں نے بھی قبول کیا لیکن جس چیز نے ان کو ممتاز و ممیز رکھا۔ وہ عقیدۂ توحید و رسالت تھا اور یہ وہ عقیدہ تھا جس کے اعلان اور اظہار کے بغیر وہ مسلمان

ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتے تھے ۔ دوسرے مذاہب میں بھی جزوی طور پہ ہی سہی توحید کا عقیدہ موجود تھا مگر رسالت کے تصوّر سے وہ نا آشنا تھے، اور اس طرح کا کوئی عقیدہ ان کے اعتقادات کا جزو نہیں تھا۔ مسلمانوں کے نزدیک توحید کے ساتھ ساتھ عقیدۂ رسالت پہ صرف ایمان لانا ہی ضروری نہیں تھا بلکہ رسولؐ کی ذات وصفات سے والہانہ محبت بھی جزوِ ایماں اور لازمۂ زندگی تھی کیونکہ رسالت پہ ایمان لائے بغیر اور رسولؐ سے محبت کئے بغیر عقیدۂ توحید کمزور اور بے معنی ہو جاتا ہے اور اسی محبت کے اظہار اور اسی عقیدہ کے بیان کا نام شاعری کی اصطلاح میں نعت ہے۔

نعت کا موضوع بظاہر نہایت مختصر نظر آتا ہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہ موضوع نہایت وسیع اور مشکل موضوع ہے، وسیع اس لحاظ سے کہ اس میں رسول اللہؐ کی ذات وصفات کے حوالے سے سارے تمام تہذیبی، ثقافتی، معاشی، معاشرتی اور سیاسی پہلو آجاتے ہیں اور مشکل اس لحاظ سے ہے کہ عقیدۂ توحید کی حدود میں رہ کر رسولؐ کی ذات وصفات کا احاطہ کرنا اور احترامات رسولؐ کو انسانی رشتوں کے حوالوں سے ملحوظ رکھنا دریا کو کوزہ میں بند کرنے کے مترادف ہے۔

عربی میں نعت کے اشعار بعثت کے آغاز ہی سے ملتے ہیں، حضرت ابو طالبؓ کے نعتیہ اشعار غالباً عربی کی پہلی نعت ہیں۔ بعض نعتیہ اشعار حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے بھی منسوب ہیں اس کے علاوہ بے شمار نعتیہ اشعار صحابہؓ نے کہے ہیں۔ ان میں حضرت حسّان بن ثابت، حضرت عبداللہ بن رواحہؓ، اسید بن سلمۃ السلمیؓ، حضرت مالک بن الخطؓ، حضرت مازنؓ، حضرت کعب بن زہیرؓ، اور حضرت کعب بن مالکؓ وغیرہ خاص طور پہ قابلِ ذکر ہیں۔ عہد صحابہؓ اور اس کے بعد اشاعت اسلام کے ساتھ ساتھ عربی زبان بھی پھیلتی گئی اور عرب کے علاوہ بھی دُنیا کے دوسرے حصّوں میں عربی میں نعتیہ اشعار بے شمار کہے گئے ان میں اور شعراء کے علاوہ بوصیری کا قصیدۂ بُردہ نہایت مشہور ہے حالانکہ یہ قصیدہ پہلا قصیدہ بُردہ نہیں ہے۔ پہلا قصیدۂ بُردہ حضرت کعب بن زہیرؓ کا ہے۔

فارسی میں شعر و شاعری کی ابتدا نعت رسولِ مقبولؐ سے نہیں بلکہ "مدیح کے وجم" سے ہوئی، فارسی میں سب سے پہلا قصیدہ مامون الرشید کی مدح میں عباس روزی نے کہا چنانچہ خود وہ دعویٰ کرتا ہے ؎

کس بر ایں منوال پیش از من چنیں شعرے نہ گفت
مرزبانِ فارسی راہست تا ایں نوع ، بیں
یک زاں گفتم من ایں مدحت ترا تا ایں گفت
گیر داز مدح و ثنائے حضرتِ تو ، زیب و زین

اس کے بعد فارسی کے بے شمار شاعروں نے قصیدہ گوئی میں نام پیدا کیا مگر ان کے کلام میں نعت گوئی کے نمونے نہیں ملتے ۔

فارسی میں نعت گوئی کی ابتداء بہت بعد کو ہوئی اور پھر تو ایسی نعتیہ شاعری ہوئی کہ ادب کا دامن نعت کے اشعار سے بھر گیا۔ ان شعراء میں ابوالفرج رونی، اوحدالدین انوری، سعدی شیرازی، مولانا روم، عبدالرحمن جامی، عرفی شیرازی اور قاآنی غیر معمولی شہرت رکھتے ہیں۔ اُردو کے نعت گو شعرا میں غلام امام شہید، کرامت علی خاں شہیدی، امیر مینائی، محسن کاکوری، شاہ نیاز بریلوی، احمد رضا خاں، حسن رضا خاں، حالی، ظفر علی خاں، بیدم وارثی، اکبر وارثی، علامہ اقبال، دیورام کوثری، حفیظ جالندھری، سہیل عظیم آبادی، مولانا ضیاء القادری، ماہر القادری، عبدالعزیز خالد، حافظ لدھیانوی، اعظم چشتی، عبدالکریم ثمر اور حفیظ تائب قابلِ ذکر ہیں، یوں تو کسی زبان کا شائد ہی کوئی مسلمان شاعر ہوگا جس نے نعت نہ کہی ہو۔

فارسی اور اُردو کے نعت گوئی کے ابتدائی دَور کے شعرا نے صرف رسول مقبولؐ کے حلیہ، واقعہ معراج اور معجزات ہی سے اپنی نعتوں کا مواد حاصل کیا مگر افکار و خیالات کی ترقی کے ساتھ ساتھ نعت کے مضامین اور موضوعات میں بھی تبدیلی آتی گئی اور اب اخلاقِ نبویؐ اور صفاتِ نبویؐ کا بیان بھی ہونے لگا، اور اس بیان میں رسول اللہ کے روزمرہ کے معمولات یعنی آپؐ کے حُسنِ عمل، حُسنِ خلق، حُسنِ معاملت، عدل و انصاف، شفقت و رافت غرض حضورؐ کی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو نعت کا موضوع نہ بنا ہو۔ دنیا کا کوئی انسان ایسا نہیں جس کی تمام صفات کا احاطہ اس طرح ادب میں کیا گیا ہو اور جس کے تمام معمولاتِ زندگی کو محفوظ کر لیا گیا ہو۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ نعت گوئی نہایت مشکل صنفِ سخن ہے، اس سلسلے میں بعض شاعروں نے افراط و تفریط سے کام لیا ہے۔
رسول اللہؐ کو نعوذ باللہ یا تو کلمی چوٹی والا معشوق بنا ڈالا یا ان کی توصیف و ثنا کے ڈانڈے شرک سے ملا دیئے اور عقیدت مندوں نے بعض عاشقانہ بلکہ بقول مولانا حسرتؔ موہانی "فاسقانہ" غزلوں کو نعت کے خانے میں ڈال دیا مثلاً خسروؔ کی یہ غزل ؎

نمی دانم چہ منزل بُود شب جائیکہ من بُودم

جس میں اس طرح کے اشعار ہیں ؎

پری پیکر نگارے، سرو قدّے، لالہ رخسارے — سراپا آفتِ دل بود، شب جائیکہ من بُودم
رقیباں گوش برآواز، اُو در ناز، من ترساں — سخن گفتن چہ مشکل بُود شب جائیکہ من بُودم

صرف مقطع میں نعت کا اشارہ ہے ؎

خدا خود میرِ مجلس بود اندر لامکاں خسروؔ — محمدؐ شمعِ محفل بود، شب جائیکہ من بودم

خسروؔ کی یہ غزل ان کے کسی مروّجہ دیوان میں نہیں ہے، اسی طرح بعض الحاقی نعتیں مشہور شعراء کے نام سے منسوب ہیں، مثلاً جامیؔ کے نام سے یہ نعت نہایت مشہور ہے ؎

نسیما جانبِ بطحا گذر کن

ان کے کلیات مطبوعہ ایران میں یہ نعت نہیں ہے۔
جامیؔ کی ایک نعت کا مطلع ہے ؎

روحی فداک یا صنمِ ابطحی لقب — آشوبِ ترک، شورِ عجم، فتنۂ عرب

ہر چند کہ فارسی میں "صنم" کا لفظ محبوب کے معنی میں مستعمل ہے لیکن رسولؐ کے لئے اس کا استعمال ہر لحاظ سے محلِ نظر ہے، پھر "آشوبِ ترک، شورِ عجم، فتنۂ عرب" کہنا کہاں تک درست ہے، عربی میں فتنہ کے معنی کچھ بھی کیوں نہ ہوں لیکن فارسی اور اردو میں مروّجہ معنی ہی مراد ہوں گے، اسی طرح ایک اردو شاعر کا یہ کہنا ؎

اللہ کی جھولی میں وحدت کے سوا کیا ہے
جو کچھ مجھے لینا ہے لے لوں گا محمدؐ سے

صرف یہی کہا جا سکتا ہے ع خطا بر بزرگان گرفتن خطا است، اردو شاعری سے ایسی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

مولانا رومؒ نے اپنی مثنوی میں حضرت موسیٰؑ اور ایک چرواہے کا قصہ بیان کیا کہ چرواہا اللہ تعالیٰ کو اپنی محبوبہ تصور کر کے اُس سے عجیب عجیب باتیں کیا کرتا تھا، حضرت موسیٰؑ نے اس کی ان باتوں پر اس کی ملامت کی مگر اللہ تعالیٰ کو حضرت موسیٰؑ کی یہ بات پسند نہ آئی اُسے تو اُسی چرواہے کی باتیں پسند تھیں، چنانچہ حضرت موسیٰؑ کو تنبیہہ ہوئی ؎

تو برائے وصل کردن آمدی　　　　نے برائے فصل کردن آمدی

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ محبت کی زبان عجیب ہوتی ہے، نہ الفاظ کا دروبست ٹھیک ہوتا ہے نہ تخاطب کے آداب درست ہوتے ہیں، نہ موقع محل کا لحاظ ہوتا ہے، نہ لہجہ صحیح ہوتا ہے۔ غرض دل سے نکلی ہوئی باتیں جذبے اور احساس کی شدت میں صرف شدت چاہتی ہیں۔ اور اس اظہار میں زبان دانی کے تمام کلیے اور قاعدے مفلوج ہو کر رہ جاتے ہیں۔ لیکن مخاطب جس سے ہمکلام ہے وہ اس کی زبان خوب سمجھتا ہے اور اس کے جذبات و احساسات سے پوری طرح آشنا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ مخاطب کا مقصود و منشا کیا ہے، سوز و گداز کے کن کن مرحلوں سے روح گذر رہی ہے، ذہن کو فکر و خیال کی کن منزلوں کا سامنا ہے۔ ہجر کی درد سامانی نے آتشِ شوق کو کس حد تک تیز کیا ہے، وصال کی کن کیفیات نے روحانی لذت حاصل کی ہے، غرض محبت کے تمام قرینوں کے اظہار کا طریقہ کچھ بھی ہو نہایت سادہ اور پُر کار ہوتا ہے۔

یہ تو عام محبت کا ذکر تھا لیکن جب یہ محبت اور اس کا اظہار دنیا کی عظیم ترین ہستی سے ہو تو اس کے قرینے بھی بدل جاتے ہیں، ہستی بھی وہ جو سردارِ الانبیاءؐ ہے، جو محبوبِ خدا ہے، جو رؤف و رحیم ہے، جو سراج المنیر ہے، جو شاہد و مبشر ہے، جو مزمل ہے، جو مدثر ہے، جو یٰسین و طٰہٰ ہے، جو دعائے خلیل و نویدِ مسیحا ہے، جو رحمت للعالمین ہے، جو شفیع المذنبین ہے، جو یتیموں اور بیواؤں

کاملجیٰ و ماویٰ ہے، جو مزّکی و معلم ہے، جو بشیر و نذیر ہے، جو مجتبیٰ اور مصطفٰے ہے، جو صادق و امین ہے، جو عبدِ کامل ہے، جو صاحبِ کوثر ہے، جس کا اسمِ گرامی احمد اور محمد ہے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ رسول اکرمؐ سے محبت جزوِ ایمان ہے مگر اس محبت کے اظہار میں " با محمدؐ ہوشیار" کا لحاظ رکھنا بھی نہایت ضروری ہے۔ زبان کیسی ہی کج مج ہو، اظہارِ خیال کے پیمانے کتنے ہی کمزور سہی، الفاظ کا دروبست کیسا ہی کم مایہ سہی، مگر احتراماتِ رسولؐ ہمیشہ پیشِ نظر رہنے چاہیں۔

جناب ذاکر علی خاں بھی رسولِ مقبولؐ کے شیدائیوں میں سے ہیں، انہیں رسول اللہؐ سے والہانہ محبت ہے اس کا اظہار ان کی زندگی کے اکثر معمولات سے ہوتا ہے۔ رسولؐ کے تذکار کی کوئی محفل ہو نعت کی کوئی بزم ہو، یا دورانِ گفتگو میں رسول اللہ کا ذکر آجائے تو ان کی روح ایک جھرجھری لیتی ہے۔ چہرہ فرطِ جذبات سے سُرخ ہو جاتا ہے اور آنکھیں جوشِ عقیدت سے ایک چمک کے ساتھ شبنمی ہو جاتی ہیں۔ ان کی یہ کیفیات کم از کم میرے لئے قابلِ رشک ہیں، اسی محبت اور عقیدت نے جو رسولِ اکرمؐ سے ان کو ہے نعتیہ شعری مجموعہ " رختِ سفر" کی صورت اختیار کرلی ہے، وہ باقاعدہ شاعر نہیں ہیں اور اللہ کا شکر ہے کہ اس کا ان کو دعویٰ بھی نہیں۔ مگر وہ جذبات اور محسوسات کے اظہار میں سچّے شاعر ہیں، اپنے ان عقیدت مندانہ محسوسات کو جس سچائی، سادگی اور متانت سے وہ بیان کرتے ہیں اس میں تاثیر اور تاثر کا عنصر غالب ہے اور گداز دل اور روح کے سوز کا یہ ابلاغ جو دوسروں کے لئے بھی نفس کی پاکیزگی اور خیالات کی طہارت کا سامان فراہم کرتا ہے انہیں یقیناً شاعر کے منصب پر فائز کرتا ہے۔ شاعری کیا ہے از دل خیزد بر دل ریزد۔

آیئے ان کے کچھ اشعار پڑھیں ؎

چشمِ کرم سے جس کی ترا سنگ در ملا
دیتا رہوں گا اس کو دعائیں میں صبح و شام

ذاکر ہو ذکرِ خیر بہر وقت اس طرح
صلِّ علیٰ کا ورد ہو، ربِ العُلیٰ کا نام

ترے پیغام کو پہنچایا اس نے
بڑا صادق، بڑا سچّا امیں ہے

ترا یہ گھر کیا ہے جس نے آباد
ہے اس پہ آفریں، صد آفریں ہے

یہ اشعار حمد کے اشعار تھے ان میں بھی ذاکر علی خاں نے نعتِ رسولِ مقبولؐ کے پہلو اُجاگر رکھے

ہیں۔ نعت میں ان کی محبت کا انداز نہایت والہانہ ہے، ملاحظہ کیجئے ؎

خوشی فراق، یہ بیچارگی کا عالم ہے
عجیب آس سے تکتا ہوں جانے والوں کو

جائیں تو یوں جائیں مدینے!
جا کر ہم رہ جائیں مدینے

دل کا ابھی سے حال نہ پوچھو
پہلے ہم ہو آئیں مدینے!!

دل ہے معمور خوشی سے ہیں تھمتے آنسو
پھر درِ صاحب لولاک لما یاد آیا

میں اکیلا ہی چلا سوئے مدینہ ذاکر
رہنماؤں کا مجھے راہنما یاد آیا

دل کا پیغام ملا ہے یہ کئی بار مجھے
پھر بلاتے ہیں مدینے مرے سرکار مجھے

تھی سلامِ شوق کی آرزو وہاں لے گئی جو کشاں کشاں
مجھے یاد سب ہیں عنایتیں، مری لغزشوں پہ بھی دھیان ہے

بڑھا ہے اور ہی کچھ اضطراب کا عالم
سنہری جالیاں روضہ کی جب سے تھام آیا

سب تمناؤں کے ارمانوں کے نذرانے لئے
اک بھکاری بھی چلا بننے کو مہمانِ رسولؐ

جہاں میں تیرے کرم کی سبیل جاری ہے
ستم زدوں کے غریبوں کے غمگسار سلام

گلی میں دل کی بجھانے سلام لایا ہوں
اور اس سلام میں کتنے پیام لایا ہوں

وہ داستاں جسے اوروں سے کہہ نہیں سکتا
تمہیں سنانے کو خیرالانام لایا ہوں

منہ چوم لیا میرا فرشتوں نے یہ سن کر
مالک مرا اللہ ہے ایمان محمدؐ

ان اشعار میں سچے اور سیدھے سادے دلی جذبات کا اظہار نہایت معصومانہ انداز میں کیا گیا ہے، نہ تشبیہ و استعارہ کی مرصع کاری ہے نہ فصاحت و بلاغت کی پردہ داری، محبت اور عقیدت کے پاکیزہ جذبوں نے شعر کا پیرایہ اختیار کر لیا ہے اور بس، بارگاہِ رسالتؐ میں یہ جذبات یقیناً مقبول ہیں ورنہ ذاکر علی خاں کو روح کا یہ سوز اور یہ دلِ دردمند میسّر نہ آتا۔

تبرکِ فانی

دنیا میری بلا جانے مہنگی ہے یا سستی ہے ۔ موت ملے تو مفت نہ لوں ہستی کی کیا ہستی ہے

آبادی بھی دیکھی ہے، ویرانے بھی دیکھے ہیں
جو اُجڑے اور پھر نہ بسے، دل وہ نرالی بستی ہے

خود جو نہ ہونے کا ہو عدم کیا اسے ہونا کہتے ہیں
نیست نہ ہو تو ہست نہیں یہ ہستی کیا ہستی ہے

عجزِ گناہ کے دم تک ہیں عصمتِ کامل کے جلوے
پستی ہے تو بلندی ہے رازِ بلندی پستی ہے

جان سی شے بک جاتی ہے ایک نظر کے بدلے میں
آگے مرضی گاہک کی اِن داموں تو سستی ہے

وحشتِ دل سے پھرنا ہے اپنے خدا سے پھر جانا
دیوانے یہ ہوش نہیں ہے یہ تو ہوش پرستی ہے

جگ سونا ہے تیرے بغیر، آنکھوں کا کیا حال ہوا
جب بھی دنیا بستی تھی اب بھی دنیا بستی ہے

آنسو تھے سو خشک ہوئے جی ہے کہ امڈا آتا ہے
دل پہ گھٹا سی چھائی ہے کھلتی ہے نہ برستی ہے

دل کا اجڑنا سہل سہی بسنا سہل نہیں ظالم
بستی بسنا کھیل نہیں ہے بستے بستے بستی ہے

فانی جس میں آنسو کیا دل کے لہو کا کال نہ تھا
ہائے وہ آنکھ اب پانی کی دو بوندوں کو ترستی ہے

انتخابِ
کلامِ تابشؔ

حمدِ باریٔ تعالیٰ

اے ربِ ذوالجلالِ والاکرام اے خدا
تُو ہی خبر ہے اپنی تُو ہی اپنا مبتدا

تیری نظر میں کافر و دیندار ایک ہیں
اک تُو ہی تو ہے کافر و دیندار کا خدا

عاری تعیّنات سے ہے اس قدر بسیط
محدود اس قدر کہ دِلوں میں سما گیا

تیری صفات مُعطی و مُغنی و مُقتدر
تیری صفات مُنذر و قہّار و کبریا

تو عینِ ذات خلطِ مراتب سے بے نیاز
تیری صفات فرقِ مدارج سے ماورا

مرہم ہے زخمِ جاں کو ترا ذکرِ دل پذیر
تسبیح تیری، ٹوٹے دِلوں کے لئے دوا

ہر نغمہ تیرے سوزِ محبت سے جاں نواز
ہر جام تیرے بادۂ عرفاں سے دلکشا

خوشبو سے تیری باغِ دو عالم ہے عطر بیز
مہر و مہ و نجوم سے ظاہر تری ضیا

جدّت سے تیری، پھول میں سُوخلد جلوہ گر
ندرت سے تیری، تخم ہیولا ہے نخل کا

قطرہ ترے کرم سے بضاعت میں بحر ہے
قدرت سے تیری ذرہ میں صحرا سمٹ گیا

کہسار تیرے داب و جلالت کے پاسدار
دریا ہیں تیرے جود و سخاوت کا آئینا

نرگس ہے تیری دید کی ہر لحظہ منتظر
تیری ہی جستجو میں سبک سیر ہے صبا

یکساں ترے سحابِ کرم کو ہیں بحر و بر
تجھ سے ہی فیضیاب ہیں کیا شاہ کیا گدا

توبہ کو تو ہی دیتا ہے اقبال کا شرف
ہوتی ہے مستجاب ترے در پہ ہر دعا

تابش پہ لطفِ خاص کہ اس کا جہان میں
کوئی نہیں ہے حامی و ناصر ترے سوا

صاحبِ قرآں و قرآں

صاحبِ قرآں پر لاکھ دُرود و سلام
نطق میں جس کے ہوا حسنِ ازل ہم کلام

جس نے حرا سے دیا عالمِ اسباب کو
آخری پیغامِ حق جس کا اثر ہے دوام

جس کی ہر اک سطر سے رازِ جہاں آشکار
جس کے ہر اک لفظ میں سینکڑوں عالم کے نام

جس کا ہر اک نقطہ ہے مطلعِ صد آفتاب
جس کے دوائر میں ہیں سینکڑوں ماہِ تمام

جس کے مضامین ہیں چشمۂ آبِ حیات
جس کے قوانین ہیں دہر کو عیشِ دوام

جس کے کنایات ہیں لاکھ سخن آشنا
جس کے اشارات بھی اپنی جگہ ہیں کلام

جس کی امانت میں ہے گوہرِ "لاتقنطو"
جس کی حفاظت میں ہے دولتِ عالم تمام

جس کے حقائق ہوئے کفر کو جاذب و یقیں
جس کے معارف سے ہے بت کدہ بیت الحرام

جس کی تجلی میں ہے عشق کی تاثیرِ خاص
جس کے حجابوں میں ہے حسن کی تنویرِ عام

جس کی حقیقت میں ہے سِرِّ خودی بے حجاب
جس کا مجاز اصل میں ایک خدا کا مقام

جس کے احاطہ میں ہے گنبدِ گردوں اسیر
جس کے اثر سے ہیں نجم مرغِ گرفتارِ دام

جس کی بدولت ہوئی خاک فلک مرتبت
جس کے طفیل ایک ایک ذرہ ہے خاور مقام

جس سے ہوئی شاہ کو فقر کی دولت نصیب
جس سے ہے تاجِ شہی زینتِ فرقِ غلام

جس کی نوا پر ہوئیں سینکڑوں مریم عفیف
جس کی صدا نے کیا لاکھ مسیحا کا کام

جس کی سیادت میں ہے سارا جہاں منضبط
جس کی قیادت میں ہے سارے جہاں کو قیام

جس سے ہوئی معتدل جنبشِ نبضِ حیات
جس سے تنومند ہے جسمِ جہاں کا نظام

جس نے حرا سے دیا آخری پیغامِ حق
اُس پہ ہزاروں درود اُس پہ ہزاروں سلام

خیراتِ تجلّی کی اے پیکرِ محبوبی
کشکول نگاہیں ہیں، سائل مری آنکھیں ہیں

اک نُور سفر میں ہے نظروں ہی سے نظروں تک
راہیں مری آنکھیں ہیں، منزل مری آنکھیں ہیں

کیوں حل نہیں ہو پاتیں انوارِ مدینہ میں
میرے لئے کس درجہ مشکل مری آنکھیں ہیں

اک نقشِ تحیّر ہے ایک ایک نظر تابش
پھر منظرِ طیبہ کا حاصل مری آنکھیں ہیں

○

دُنیا سے ہوا ہوں غمِ دُنیا کا خریدار
بازار کا سودا سرِ بازار ہوا ہے

تیرے سوا کیا ہمیں درکار ہے
چاہیئے کیا، تجھ کو اگر چاہیئے

○

جذبات نگاہیں ہیں اور دل مری آنکھیں ہیں
کیا واقعی طیبہ کے قابل مری آنکھیں ہیں؟

طیبہ ہے نظر میں بھی، اور حُسنِ نظر میں بھی
ایک ایک تجلّی میں شامل مری آنکھیں ہیں

نظریں بھی دھڑکتی ہیں طیبہ میں بہ شکلِ دل
آنکھیں مری آنکھیں ہیں یا دل مری آنکھیں ہیں

آغوش میں رحمت لے یوں ٹھیرے ہیں پلکوں پر
اشکوں کے سفینوں کو ساحل مری آنکھیں ہیں

میرا حامی یا خُدا یا مصطفیٰؐ
یا خدا کہہ کر کہوں یا مصطفیٰؐ

محورِ ہستی فقط ذاتِ رسولؐ
دین و دنیا مصطفیٰؐ تا مصطفیٰؐ

خاکِ طیبہ منزلِ شوق و طلب
دیدہ و دل کی تمنا مصطفیٰؐ

پرسشِ اعمال جب محشر میں ہو
مُنہ سے نکلے برملا "یا مصطفیٰؐ"

سارے عالم کا خدا پروردگار
رحمتِ عالم سراپا مصطفیٰؐ

نظمِ ہستی میں توازن کے لئے
ساری دنیا اور تنہا مصطفیٰؐ

اس طرح آتا ہے طیبہ کا خیال
خود چلے آئے ہوں گویا مصطفیٰؐ

سربسر تفسیرِ حق، تشریحِ حق
معنیٔ یٰسین و طٰہٰ مصطفیٰؐ

دِل کا ہر گوشہ ہے آغوشِ طلب
اِک توجہ کی نظر یا مصطفیٰؐ

تابشؔ ایماں ہے مرا قرآن پر
اور قرآن سراپا مصطفیٰؐ

خاکِ ارجمند

لَولاکَ لَمَا خَلَقتُ الافلاک
گونجی یہ ندا فضائے ہُو میں
اک نُور تھا جلوہ گر سرِ خاک
عالَم تھے ہزار ہا نُمو میں!!

ذرّوں کو نصیب خاوری ہے
غلطاں گُلِ تر میں ہیں گلستاں
پستی کو مذاقِ برتری ہے
قطرہ میں نہاں ہیں لاکھ طوفاں!!

ہر دل میں ہے عشق کا شرارہ
آسودۂ حُسن ہر نظر ہے
ہر ذرّہ ہے عرش کا ستارہ
وہ حُسنِ ازل جو جلوہ گر ہے!!

اِس نُور سے خاک کو شرف ہے
اِس نُور سے دو جہاں ہیں پُرنور
یہ ایک گہر صدف صدف ہے
یہ جلوہ گری ہے طور در طور!!

اِس نُور سے سُوزِ جاں مِلا ہے
سرچشمۂ زندگی ہے یہ سُوز
تقویمِ حیات بن گیا ہے
یہ مہر یہ ماہ یہ شب و روز!!

تا عرش رسا ہوئی کفِ خاک
افلاک سے بھی مِلی بلندی
لَولاکَ لَمَا خَلَقتُ الافلاک
اے خاک تری یہ ارجمندی!!

تضمین بر نعت قدسی

وصاف ترا موجبِ تسکین طلبی
ذات پہ تیری ہوئی عالی نسبی
انبیوں کا تو سارے جہانوں کا نبی
با سیّد مکی مدنی العربی
دل و جاں بادفدایت چہ عجب خوش لقبی!!

دیدار نہ دل کو ہے نہ آنکھوں میں ہے دم
ہ وہ دل ہوں ترے حسن کے کیونکر محرم
ں ایک ایک تجلّی کا ہے اپنا عالم
بیدل بہ جمالِ تو عجب حیرانم
اللہ اللہ چہ جمال است بدیں بوالعجبی!!

وئی گوشۂ راحت نہ سکوں کا کوئی در
ں قدر تنگ ہے پہنائی عالم مجھ پر
ں کہاں جاؤں ترے بابِ کرم سے اٹھ کر
م رحمت بکشا سوئے من انداز نظر
اے قریشی لقب و ہاشمی و مطلبی!!

دشتِ امکاں میں بہت تلخ ہیں اپنے اوقات
خستہ پائی میں ہے درپیش جہانِ ظلمات
جلد سے جلد ملے پیاس کی شدت سے نجات
ما ہمہ تشنہ لبانیم و توئی آبِ حیات
لطف فرما کہ زحد میگذرد تشنہ لبی!!

ساتھ جبریل ہیں اور عالمِ قدوس کا گشت
بزمِ امکاں میں نہیں کوئی بھی تجھ سا خوش بخت
فرش سے عرش تلک فاصلہ سارا یک جست
شبِ معراج عروجِ تو ز افلاک گذشت
بمقامے کہ رسیدی نرسد ہیچ نبی!!

کربِ جاں میں نہیں آتی ہے کسی طور کمی
مندمل چاہیئے تابش کا بھی زخمِ ہستی
روح تسکین کی طالب ہے، ابھی اور ابھی
سیدی انت حبیبی و طبیبِ قلبی
آمدہ سوئے تو قدسی پئے درماں طلبی!!

حضرت ابوبکر صدیقؓ

بُوبکرؓ نے کی ایسی اطاعت رسولؐ کی
پہلے ملی اُنھی کو نیابت رسولؐ کی

پیشِ نظر تھی اوّل و آخر نبیؐ کی ذات
سب کچھ تھی اُن کے واسطے نسبت رسولؐ کی

صدیق کر گئی ہے ابوبکرؓ سے اُنھیں
معراج پر دی ایسی شہادت رسولؐ کی

دنیا اور اس کا سارا زر و مال اک طرف
اُن کی متاع صرف محبت رسولؐ کی

قرآن میں بھی اُن کے مناقب کا ذکر ہے
صدیقؓ میں تھی آئینہ سیرت رسولؐ کی

یہ روز و شب حیاتِ ابوبکرؓ کے رہے
واحد خدا کا سجدہ، اطاعت رسولؐ کی

جھوٹے پیمبروں سے ہمیشہ کے واسطے
محفوظ کر گئے ہیں وہ اُمت رسولؐ کی

ہیں پہلوئے رسولؐ میں بعدِ وصال بھی
صدیقؓ سے نہ چھوٹی رفاقت رسولؐ کی

ہجرت سے لے کے خندق و بدر و حنین تک
تابشؔ انھوں نے کی ہے حفاظت رسولؐ کی

حضرت عمر فاروقؓ

حق کی طلب ہر کام عمرؓ کا
حق ہی حق پیغام عمرؓ کا

اسود و احمر دونوں برابر
عدل سے تھا ہر کام عمرؓ کا

حق کی خاطر مرنا جینا
شیوہ تھا صبح و شام عمرؓ کا

مقصد تھی ہر سعی عمرؓ کی
منزل تھا ہر گام عمرؓ کا

منزل منزل فتح و ظفر تھی
مصر عمرؓ کا، شام عمرؓ کا

لوحِ جہاں پر ثبت رہے گا
روشن روشن نام عمرؓ کا

راہِ حق میں شہادت پائی
تابشؔ یہ انجام عمرؓ کا

حامدؔ اہلِ کیں کے حق میں بھی ابرِ سخا نکلے
جدا جو ہاتھ شانوں سے ہوئے دستِ دعا نکلے
ہمیشہ گوہرِ عشقِ حسینی ہاتھ آیا ہے
فراتِ غم میں ہم جب ڈوب کر اے ناخدا نکلے

حضرت عثمان غنیؓ

ایثار کا پیکر ہیں، وفا کیش و جری ہیں
منجملۂ احبابِ رسولِ عربیؐ ہیں

وہ مکہ و طیبہ ہو کہ خندق کہ اُحد ہو
ہر وقت دل و جان سے ہمراہِ نبیؐ ہیں

تقویٰ کی طرح جن کی حیا جوہرِ کردار
اخلاق میں جو مظہرِ عالی نسبی ہیں

یہ فخر میسر کسے دو بار ہُوا ہے
خوش بخت ہیں دامادِ رسولِ عربیؐ ہیں

اسلام کی عظمت پہ ہے قربان زر و مال
خود مال سے بے گانۂ راحت طلبی ہیں

قرآں میں بیاں اِن کے ہی انفاق کا آیا
خود فقر میں سرشار مگر کتنے سخی ہیں

جو اُن کے کمالات کی دیتے ہیں گواہی
تاریخ میں تابندہ وہ سب نقش ابھی ہیں

اسلام کی نظروں میں ہیں اُمت کے سپاہی
دنیا کی نگاہوں میں وہ عثمانِ غنیؓ ہیں

جو وحدتِ اسلام پہ صدقے ہوئی تابش
قربان اُسی ذات پہ اُمّی و ابی ہیں

حضرتِ علیؓ ابنِ ابی طالب

آئینۂ اسلام ہے کردارِ علیؓ کا
توحید کا پیغام ہے کردارِ علیؓ کا

اصنامِ مفاسد کے یداللّٰہی سے توڑے
ہاں دشمنِ اوہام ہے کردارِ علیؓ کا

وہ جُود و سخا ہو کہ شجاعت ہو کہ تقویٰ
ہر وصف کا انعام ہے کردارِ علیؓ کا

توحید پرستی بھی اطاعت بھی نبیؐ کی
اسلام ہی اسلام ہے کردارِ علیؓ کا

حق کوشی و حق گوئی ہے دن رات کا شیوہ
یکساں سحر و شام ہے کردارِ علیؓ کا

ایک ایک صفت تابعِ فرمانِ الٰہی
اسلام کا اک نام ہے کردارِ علیؓ کا

جو حق کے پرستار ہیں اُن کے لئے اب بھی
اللہ کا اِنعام ہے کردارِ علیؓ کا

ہر وصفِ علیؓ گوہرِ مقصود ہمارا
گویا کرمِ عام ہے کردارِ علیؓ کا

داماد بنایا ہے نبیؐ نے انھیں تا بحشر
کس درجہ خُوش انجام ہے کردارِ علیؓ کا

وہی تو فتح و ظفر کے نشاں اُٹھاتے ہیں
جہادِ حق میں جو آزارِ جاں اُٹھاتے ہیں

وہ اہلِ حق ہیں جو اِس کربلا کی منزل سے
رہِ یقیں میں قدم بے گماں اُٹھاتے ہیں

نشانِ راہ جو رُوشن ہیں چھپ نہیں سکتے
غبار اگرچہ بہت کارواں اُٹھاتے ہیں

جہاں حفاظتِ ناموس باں دیر بھی نہ ہو
ہر اُس چمن سے طیور آشیاں اُٹھاتے ہیں

یہی شناخت ہے ان کی جو مردِ حق شیوہ
عذابِ جاں پئے اظہارِ جاں اُٹھاتے ہیں

مکاں میں گونجتا ہے نعرۂ حُسینؑ حُسینؑ
یہ نعرہ ہم تو سرِ لامکاں اُٹھاتے ہیں

امامؑ و مقتدی ایسے کہ سجدہ ریزی میں
زمیں پہ رکھ کے جبیں آسماں اُٹھاتے ہیں

یہ کائنات اٹھالی ہے ایسا لگتا ہے
درِ حسینؑ کی مٹی جہاں اٹھاتے ہیں

ہیں کربلا کی زمیں ہی سے آسماں رُوشن
اسی کی خاک سے یہ کہکشاں اٹھاتے ہیں

کڑے ہیں کوس اسیروں پہ شام کے تا آبش
کبھی قدم تو کبھی بیڑیاں اٹھاتے ہیں

تُو ہی رہتا ہے دیر تک موجود
بزم میں تُو جہاں سے اُٹھتا ہے

حق کی منزل کربلا ہے حق کا جادہ کربلا
یوں تو ہے اک خطۂ صحرا نہادہ کربلا

گونج اس کی ہے مکاں سے لامکاں تک آج بھی
ہے بظاہر کس قدر اک لفظِ سادہ کربلا

اک تسلسل ہے حق و باطل کا شبیرؑ و یزید
ہے حنینؑ و بدر و خیبر کا اعادہ کربلا

تا قیامت دیجئے نذرانۂ اشکِ عزا
واقعیٔ مظلوم ہے سب سے زیادہ کربلا

سوچیئے تو ایک مشہد دیکھئے تو ایک دشت
کتنی رنگیں کربلا ہے، کتنی سادہ کربلا

سارے جذبے منسلک بس ایک ہی وحدت میں ہیں
اپنی منزل، راستہ، مقصد، ارادہ کربلا

آج بھی انسانیت کی حق نمائی کے لئے
گام گام ابنِ علیؑ ہیں جادہ جادہ کربلا

معرکے سارے حق و باطل کے اس کے معرکے
کتنی لامحدود ہے کتنی کشادہ کربلا

زندگی میں کاش تابش وہ بھی دن آئے کہ ہم
سر کے بل جائیں مدینہ پاپیادہ کربلا

○

ہے بہت حوصلۂ عبرتِ ہستی تابش
کثرتِ غم میں دعا ہے کہ مری عمر درازلا

میرے اظہارِ غم کو ہے درکار
اور اک زخم چشمِ تر جیسا

مرثیہ

آگ

(مرثیہ امامِ مظلوم جناب امام حسینؑ و شہدائے کربلا)

اس ربِ ذوالجلال کی رحمت ضرور ہے
جو قادر و قدیر و رحیم و غفور ہے
ربِ ازل ہے، مالکِ یوم النشور ہے
قبضے میں جس کے عالمِ غیب و ظہور ہے
معجز نما جہاں میں اُسی کی صفات ہیں
اعیان جس قدر ہیں وہ سب ممکنات ہیں

چمکا جو ذرہ مہرِ ضیا بار ہو گیا
پھیلا جو قطرہ قلزمِ زخّار ہو گیا
گُل جو کھلا تو گلشن و گلزار ہو گیا
قوت ملی جو کاہ کو کہسار ہو گیا
یہ وصف یہ کمال یہ ندرت اُسی کی ہے
ظاہر ہر ایک چیز سے قدرت اُسی کی ہے

واحد بھی تُو وحید بھی تُو طاق بھی تُو ہی
پروردگارِ انفس و آفاق بھی تُو ہی
مور و ملخ کا رازق و رزّاق بھی تُو ہی
تُو ربِ نور، آگ کا خلّاق بھی تُو ہی
توقیرِ کعبہ آبروئے دیر تجھ سے ہے
اے ربِ خیر و شر، یہ شر و خیر تجھ سے ہے

سنگ و خزف کو قیمتِ جوہر ادا کرے
ہر ایک نوکِ خار کو گُل برملا کرے
چاہے تو ہر سراب کو بحرِ سخا کرے
بخشش کرے تو ظرف سے بڑھ کر عطا کرے
فردا و دی کو زندگیِ حال بخش دے
چاہے تو پل کو، عمرِ مہ و سال بخش دے

میرے خدا مجھے لبِ اعجاز کر عطا
تخئیل بھی ملائکہ پرواز کر عطا
الفاظ کو کرشمہ و انداز کر عطا
مضموں کو شکل، فکر کو آواز کر عطا
بہرِ دواتِ عرش کی قندیل چاہیئے
کلکِ ثنا کو اِک پرِ جبریل چاہیے

نعتِ نبیؐ و مدحتِ آلِ نبیؐ لکھوں
ایک ایک سطر نُور بحرفِ جلی لکھوں
تحریر نُور ہی کی لکھوں جب کبھی لکھوں
یعنی نبیؐ لکھوں تو برابر علیؑ لکھوں
ہمراہِ مصطفیٰؐ رہے حیدرؑ کا نام بھی
وردِ زباں درود بھی ہو اور سلام بھی

وہ ذات جس کے گھر سے ہے تقسیم نُور کی
وہ جس کا جسمِ پاک ہے تجسیم نُور کی
وہ جس نے نُور ہو کے دی تعلیم نُور کی
وہ جس کا نُور کرتا ہے ترمیم نُور کی
سارے حجاب اس کی تجلّی سے ہٹ گئے
نکلا جو آفتاب اندھیرے سمٹ گئے

ایسا نبیؐ ضرورتِ عالم ہے جس کی ذات
ایسا رسولؐ علّتِ عالم ہے جس کی ذات
ایسا وسیلۂ وحدتِ عالم ہے جس کی ذات
ایسا رحیمؐ رحمتِ عالم ہے جس کی ذات
ساری صفات جمع ہیں اُس ایک ذات میں
اس کا کوئی مثیل نہیں کائنات میں

تخلیقِ کائنات کا مقصد ہے جس کا نام
بعد از خدا مقدّس و امجد ہے جس کا نام
ہیں جتنے نام اُن میں مجرّد ہے جس کا نام
محمودؐ، حامدؐ، اور محمدؐ ہے جس کا نام
اس کے لئے درود کی سوغات بھیجیے
اک اک نفس میں بھیجیے، دن رات بھیجیے

رف رف سوار تھا بر عرشِ عُلا گیا
پنہائی خیال سے بھی ماورا گیا
نکلا حدودِ وقت سے اور برملا گیا
طے کر کے پل میں عالمِ لاہوت آ گیا
یہ اوج یہ شرف بھی کسے آج تک ملا
اس کے لئے زمیں سے جھک کر فلک ملا

ختمِ رسلؐ، شفیعِ اُممؐ، سیّد البشرؐ
عیسیٰ نفوسؐ، صاحبِ اعجازؐ، چارہ گرؐ
خیرِ کثیرؐ، بحرِ سخاؐ، کیمیا نظرؐ
مولا صفتؐ، فرشتہ شمائلؐ، مَلک سیرؐ
سالارِ فوج صفدرِ منبر کی زین بھی
طائف بھی اس کی راہ میں بدر و حنین بھی

الہام فکر، لہجہ حسین، گفتگو ادب — کوئی نہیں ہے بیشتر حق میں علیؑ سا شیر
طٰہٰ خطاب، عرف سراج، البطحیٰ لقب — دستِ قوی سے جس کے ہے دستِ فلک بھی زیر
مکی نژاد، طیبہ وطن، ہاشمی نسب — جانباز، جاں فروش، دلاور، جری، دلیر
محبوبِ بوترابؓ، تو محسودِ بولہب — دیں پر حریص، دولتِ دنیا سے چشم سیر

دشمن ہے کفر و شرک کا ہر اک رنگ میں — ملنے کے باوجود نہ دنیا قبول کی
حق کا رسولؐ ہے حق و باطل کی جنگ میں — اس کی متاع صرف محبت رسولؐ کی

ہے بعدِ نعت مدحتِ حیدرؓ زبان پر — دشمن وہ شر کا بھی ہے عدوئے فساد بھی
قربان ہو رہی ہے فصاحت بیان پر — مشکل کشا بھی ہے وہ دلوں کی مراد بھی
صدقے مہ و نجوم ہیں لفظوں کی شان پر — مبدا بھی آشکار ہے اس پر معاد بھی
کیونکر دماغِ فکر نہ ہو آسمان پر — اُس کا عمل جہاد بھی ہے اجتہاد بھی

ذکر اس کا ہے جو سالکِ راہِ صواب ہے — رکھے نہ کیوں جہاد پر ایمان کی طرح
جس کا علیؓ ہے نام لقب بوترابؓ ہے — نازل ہوئی ہے تیغ بھی قرآن کی طرح

وہ بوترابؓ جس کو نبیؐ کا ولی کہیں — خوش طبع، خوش مزاج، خوش اطوار، خوش سیر
وہ بوترابؓ جس کو نبیؐ کا وصی کہیں — دستِ قوی میں زور یداللہ سر بسر
وہ بوترابؓ جس کو نبیؐ کا بھی کہیں — قبضے میں ذوالفقار سی شمشیرِ معتبر
وہ بوترابؓ سب جسے مولا علیؓ کہیں — شوہر ہے فاطمہؓ کا تو حسنینؓ کا پدر

ہر حال میں محافظِ دینِ حنیف ہے — کس ایک ذات کو یہ جہاں میں شرف ملا
احزاب ہو کہ بدر نبیؐ کا حلیف ہے — بیٹے کو کربلا ملی، خود کو نجف ملا

با عجز و انکسار خدا کی ثنا کے بعد — چشمہ اسی کے فیض کا جاری مدام ہے
با صد نیاز نعتِ رسولِ خدا کے بعد — سیراب اسی سے ہے جو کوئی تشنہ کام ہے
با صد خلوص منقبتِ مرتضیٰ کے بعد — سرشار اسی سے بزمِ نمو کا نظام ہے
اس ابتدا کے بعد اور اس انتہا کے بعد — اس کے بغیر روحِ عناصر بھی خام ہے
تکوینِ کائنات میں بھی غور چاہیے — گوندھے ہیں اس نے خوب عناصر حیات کے
پروردگار زورِ بیاں اور چاہیے — مظہر ہیں سارے خشک و تر اس کی صفات کے

تکوینِ عنصروں کا حسیں اشتراک ہے — بن کر ردائے ابر فضاؤں پہ تن گیا
اس اشتراک ہی سے جہاں تابناک ہے — دشت و جبل میں بھاپ بنا برف بن گیا
لیکن جہاں میں چار عناصر کی دھاک ہے — سوئے دیارِ رنگ براہِ چمن گیا
ان میں ہوا ہے پانی ہے آتش ہے خاک ہے — کانٹوں پہ تل گیا کبھی پھولوں میں چھن گیا
ہر شکل آئینہ ہے انہی کے جمال کا — اہلِ ورع کے واسطے یہ سلسبیل ہے
ہر شے میں تکملہ ہے انہی کے کمال کا — فرعون اگر ہے کوئی تو پھر رودِ نیل ہے

پانی کہ ہے جو رزق جماد و نبات کا — پانی سے برگ و بار و گل و لالہ و ثمر
پانی کہ ہے لہو جو عروقِ حیات کا — پانی سے ہر صدف میں گہر ہائے شاہوار
پانی کہ ہے خزینۂ جاں کائنات کا — پانی سے مشتِ خاک میں سو خلد جلوہ گر
پانی کہ جس کو نام ملا ہے فرات کا — پانی سے سلسبیلِ اشکِ عزا اثر
اس کے بغیر دہر میں جینا محال ہے — حاصل اگر نہ ہو تو دوامِ حیات بھی
سرچشمہ زیست کا یہی آبِ زلال ہے — مشکیزہ بھی اسی سے اسی سے فرات بھی

قائم ہوا کے دم سے تنفس کا ہے نظام
ہوتی ہے اس سے نکہتِ گل جنتِ مشام
یہ موجۂ نگاہ کو کرتی ہے خوش خرام
اس کے بغیر بات بھی مشکل ہے لاکلام
مانندِ آب یہ بھی متاعِ حواس ہے
اس کا سپاس جو نہ کرے ناسپاس ہے

پرّاں ہے اس کے دوش پہ کیا ابر کیا طیور
رقصاں ہے اس کے ساتھ زمانہ بصد سرور
ہے اس کے دم سے سینۂ نَے نغمہ زارِ نور
اس کے نفس کا شور ہے آوازِ نفخِ صور
کوہ و کمر میں اس کی برودت کی دھوم ہے
لیکن یہ کربلا میں تو بادِ سموم ہے

اس کی قیود میں ہے مکاں ہو کہ لامکاں
اس کی حدود میں وسعتِ آفاق بے نشاں
اس کی روش ہے فصلِ گل و موسمِ خزاں
اس کا قیام شعلہ و شبنم کے درمیاں
بھڑکا کے اک شرار ہر اک شے بھسم کرے
پھیلا کے ایک قطرے کو طوفاں بہم کرے

ہر ایک شے میں حاضر و موجود خاک ہے
اک پرتوِ تجلیِ معبود خاک ہے
اتنی نگاہِ قدس میں محمود خاک ہے
ساجد ملائکہ ہیں تو مسجود خاک ہے
منکر ہوا جو اس کا وہ نابود ہو گیا
رد اس کو جس نے کر دیا مردود ہو گیا

نرمی میں اس کی لاکھ شگفتِ گل و چمن
تندی میں اس کی سینکڑوں طوفاں موجزن
اس کا خرام مژدۂ تسکینِ روح و تن
اس کا سکوت پیکِ اجل کے لئے کفن
یہ دشمنِ حیات بھی ہے جانفزا بھی ہے
دوڑے تو روح بھی ہے رکے تو قضا بھی ہے

برگ و گل و نہال و ثمر خاک ہی تو ہے
لعل و جواہر و مس و زر خاک ہی تو ہے
صحرا و باغ و کوہ و کمر خاک ہی تو ہے
بزمِ نمو میں شعبدہ گر خاک ہی تو ہے
گندم سے جَو اُگاتی نہیں وہ زمین ہے
دنیا میں کون خاک سے بڑھ کر امین ہے

ہر سُو بساطِ دہر میں مبسوط خاک ہے
سب سے الگ ہر ایک میں مخلوط خاک ہے
پانی ہوا اور آگ سے مربوط خاک ہے
سب عنصروں میں رشتۂ مضبوط خاک ہے
حُسن و جمال کا ہے دَر و بست خاک سے
عنصر تمام رہتے ہیں پیوست خاک سے

ہے خاک پھر بھی رُتبے میں کتنی بلند ہے
توفیق سے بھی حُسن کچھ اس کا دوچند ہے
انسانیت کی سطح تک اس کی زقند ہے
یہ اپنے ارتقا میں بڑی ارجمند ہے
رفعت میں ماورائی ادراک تک گئی
اتنی ہوئی بلند کہ افلاک تک گئی

آب و ہوا و خاک کی ہر شکلِ دل پذیر
ہر چند بے مثال ہے ہر چند بے نظیر
آتش بغیر ہو نہ سکی روشن و مُنیر
ثابت ہوا کہ کوئی بھی عنصر نہیں حقیر
آب و ہوا و خاک کی توقیر آگ ہے
سب عنصروں میں باعثِ تنویر آگ ہے

کج مج بیاں ہیں آگ کی تعریف کیا کریں
نقرہ شنا ہیں ہم کوئی تصنیف کیا کریں
ایک ایک حرف کے لئے تحریف کیا کریں
اوصاف اس قدر ہیں کہ توصیف کیا کریں
سوز و گداز کیسے ہو ظاہر بیان کا
گرمی سے حرفِ شوق ہے چھالا زبان کا

روزِ ازل اسی کو ملی صورتِ ظہور
یہ صورتِ ظہور ملی اور بشکلِ نُور
اس ایک نُور سے ہیں منوّر ہزار طُور
کیوں کر نہ اس کو اپنے مدارج پہ ہو غرور
اس درجہ اس کو اوج ملا مرتبہ ملا
سر رشتہ اس کا جنّ و ملائک سے جا ملا

روشن جبھی تمام عناصر میں آگ ہے
موجود خاص و عام عناصر میں آگ ہے
تخمیر کا نظام عناصر میں آگ ہے
تابندہ لا کلام عناصر میں آگ ہے
حُسنِ حُدوث بھی ہے جمالِ قِدم بھی ہے
یہ شمعِ دیر بھی ہے چراغِ حرم بھی ہے

یہ اُنس یہ خلوص یہ شفقت یہ اختلاط
یہ خُلق یہ وفا یہ تعلق یہ ارتباط
یہ خوش دلی یہ حظ یہ تبسم یہ انبساط
یہ سرخوشی یہ کیف یہ تفریح یہ نشاط
ہستی کے کھیل سارے کے سارے اسی کے ہیں
جیسے کے جس قدر ہیں سہارے اسی کے ہیں

مجروح اُس سے رُوح بشکلِ حسد بھی ہے
یہ دِل کے واسطے سبب کید و کد بھی ہے
تشکیک و ریب ہو تو فتورِ خرد بھی ہے
سفلی ہوں خواہشیں تو عدوئے جسد بھی ہے
انسان اگر اسے نہ ذرا اعتدال دے
انسان کو یہ قعرِ مذلت میں ڈال دے

سوز و گدازِ جاں تپشِ دل اسی سے ہے
جذبے میں اپنے عشق بھی کامل اسی سے ہے
رعنائی اہلِ حسن کو حاصل اسی سے ہے
محفل میں ساری گرمیٔ محفل اسی سے ہے
اِس کا وجود نُور بھی ہے اور آگ بھی
ہم سے اسے لگاؤ بھی ہے ہم سے لاگ بھی

اس خاکداں میں روشنیٔ غرب و شرق ہے
دنیا تمام اس کی تجلّی میں غرق ہے
اس کا مزاج ایک ہے شکلوں میں فرق ہے
انگارہ ہے، شرار ہے، شعلہ ہے، برق ہے
ہر طرح دلکشا ہے کوئی اس کا رُوپ ہو
گرمی کی چاندنی ہو کہ جاڑے کی دھُوپ ہو

گرمائے دل تو حسرتِ پُرجوش اس کا نام
جذبے میں ہو شریک تو پھر جوش اس کا نام
بر میں ملے تو گرمیٔ آغوش اس کا نام
سُلگے اگر تو آتشِ خاموش اس کا نام
جب تک ہے اعتدال میں سب کی نعیم ہے
بھڑکے اگر تو پھر یہی نارِ جحیم ہے

مہر و مہ و ستارہ و انجم میں اس کی ضَو
دریا میں اس کی موج، سمندر میں اس کی رَو
محفل کا یہ چراغ، پتنگوں کو اس کی لَو
تازہ بہ تازہ حُسن تو جلوہ ہے نَو بہ نَو
ظاہر ہر ایک رنگ میں اس کا جمال ہے
لالہ ہے گلستاں میں تو معدن میں لال ہے

پیغامِ آشتی سببِ جنگ بن گئی
آہن میں موم شعلگیٔ سنگ بن گئی
پہنچی حجابِ ساز میں آہنگ بن گئی
شاخِ چمن سے پھوٹ کے گُل رنگ بن گئی
گرمی سے اپنی حُسنِ خط و خال ہو گئی
ساغر میں آ کے آتشِ سیّال ہو گئی

پہنچی جو طُور پر تو شرربار ہو گئی
پایا کوئی خلیل تو گلزار ہو گئی
جنّت کبھی بنی تو کبھی نار ہو گئی
خود بھی تضادِ ذات کی پیکار ہو گئی
مِلتا ہے اختلاف جو اس کی صفات میں
ہیں لاکھ کربلائیں اسی سے حیات میں

گرمی سے اس کی موجِ نمو شاخ میں رواں
گرمی سے اس کی تخم میں اک نخل کا سماں
گرمی سے اس کی ذرّے میں جوہر رشد ضو فشاں
گرمی سے اس کی زیرِ قدم ہفت آسماں
انساں کو اس سے اَوجِ ملائرودی ملی
اس کو کیا تلاش تو پیغمبری ملی

عقلِ رسا تضادِ دو عالم پہ دنگ ہے
اعجوبہ اِس حیات کا ایک ایک رنگ ہے
روزِ ازل سے دشمنِ آئینہ سنگ ہے
باطل کی حق سے نُور سے آتش کی جنگ ہے
ہر دَور میں یزید عدو ہے حسینؓ کا
ہر کربلا اعادہ ہے بدر و حُنین کا

تمیز کچھ جلی و خفی میں ضرور ہے
اتنا شعور جس کو نہیں بے شعور ہے
یزداں و اہرمن میں اسی کا ظہور ہے
ان میں سے ایک نُور ہے اِک غیرِ نور ہے
کانٹوں کے ساتھ ساتھ اگاتی ہے پھول بھی
ہے اس سے بولہب بھی اسی سے رسولؐ بھی

دشتِ بلا میں ایسے بھی آتش نژاد ہیں
جو بد قماش و بد گہر و بد نہاد ہیں
مکر و دغل کے سارے ہی فن ان کو یاد ہیں
بانیٔ شر ہیں پیروِ ابنِ زیاد ہیں
دیتی ہے اشتعال انہیں کینہ و کد کی آگ
بھڑکی ہوئی ہے ان کے دلوں میں حسد کی آگ

ہاں کربلا میں بھی ہوئی شعلہ فشاں یہ آگ
پھر تو ہوئی حریفِ سکون و اماں یہ آگ
پھر تو ہوئی نقیضِ نظامِ جہاں یہ آگ
پھر تو گئی نہ جانے کہاں سے کہاں یہ آگ
بغض و حسد کی آگ ہر اک شے جلا گئی
یہ آگ دُور تک زرہ کربلا گئی

بھڑکی ہوئی ہے چار طرف کربلا میں آگ
اس آگ نے لگائی ہے ارض و سما میں آگ
رقصِ شرر دکھاتی ہے کیا کیا ہوا میں آگ
لُو بن کے دوڑتی ہے ہر اک سُو فضا میں آگ
حدت سے ایک اک گُلِ صحرا کُھلس گیا
گرمی سے نخل ہی نہیں سایہ جھلس گیا

پھیلا ہوا ہے صورتِ ریگِ رواں دھواں
آفاق پر ہے چار طرف پر فشاں دھواں
اس سمت ہے زمیں تو اُدھر آسماں دھواں
القصہ ہے فضائے دو عالم دھواں دھواں
دن کا گماں تک نہیں روزِ سیاہ پر
گرمی سے ہیں پڑے ہوئے پردے نگاہ پر

شدت وہ دھوپ کی وہ قیامت کا التہاب
ہے کربلا کی خاک کا ہر ذرہ آفتاب
گرمی سے موجِ وقت ہے اک برقِ اضطراب
کھاتا ہے کیا کیا اُبلقِ ایام پیچ و تاب
جو صبح ہے وہ صورتِ نصف النہار ہے
اِس طرح کربلا میں خزاں کی بہار ہے

وہ مہرِ نیم روز کی حدت کہ الحذر
دہکے ہوئے ہیں دشت کے سارے شجر حجر
انگارہ ہر خذف ہے تو شعلہ گل و ثمر
جلتے ہیں ہر پرند کے پر مارنے سے پر
آبِ فرات میں بھی عجب التہاب ہے
گرمی سے پائے موج کا چھالا حباب ہے

ایسے میں خیمہ زن ہے سرِ وادیٔ فرات
وہ عبدِ حق پناہ وہ مردِ خدا صفات
سب کا امامؑ راہبرِ جادۂ نجات
جس کا ہر ایک نقشِ قدم منزلِ ثبات
سبطِ نبیؐ ہے فاطمہؑ کا نورِ عین ہے
اِس مردِ حق کا اسمِ گرامی حسینؑ ہے

طفلی پہ جس کی عرشِ الٰہی کا سایہ ہے
رُوح الامین نے جسے گودوں کھلایا ہے
قرآن نے صاف بولنا جس کو سکھایا ہے
منہ جس کا سلسبیل نے اکثر دُھلایا ہے
دیکھے ہیں جس کے کھیل حرم کی فضاؤں نے
لوری جسے سنائی ہے طوبیٰ کی چھاؤں نے

انفاس جس کے گلشنِ جنّت کی نکہتیں
ارمان جس کے حفظِ و ورع کی ضمانتیں
جذبات جس کے حُسن و لطافت کی صورتیں
اوصاف جس کے اپنی جگہ بھی عبادتیں
تقویٰ کی جس کے نفس پہ حجت تمام ہے
زہد و ورع بھی جس کی جوانی کا نام ہے

بچپن سے عینِ شرع ہے جس کا ہر اک اصول
درگاہِ حق میں جس کی ہے معصومیت قبول
طفلی میں جس کی مہکی ہوئی خوشبوئے رسولؐ
جس کے گلے کی نادِ علی بوسۂ بتولؑ
جس کی بسریوں کی سند دوشِ مصطفیٰؐ
جس کے لہو میں گرمیِ آغوشِ مصطفیٰؐ

مُردہ ضمیر و رُوح کا جاں بخش و چارہ گر
بے آب کھیتیوں کے لئے موجِ اَبرِ تر
ہر دامنِ تہی کے لئے مخزنِ گہر
ہر پنجۂ مراد کو اک شاخِ بارور
اک بحرِ بے کنار وہ جُود و سخا کا ہے
اس کی متاع صرف توکّل خدا کا ہے

تعبیر جس کا حُسنِ جوانی ہے نُور سے
نظریں دُھلی ہیں جس کی شرابِ طہور سے
عاری ہے جس کا نفس سراسر فتور سے
ہر طرح جو عفیف ہے غلمان و حور سے
جس کا شباب رُوح کا جاں کا شباب ہے
جس کا شباب اہلِ جناں کا شباب ہے

پیری ہے جس کی زہد و تقدس کو محترم
تسبیح جس کا سانس ہے تہلیل جس کا دَم
سجدے تو کیا حرم بھی ہے جس کی جبیں میں ضم
منزل رہِ صواب کی ہے جس کا ہر قدم
قلب و زباں کو شرع کا ہر حکم یاد ہے
شب اُس کی بندگی ہے دن اُس کا جہاد ہے

بھڑکی ہوئی ہے آگ جو ہر سُو عناد کی
بُو کربلا سے آتی ہے کون و فساد کی
آمادہ شر پہ فوج ہے ابنِ زیاد کی
شبیرؑ کے لئے ہے یہ ساعت جہاد کی
باطل سے اہلِ حق کا رویہ شدید ہے
بیعت طلب حسینؑ سے پھر بھی یزید ہے

ہیں سامنے نگاہ کے جلتے ہوئے خیام
شعلوں سے تمتمایا ہُوا ہے سوادِ شام
ہر چرخِ کبود جن کی لپٹ سے ہے لالہ فام
پھر بھی نہیں ہے سرد ابھی جوشِ انتقام
منظر نظر کے سامنے ہے کربِ دید کا
خیموں کی آگ ہے کہ جہنّم یزید کا

اعلانِ حق حسینؑ کی جانب سے واشگاف
انکار تھا یزید کی بیعت سے صاف صاف
دنیا کرے ہزار حقیقت سے انحراف
مٹتا نہیں کبھی حق و باطل کا اختلاف
کرتے ہیں تنگ عرصۂ ہستی حسینؑ پر
پانی ہے بند فاطمہؑ کے نورِ عین پر

باقی نشان تک نہیں اب خیمہ گاہ کا
دشتِ بلا سواد ہے اب اشک و آہ کا
گُشتہ ہر اک چراغ ہُوا حق کی راہ کا
ہے ہر طرف محیط اندھیرا نگاہ کا
اے کربلا وہ نُور کے پیکر کِدھر گئے
عبّاسؑ و قاسمؑ و علی اصغرؑ کِدھر گئے

اے بادِ اختلاف و ہوائے ستم شعار
اے وقتِ نامساعد و عہدِ ستیزہ کار
اے عالمِ دنی و جہانِ ذلیل و خوار
اے آسمانِ بد روش و چرخِ کج مدار
وہ باغبانِ باغِ رسالت کہاں گئے
وہ پاسبانِ شمعِ امامت کہاں گئے

وہ جن کے دم سے تھا چمنِ اسلام کا چمن
وہ خوش نگاہ و خوش دل و خوش فکر و خوش سخن
وہ گُل عذار و گُل رُخ و گُل رُو و گُل بدن
اب تک فضا میں جن کی ہے خوشبوئے پیرہن
زنجیر کوئی تجھ میں کوئی بے ردا ہُوا
اے دشتِ نینوا تری غیرت کو کیا ہُوا

وہ ننھے ننھے ہاتھ علم تھامے کیے
وہ پیاس وہ زباں پہ فقرے رکے رکے
وہ جذبۂ وغا وہ شہادت کے حوصلے
ہمت جواں تھی پھر بھی یہ مرنے کے دن نہ تھے
خاک اور خوں میں عونؑ و محمدؑ نہائے ہیں
فردوس سے عقیلؑ بھی ماتم کو آئے ہیں

خاک اور خون میں تنِ عباسؑ اٹ گیا
مشکیزہ ایک تیرِ شقاوت سے پھٹ گیا
شانے کٹے کہ رشتہ وفاؤں سے کٹ گیا
اک سانحہ بساطِ دو عالم الٹ گیا
لاچار آج کتنے شہِ مشرقین ہیں
کوئی نہیں کوئی نہیں تنہا حسینؑ ہیں

اب تک نظر میں پھرتا ہے قاسمؑ کا بانکپن
پھیلا ہوا تھا جس کا تبسم چمن چمن
جس کی رگوں میں نورِ امامت تھا موجزن
تھا کس قدر حسین وہ جگر گوشۂ حسنؑ
یہ نوجواں تھا ناز و نعم کا پلا ہوا
دشتِ بلا میں وہ بھی شہیدِ بلا ہوا

وہ حق کا سرفروش وہ جانبازِ مصطفیٰؐ
جس کا وجود نازشِ حق، نازِ مصطفیٰؐ
انداز جس کے ہو بہو اندازِ مصطفیٰؐ
جس کی صدا میں آتی تھی آوازِ مصطفیٰؐ
صد افتخارِ منبر و مسند نہیں رہا
اللہ!! وہ شبیہِ محمدؐ نہیں رہا

عباسؑ کا سکینہؑ کو اب تک ہے انتظار
عباسؑ کی جدائی سے ہوتی ہے بیقرار
ثابت ہو فالِ بد نہ کہیں دل کا انتشار
گھبرا کے دیکھتی ہے سوئے چرخ بار بار
مشکیزہ لے کے آئیں کہ دریا اٹھا کے لائیں
یا رب مرے چچا کسی صورت سے جلد آئیں

دریا کہاں سے لائیں سمندر کہاں سے لائیں
مشکیزہ و صراحی و ساغر کہاں سے لائیں
دو گھونٹ سبطِ ساقیِ کوثر کہاں سے لائیں
پانی ترے لیے علی اصغرؑ کہاں سے لائیں
تو بھی نشانۂ ستمِ حرملا ہوا ہے
خونِ رگِ گلو سے تر اتر گلا ہوا ہے

میدانِ کربلا میں عجب سانحہ ہُوا
شورِ الحذر کا نعرۂ ارض و سما ہُوا
اِک تہلکہ بپا سرِ عرشِ عُلا ہُوا
اعلائے حق کا یہ بھی فریضہ ادا ہُوا
خنجر گلے پہ خاک پہ ہے سر حُسینؑ کا
سجدہ ادا ہُوا تہہِ خنجر حُسینؑ کا

وہ تیرگیٔ شام وہ صحرائے پُرخطر
طاری دِلوں پہ ہَول ہے وحشت حواس پر
اِک اِک قدم پہ ٹھوکریں کھاتی ہے ہر نظر
میدانِ کربلا ہے کہ ظلمات کا سفر
مسدود تیرگی نے کیا ہے جو راہ کو
مِلتا نہیں ہے راستہ پائے نگاہ کو

عباسؑ و قاسمؑ و علی اکبرؑ نہیں رہے
عونؑ و محمدؑ و علی اصغرؑ نہیں رہے
جانِ حسنؑ، حسینؑ کے دلبر نہیں رہے
اے کربلا وہ تیرے بہتّر۷۲ نہیں رہے
اس وقت دستگیریِ زینبؑ کو آئے کون
جنگ گاہ سے حسینؑ کا لاشہ اُٹھائے کون

کجلائی چاندنی وہ ستارہ بجھا بجھا
وہ سائیں سائیں کرتی ہوئی دشت کی فضا
وہ شورِ گرد باد، وہ چنگھاڑتی ہوا
وہ مرگِ ناگہاں کا ہر اک لحظہ سامنا
باقی رہے ہیں ہوش نہ قائم حواس ہیں
آلِ رسولؐ پیکرِ خوف و ہراس ہیں

ظاہر ہے حزن و یاس کی شدت نگاہ سے
مِلتا نہیں ہے دل کو سکوں اشک و آہ سے
ہٹتی نہیں نگاہ کسی طرح راہ سے
لوٹے نہیں حسینؑ ابھی قتل گاہ سے
کرتی ہے انتظار سکینہؑ حسینؑ کا
سونے کو چاہیے اُسے سینہ حسینؑ کا

دل دوز ایک آہِ شرر بار کے سوا
خوں گشتہ چند اشکِ عزادار کے سوا
دِل کے ہزار زخمِ دلِ آزار کے سوا
مُردوں میں ایک عابدِؑ بیمار کے سوا
کوئی شریکِ غم نہیں بنتِ بتولؑ کا
ہے آج بے وسیلہ گھرانہ رسولؐ کا

وہ بے نتیجہ جستجوئے گوشۂ اماں
ناموس و شرم کا وہ ہر اک لحظہ امتحاں
وہ اپنی بے ردائی پہ محجوب بیبیاں
وہ ہر قدم پہ تنگ زمیں، دشمن آسماں
اربابِ کیں کے ظلم و ستم کی دلیل ہیں
زینبؑ کے بازوؤں پہ جو رسّی کے نیل ہیں

زینبؑ ہے اور یادِ شہیدانِ تشنہ کام
زینبؑ ہے اور ماتمِ مظلومیٔ امامؑ
زینبؑ ہے اور کثرتِ غمہائے ناتمام
زینبؑ ہے اور دشتِ غریبی کے صبح و شام
پھر بھی زباں پہ شکر ہے پروردگار کا
شکوہ نہیں ہے گردشِ لیل و نہار کا

تلخی سے تشنگی کی وہ اینٹھی ہوئی زبان
اُٹھتے نہیں ہیں پاؤں کہ زنجیر ہے گراں
ہے اک صدی کا فاصلہ لمحوں کے درمیاں
کس طرح طے کریں اسے سجادؑ نیم جاں
دشوار مرحلے ہیں بہت گام گام کے
درپیش ابھی ہیں کوس کڑے راہِ شام کے

اے ساکنانِ گنجِ شہیداں سلام ہو
اے حاملانِ سطوتِ ایماں سلام ہو
اے دُودمانِ فخرِ رسولاں سلام ہو
اے وارثانِ سُنّت و قرآں سلام ہو
رخسارِ حق کا غازہ تمہارا لہو ہُوا
تم سُرخرو ہوئے تو یہ دیں سُرخرو ہُوا

اے دشتِ کربلا ترا پیغام زندہ ہے
تیرا ہر اک عمل ہر اک اقدام زندہ ہے
تیرے شہید زندہ، ترا نام زندہ ہے
تو زندہ جب تلک ہے یہ اسلام زندہ ہے
ہے تیرگی میں جذبۂ ایماں کی روشنی
خیموں کی آگ، شامِ غریباں کی روشنی

تابش یہ آگ روشنیٔ قلب و جاں بھی ہے
تابش یہ آگ منزلِ حق کا نشاں بھی ہے
تابش یہ آگ دشمنِ شب زادگاں بھی ہے
تابش یہ آگ نورِ دلِ نوریاں بھی ہے
دشتِ بلا اس آگ نے گلزار کر دیا
آفاقِ تیرہ کو سحر آثار کر دیا

○

غم کو راحت بنا لیا ہم نے
یُوں یہ دھوکا بھی کھا لیا ہم نے

زیست کو خوشگوار ہی رکھّا
تلخیوں کا مزا لیا ہم نے

دل کو برباد ہونا تھا سو ہوا
تیرے غم کو بچا لیا ہم نے

چند موہوم حسرتوں کے سوا
اور دنیا سے کیا لیا ہم نے

آئینہ جب بھی روبرو آیا
اپنا چہرہ چھپا لیا ہم نے

دامن اُلجھا ہوا تھا کانٹوں میں
جھٹکا دے کر چھڑا لیا ہم نے

قدمِ اولیں کا کھُلنا تھا
اپنی منزل کو جا لیا ہم نے

وہ رہیں عرضِ شوق پر برہم
اپنا مقصد تو پا لیا ہم نے

جو کسی کا نہ تھا زمانے میں
اس کو اپنا بنا لیا ہم نے

نہ ہوئے غیر سے سُبک تابش
اپنا بوجھ آپ اٹھا لیا ہم نے

○

رباعی

آنکھوں سے سُجھائی نہیں دیتا مجھ کو
کانوں سے سُنائی نہیں دیتا مجھ کو
تابش قفسِ زیست سے لیکن پھر بھی
صیّاد رہائی نہیں دیتا مجھ کو!

○

یُوں تو یہ انفس و آفاق ہیں مظہر میرے
ایک دنیا ابھی آباد ہے اندر میرے

کتنے دُکھ ہیں جو رہِ تشنۂ اظہار اب تک
کوزۂ حرف سے سمٹے نہ سمندر میرے

اپنے قامت کا بھی اندازہ ہو کچھ تو مجھ کو
لیکن آتا ہی نہیں کوئی برابر میرے

جن محاذوں پہ قوی پایا نہ دشمن اپنا
ان محاذوں سے پلٹ آئے ہیں لشکر میرے

آسماں گیر ہے اس حبس میں میری پرواز
اس فضا میں بھی توانا تو ہیں شہپر میرے

ہر قدم پر مری پہچان بدل جاتی ہے
جتنے رشتے ہیں مرے اتنے ہی پیکر میرے

دائرہ وار نہیں ایک ہی مرکز کو محیط
میں وہ پرکار بدلتے رہے محور میرے

مشترک جذبۂ اظہار ہو پھر کیوں نہ کہوں
سب سخن میرے ہیں اور سارے سخنور میرے

میرے افکار کی توہین نہ کیجئے تابشؔ
آپ تو لیں نہ حذف ریزوں سے گوہر میرے

کون سینچے گا اِسے اپنے لہو سے تابشؔ
خشک ہو جائے گی یہ کشتِ نوا میرے بعد

○

تدبیر سے ممکن نہیں عظمت بڑھ جائے
مقسوم نہ ہو تو کیسے عزت بڑھ جائے
خود ساختہ اربابِ سخن ناممکن
پنجوں پہ کھڑے ہونے سے قامت بڑھ جائے

○

بارِ حیات اُٹھائیے تنہا اُٹھائیے
یہ بوجھ آپ سے نہیں اُٹھتا اُٹھائیے!!

وحشت میں خاک اُڑانی ہی مقسوم ہے تو پھر
اِک مُشتِ خاک کیا سرِ صحرا اُٹھائیے

اِن خفتگانِ راہ کو ہمراہ لے چلیں
قدموں کے ساتھ نقشِ کفِ پا اُٹھائیے

خونبار کربِ دید کے منظر ہیں رُوبرو
اب جس طرف بھی چشمِ تماشا اُٹھائیے

بیمارِ عصر جلد شفایاب ہو سکیں
گہوارے سے اِک اور مسیحا اُٹھائیے

دُنیا سے زندگی کا بڑا حوصلہ ملا
احساں کی طرح ہر غمِ دُنیا اُٹھائیے

نادیدہ منظروں کو اگر چاہیں دیکھنا
اپنی ہی ذات سے کوئی پردہ اُٹھائیے

دل میں نفاذِ شوق کی طاقت کہاں سے لائیں
کُوزہ میں کیا تلاطمِ دریا اُٹھائیے

پامردیوں سے گذرے ہیں جو راہِ شوق میں
پلکوں سے اُن کی گردِ کفِ پا اُٹھائیے

تابشؔ سہارا لیجیے نہ اُمیّد و بیم کا
تنہا کبھی حجابِ تمنّا اُٹھائیے

○

پھر سطوتِ اسلام عطا ہو ہم کو
پھر عزّت و اکرام عطا ہو ہم کو
قائد سے ملے منزلِ تازہ کی نوید
جنّت سے بھی پیغام عطا ہو ہم کو

یہ مجھ سے کس طرح کی ضد دلِ برباد کرتا ہے
میں جس کو بھولنا چاہوں اُسی کو یاد کرتا ہے

قفس میں جس کے بازو شل ہوئے رزقِ اسیری سے
وہی صیدِ زبوں صیاد کو صیاد کرتا ہے

طریقے ظلم کے صیاد نے سارے بدل ڈالے
جو طائر اُڑ نہیں سکتا اُسے آزاد کرتا ہے

اُفق سے دیکھ کر رعنائیاں ہم خاک زادوں کی
زمیں بوسی کی کوشش چرخِ بے بنیاد کرتا ہے

تھپیڑے وقت کے کتنے سبق آموز ہوتے ہیں
زمانہ بھی تو کارِ سیلیٔ اُستاد کرتا ہے

ستم اہلِ جہاں کا حوصلہ دیتا ہے جینے کا
وہ بارِ غم اُٹھانے میں مری امداد کرتا ہے

کیا تھا خُلد میں ابلیس نے گمراہ آدم کو
اب آدم زاد کو گمراہ آدم زاد کرتا ہے

دلِ افسردہ میں جب ضعف سے کچھ بھی نہیں باقی
نشاطِ شوق کا مژدہ کسے پھر شاد کرتا ہے

وہ جوئے شیر ہو یا جوئے خوں دونوں برابر ہیں
کہ اِن دونوں کو جاری تیشۂ فرہاد کرتا ہے

دلِ ویراں میں تابش کیوں تمنائیں بساتے ہو
بڑے ناداں ہو صحرا بھی کوئی آباد کرتا ہے

زندگی مرگِ مسلسل ہے مگر اے تابش
ہائے وہ لوگ جو جینے کی دُعا دیتے ہیں

وائے محرومی کہ غربت بھی نہ راس آئی ہمیں
اپنی یہ غربت بھی گویا ہم وطن سے لائے ہیں

یاد اپنی اُڑانیں آئی ہیں
جب بھی کوئی شکستہ پر دیکھا

ہم نے حُسنِ ہزار منظر کو
کتنی نظروں سے اک نظر دیکھا

اب نمو پائیں گے دِلوں کے زخم
ہم نے اک پھول شاخ پر دیکھا

سب نہیں دیتے پھل مگر تابش
سایہ دار ایک اک شجر دیکھا

○

سب نے مجھ ہی کو در بدر دیکھا
بے گھری نے مرا ہی گھر دیکھا

بند آنکھوں سے دیکھ لی دنیا
ہم نے کیا کچھ نہ دیکھ کر، دیکھا

دُور تک لے گئی طلب اُس کی
نقشِ پا کو بھی رہ گذر دیکھا

خود بھی تصویر بن گئیں نظریں
ایک صورت کو اس قدر دیکھا

کہیں موجِ نمو رُکی تو نہیں
شاخ سے پھول توڑ کر دیکھا

○

ترا وصال تو کس کو نصیب ہے لیکن
ترے فراق کا عالم بھی کس نے دیکھا ہے

کھڑے جو پنجوں کے بل ہیں تابش بلند قامت نہ ہو سکیں گے
وہ اپنے سائے سے قد تو ناپیں جنہیں ہے دعویٰ قد آوری کا

○

نہیں حُسنِ طلب یہ برملا کیا؟
کہ تجھ سے مانگئے تیرے سوا کیا؟

تقدس جب نہ ہو رشتوں کا باقی
تو پھر نا آشنا کیا آشنا کیا!!

رہِ اُلفت پہ چل کر دیکھتے ہیں
دِلوں تک جائے گا یہ راستا کیا؟

وفا کا عہد توڑا، دل بھی توڑا
مُسلسل یہ "شکستِ ناروا" کیا!!

بہم پہنچائیں عشقِ بے نوا کو
متاعِ جاں، غمِ جاں کے سوا کیا!؟

کسی آشوبِ اُلفت سے نہیں کم
وفا یہ ہو! تو اندوہِ جفا کیا!!

دلِ افسردہ کی قسمت میں یارب!
نہیں ہے کوئی دردِ لا دوا کیا؟

رہِ جاں سے کبھی ہم تجھ تک نہ پہنچے
غلط اندازہ تھا یہ فاصلا کیا!؟

نہیں لاتی ہے بوئے دوست مجھ تک
شکستہ ہو گئے پائے صبا کیا؟

ہجومِ غم سے کیا دل کا تقابل؟
حریفِ بادِ صرصر اک دیا کیا!!

نہیں حُسنِ سماعت عام تابش
زباں پر لائیں حرفِ دلکشا کیا!؟

○

دیکھا ہجومِ حُسن تو ذوقِ جمال کو
ہم نے کہیں نگاہ کہیں دل بنا دیا

ابھی ہیں قُرب کے کچھ اور مرحلے باقی
کہ تجھ کو پا کے، ہمیں پھر تری تمنا ہے

وہ ناخدا جسے دعوے ہو ناخدائی کا
سفینہ سیلِ حوادث سے کیوں بچا کے چلے

جو اپنی راہ سلامت روی سے چلتے ہیں
زمانہ اُن کے قدم سے قدم ملا کے چلے

○

مزاجِ زیست کا ایک ایک رُخ دکھا کے چلے
ہم اپنی ذات سے سارے حجاب اٹھا کے چلے

ہمیں ہیں راستۂ شوق میں سُبک رفتار
چلے زمانہ تو ہم سے قدم مِلا کے چلے

نہ ہاتھ آیا کسی طرح وہ گُلِ خوبی
بہت تلاش میں ہمراہ ہم صبا کے چلے

قدم قدم پہ تھا ناکام حسرتوں کا ہجوم
اِسی ہجوم میں ہم راستہ بنا کے چلے

ملے گا تو بھی کہ اب تیرے ڈھونڈنے والے
تری تلاش میں اپنا سراغ پا کے چلے

نہ چھین لے کوئی اِس کو بھی اس لئے ہمدم
متاعِ درد زمانے سے ہم چھپا کے چلے

نوید ہو ترے شیدائی جانبِ مقتل
کفن بدوش چلے، خون میں نہا کے چلے

مگر سفینے فقط زعمِ ناخدائی سے
نہ چل سکیں گے مخالف اگر ہوا کے چلے

خدا کا شکر کہ ناکامیوں سے تابش کی
ہزار کام کسی بندۂ خدا کے چلے

○

رہے گا تشنہ جنوں ذوقِ آبلہ پا سے
چلا ہوں دشت کو سیراب کرنے دریا سے

سوزِ دل سے ملتی ہے اہلِ دل کو تابانی
جو جلائے جاتے ہیں وہ چراغ جلتے ہیں

○

تا سما تا بہ سمک[1] جاتا ہوں
مگر اب چلتا ہوں — تھک جاتا ہوں!!

زخمِ جاں ہے کہ گُلِ تر کوئی
ایک خوشبو سے مہک جاتا ہوں

عقل یا عشق ہے میری منزل
اِس دوراہے پہ بھٹک جاتا ہوں

ذات کا نشّہ الٰہی توبہ!!
دن میں سَو بار بہک جاتا ہوں

کوزہ ہوں چاک کا لیکن نازک
تیز گردش سے دَرک جاتا ہوں

ضربِ پیہم کی ضرورت کیوں ہو
ایک تھپکی میں ٹھمک جاتا ہوں

آتی جاتی ہیں جو کوئے جاں سے
اُن ہواؤں میں سُنک جاتا ہوں

کبھی دشنام گوارا تو کبھی
حرفِ سادہ سے چمک جاتا ہوں

تیرگی کیسی ہی یلغار کرے
شعلۂ جاں سے دمک جاتا ہوں

میں تو ہوں شاخِ ثمرور تابش
ٹوٹتا کم ہوں، لچک جاتا ہوں

---

[1] سمک ایک فرضی مچھلی جس پر زمین ٹکی ہوئی ہے (پاتال)

○

اہلِ چمن فریب نہ آزادیوں کے کھائیں
تنہا قفس میں مجھ کو گرفتار دیکھ کر

ذرا سی فرصتِ غم بھی بہت غنیمت ہے
تجھے میں یاد تو کر لوں کہ پھر بھلا دوں گا

خیال افروز کوئی لمحہ، کوئی دلکشا چہرہ !!
سوادِ جاں میں روشن اک نہ اک مہتاب رہتا ہے

○

یہ گھر سیلِ خرابی سے بھی کم اسباب رہتا ہے
کہ اکثر دیدۂ تر، صورتِ گرداب رہتا ہے

تنک آبی میں بھی ہوتا نہیں ہے تہہ کا اندازہ
کہ دریا پھر بھی دریا ہے اگر پایاب رہتا ہے

ہمارے دیدۂ تر میں اثر ہے ابرِ نیساں کا
صدف چشمی سے آنسو گوہرِ نایاب رہتا ہے

نہ جانے کونسی لذت کا طالب ہے، دلِ محزوں
حصولِ غم کی خاطر کس قدر بیتاب رہتا ہے

کبھی تو پا ہی لیں گے ہم اُسے تعبیر کی صورت
جو اِن بیدار آنکھوں کے لئے بھی خواب رہتا ہے

ہوائے غم میں پل کر خونِ حسرت سے نمو پا کر
نہالِ درد، کوئی فصل ہو شاداب رہتا ہے

کہاں تک یہ شکایت عشق کی سرکار سے کیجے
بقدرِ حاجتِ دل، غم بہت کمیاب رہتا ہے

نہ دیکھوں میں اُسے پھر بھی اُسی کو دیکھتا ہوں میں
نگاہوں میں وہی اک چہرۂ خوشتاب رہتا ہے

خداوندا! ہے اس بستی سے باہر بھی کوئی بستی؟
یہاں پیہم فسادِ منبر و محراب رہتا ہے !!

تیرے احباب بھی کرتے ہیں تابش تیری دلداری
تجھے بھی تو خیالِ خاطرِ احباب رہتا ہے

○

تعجب کیا جو آگے چل کے آشوبِ جہاں ٹھیریں
وہ ہنگامے جو تیری گرمیٔ محفل سے گزرے ہیں

شجر کو جوششِ نمو نے گل و ثمر بخشے
مری مُراد نے دستِ رسا دیا ہے مجھے

پاسِ ناموسِ وفا پھرے چلا ہے سوئے دوست
گرچہ ہے میرے لئے کوئے ملامت کوئے دوست

حُسن کی کن آرزوؤں سے رہا ہوں ہمکنار
میرے آغوشِ تصور میں ہے اب تک بوئے دوست

مبتلا رشکِ شہادت میں ہو دنیا شوق سے
آڑ میں خنجر کی ہم ہیں قوتِ بازوئے دوست

اک نہ اک خوابِ جنوں کا تذکرہ چھڑ جائے گا
طولِ محشر چاہتا ہے قصۂ گیسوئے دوست

غیرتِ رشکِ وفائے دشمن آخر کیا ہوئی
خالی خالی ہے مرے دل کی طرح پہلوئے دوست

سو گیا ہوں میں وُفورِ بندگی میں رکھ کے سر
آستانِ دوست ہے گویا مجھے زانوئے دوست

حُسن کو اپنے اسیروں کا تماشا چاہیئے
دیدۂ مشتاق ہے ہر حلقۂ گیسوئے دوست

دل میں اترے اور پیوستِ رگِ جاں ہو گئے
شعر ہیں تابش غزل کے یا کوئی ابروئے دوست

تہذیب کی منزل کے کڑے کوس ہیں تابش
رستے میں کوئی کوئے شرافت بھی نہیں ہے

عہدِ گُل گذرے بہت مدت ہوئی تابش مگر
زیرِ دیوارِ چمن اب تک کوئی دیوانہ ہے

○

شُد جہاں جلوہ گہہ شاہدِ زیبائے بہار
جلوہ ریز است بہ ہر سُو قدِ رعنائے بہار

ایں قدر ہست اثرِ حسنِ دل آرائے بہار
ہر صنم جلوہ دہد صورتِ لیلائے بہار

چاک در جیب و گریباں زدم آ دستِ جنوں
کرد دیوانہ مرا شورشِ سودائے بہار

میزنم نغمۂ مستانہ کہ در باغِ جہاں
بُلبلے نیست چو من والہ و شیدائے بہار

ہر سحر می دہد اے حسرتِ نظارۂ حسن
شبنم آئینہ، بہ معشوقِ خود آرائے بہار

دُوریٔ صحنِ چمن داد مرا ذوقِ نوا
شُد گلِ نغمۂ جاں، داغِ تمنائے بہار

دلِ صد داغِ غم و پیراہنِ صد چاکم شُد
حُسنِ پنہانِ چمن، جلوۂ پیدائے بہار

تا شود تکملۂ حسرتِ نظّارۂ حسن
چشم آئینہ دہد بابتِ رعنائے بہار

سخت ناپختہ شود جوشِ جُنونیم اگر
ما بہ ہر فصل نداریم تقاضائے بہار

شکر ایزد کہ پئے مرغِ چمن اے تابش
شُد گلِ ناز و طرب، داغِ تمنائے بہار

○

تابشؔ ہوسِ لذّتِ آزار کہاں تک
غم میں ہے مزہ، پھر بھی مرے یار کہاں تک

ساقی تو ہی رُوکے گا اِس گردشِ دوراں کو
آخر ترے ہاتھوں سے پیمانہ گزرتا ہے

ماں

اپنے ہمجولیوں میں کھیل کے بعد
جب بھی میں اپنی ماں کے پاس آتا
اپنی گہری شفیق نظروں سے
دیر تک میرا جائزہ لے کر
جذب کر کے گداز باہوں میں
وہ تھپک کر مجھے سُلا دیتی
یہ سمجھ کر کہ تھک گیا ہوں میں!
بارِ غم سے قدم بوجھل
ہر نفس میں شکست کی آواز
جاں میں آثار کربلاؤں کے
اس بھری کائنات میں تنہا
اپنے کندھے پر اپنی لاش اُٹھائے
جب بھی میں لوٹ کر گھر آتا ہوں
ماں کو اب منتظر نہیں پاتا
مگر آواز اُس کی آتی ہے
"میرے بچّے تو تھک گیا ہوگا!!!"

قصیدہ حضرت غالبؔ دہلوی

(صد سالہ جشنِ غالبؔ فروری سنہ ۱۹۶۹ء)

جب طلسمِ فکرِ بازی گر کھلا — چشمِ حیرت پر عجب منظر کھلا
حسنِ پنہانی سے تا حدِ نظر — بابِ نظارہ ہے سرتاسر کھلا
دشت و در میں سیم و زر کی سی نمود — یم بہ یم اک مخزنِ گوہر کھلا
ہے بصارت خیرگی، ساری فضا — ذرّہ ذرّہ ہے درِ خاور کھلا
اس طرح چلتی ہے بادِ برشگال — ہر طرف ہے نغمگی کا در کھلا
اس طرح آتی ہے پھولوں کی شمیم — ہر نفس ہے طبلۂ عنبر کھلا
مستیِ موسم سے مشکل ہے یہ فرق — گل کھلا شبنم سے یا ساغر کھلا
کس لئے یہ بارشِ جود و سخا — کیوں درِ انعام ہے ہم پر کھلا
کیوں ملا ہے ہدیۂ لطف و عطا — کس لئے دستِ کرم پرور کھلا
ہم نے لطفِ خاص کی دیکھی جو فال — "غالبؔ" اک نامِ سخن گستر کھلا
یہ اسی کے نام کی تاثیر ہے — فیض کا دروازہ جو کھل کر کھلا
جشنِ صد سالہ کو اس کے دیکھ کر — سب فریبِ فرِّ اسکندر کھلا
وہ اسد اللہ خاں غالبؔ کہ ہے — "جو ولی پوشیدہ اور کافر کھلا"
جس کے دیواں کے تمام اوراق میں — باغِ معنی کا پڑا ہے در کھلا
کعبۂ فکرِ جمیل ایک ایک نظم — نثر میں بت خانۂ آزر کھلا
فرشِ پا انداز جس کے نہ فلک — جس پہ ہے ہر رازِ ہفت اختر کھلا
تا ثریا ہے رسا جس کا خیال — فکر پر جس کی درِ بے در کھلا
جس کا دل ہے کاشفِ الہام و غیب — جس پہ ہے جبریلؑ کا شہپر کھلا
فیض سے اس کے غزل الیسی ستاول — سب کہیں اک گنجِ سیم و زر کھلا

غزل

بندِ غم مشکل سے مشکل تر کھلا
ہم سے جب کوئی پری پیکر کھلا

مل گئی وحشی کو سودا سے نجات
در کھلا دیوار میں یا سر کھلا

چالِ ساقی کے نئے انداز ہیں
ہاتھ میں غمزے کے ہے خنجر کھلا

میری وحشت نے نکالے جب سے پاؤں
ایک صحرا صحن کے اندر کھلا

دیکھنے میں وہ نگاہِ لطف تھی
کس سے پوچھیں زخمِ دل کیونکر کھلا

کوئی جادہ ہے نہ منزل ہے کوئی
سب فریبِ راہی و رہبر کھلا

ہے قیامت اس کی مژگاں کا خیال
رکھ دیا ہے دل میں اک نشتر کھلا

یہ زلیخائی! کہ یوسف کے لئے
مصر کا بازار ہے گھر گھر کھلا

ناامیدی سے بندھی تابشؔ امید
ابرِ غم دل پر بہت گھر کر کھلا

پھر ہوا اس کی ثنا خوانی کا شوق
پھر علوِ فکر کا جوہر کھلا

اس پہ ہر رمزِ نہفتہ واشگاف
اس سے ہر عقدہ کھلا بہتر کھلا

اس کی ہر تخیل جنت آفریں
ذہن اس کا صورتِ کوثر کھلا

ہر دقیقہ کس قدر جدت طراز
ہر لطیفہ کتنا کیف آور کھلا

ہر اشارہ داستاں در داستاں
ہر کنائے میں ہے اک دفتر کھلا

خامشی میں اس کی واعقدِ خرد
اس کی باتوں سے دلِ مضطر کھلا

خوشہ چیں ہم بھی اسی خرمن کے ہیں
ہے اُسی کے فیض کا لنگر کھلا

اہلِ دل کی فیضیابی کے لئے
رکھیو یارب اس کو تا محشر کھلا

عورت

نغمے کی طرح زبانِ احساس — خوشبو کی طرح متاعِ انفاس
یک میکدہ سرخوشی سراسر — یک بوستاں تازگی برابر
تصویرِ خیال، نقشِ جذبات — رنگینیِ رنگ، روحِ نغمات
رازوں کی طرح سدا نہفتہ — غنچوں کی طرح بہت شگفتہ
بھٹکے ہوئے راہرو کا صحرا — لبِ تشنہ کو ایک موجِ دریا
اک قفلِ حروف کی طرح بند — آزاد کسی ہرن کے مانند
پھیلے تو مثالِ دامنِ ہوش — سمٹے تو بہت ہی تنگ آغوش
دوشیزہ، مثالِ حورِ جنّت — آوارگی میں شمیم و نکہت
شبنم کی مثال پاک دامن — شعلے کی طرح حریفِ خرمن
پندارِ وفا میں کوہِ الوند — ناموسِ حیا میں خاک پیوند
ہر ولولہ دل کا اک چھلاوا — ہر جذبۂ شوق اِک بُلاوا
اِک موجۂ بادِ صبحگاہی — اِک سیلِ خرابی و تباہی
مخلوق مگر حریفِ خلّاق — محدود مگر محیطِ آفاق

خود دہر میں دلکشی نہیں ہے
یہ صنعتِ لطیف سے حسیں ہے

پھول

(جامعہ کراچی کے طلبا کی فرمائش پر فی البدیہہ کہی گئی)

قدرت کا کرشمہ عجب ہوں — میں پھول ہوں گلستاں نسب ہوں
مٹی سے ہوئی کشود میری — صرف ایک ہنسی نمود میری
شبنم، مری لذتِ زباں ہے — ہر موجِ نسیم، میری جاں ہے
آغوشِ طرب مجھے بہاریں — گہوارہ ہیں میرا شاخساریں
جھونکوں میں ہوا کے جھولتا ہوں — میں نور سے پھلتا پھولتا ہوں
کہسار بہت بساتے میں نے — صحرا میں بھی گل کھلائے میں نے
اک غلغلہ مجھ سے باغ میں ہے — اک ہمہمہ مجھ سے راغ میں ہے
سورج مرے حسن کا پیامی — مہتاب سے میری ہمکلامی
ہر صبح، مجھے نکھارتی ہے — ہر رات، مجھے سنوارتی ہے
دن میں مرے روشنی کے لمحات — راتیں ہیں مری، طلسمِ ظلمات
خوشبو ہے مرے نفس کا آہنگ — رگ رگ میں ہے میری گردشِ رنگ
بھونروں کو حیات بخشتا ہوں — تلخی کو نبات بخشتا ہوں
کر دیتا ہوں تتلیاں حسیں میں — دیتا ہوں مگس کو انگبیں میں
بلبل ہے نوا طراز مجھ سے — ہر سوز ہوا ہے ساز مجھ سے
رنگیں کفِ گل فروش مجھ سے — گلچیں بھی ہے لالہ پوش مجھ سے
ہیں خار بھی میرے قابلِ داد — رکھتے ہیں جو دسترس سے آزاد
ہر خار ہے دردمند میرا — حسن اس سے ہوا دوچند میرا
تشبیہ ہے مجھ سے مہوشوں کو — تمثیل ہے مجھ سے دلبروں کو
عشاق بھی کرتے ہیں مجھے پیار — معشوق بھی ہیں مرے پرستار
میں رونقِ ہجرِ خستہ جاں ہوں — میں زینتِ وصلِ مہرخاں ہوں
کہتا ہوں حسین داستانیں — قدرت سے ملی ہیں سو زبانیں
افسونِ سخن، مرے بیاں ہیں — مضمون مرے شاعری کی جاں ہیں
رنگین کیا بیاں کو میں نے — الفاظ دیے زباں کو میں نے
گل ابر و گلابی و گل افشاں — گل چہرہ و گلبن و گلستاں
گلبرگ و گلابی و گلالہ — گل چاندنی اور گل پیالہ
گلگونہ و گل شگفتہ و گلفام — یہ ساری صفات ہیں مرے نام
ہے زندگی میری اک تحیر — موسم مرے حسن کا تغیر

ہے میری فنا بقائے گلشن
میں کچھ بھی نہیں سوائے گلشن

ایک جن ایک آدمی

(جنگجو اقوامِ عالم کے نام)

سُنا ہے یہ پریاں یہ جنّات ہیں قاف کے رہنے والے!
وہی قاف ——
جس کی زمیں ہے زمرّد کی نیلم کے ہفت آسماں ہیں
جہاں کی فضاؤں میں ہیں لعل و مرجاں کے طائر پرافشاں
ہوائیں ترنم فروش اور نغمہ زباں ہیں
بہت دُور تک سیم و زر کے پہاڑوں کا اک سلسلہ ہے
بیاباں ہیں کُندن کے پُکھراج کی وادیاں ہیں
درختوں میں لگتے ہیں ہر روز زرّیں خُوشے
مے و انگبیں کے بھی چشمے رواں ہیں
کِھلا کرتے ہیں پھول دن رات —— شاداب چہروں کی صورت

جہاں سرو و شمشاد کی شکل میں نوجواں ہیں
جہاں شہر در شہر بستے ہیں زرّیں قبا و سمن بر
بہت خوش جمالوں کی آبادیاں ہیں جہاں ——
جہاں دشت در دشت انجم و مہہ و مہر بکھرے پڑے ہیں —— جہاں
گہرہائے نایاب سیلِ رواں یم بہ یم ہیں
وہاں موت کوئی تصوّر نہیں شعبۂ زندگی کا
حیاتِ ابد —— راحتِ جاوداں لمحہ لمحہ —— مگر
اس طلسمِ طرب تک پہنچنا کچھ آساں نہیں ہے
بہت دشت و در درمیاں ہیں!!!
یہ سارا علاقہ ہے زیرِ نگیں ایک سردارِ جن کا اور اک اک قدم پہ ——
ہزاروں طلسم و فسوں پاسباں ہیں!!
مگر ایک طوطے میں اِس جن کی جاں ہے مقیّد
یہ طوطا ہے موتی محل میں اور اس راستے میں ——
بہت موت کی گھاٹیاں ہیں —— بہت کوہ و دریا!!
مگر آدمی نے تدبّر کے ہاتھوں اُسے مار ڈالا
کہاں ہیں وہ پریاں وہ جن —— وہ طلسم و فسوں اب کہاں ہیں!!؟
جنوں سے یہ انسان کتنا بڑا ہے!!
——مگر اس زمیں پر جہاں زندگی ہے کہ بکھری پڑی ہے
ہزاروں طلسمات اک اک قدم پر عیاں ہیں نہاں ہیں
کہیں خُود ستائی میں تقدیسِ عمرِ ابد ہے کہیں سالِ خُوردہ نہال و سُمکاں آفرینش نشاں ہیں

کبھی ہر نظر غربِ ماہِ مبیں، شرقِ مہرِ منوّر
کبھی چرخِ افکار و عرشِ تصوّر، یہی قلب و جاں ہیں
خِرد کے لئے قطرہ قطرہ ہے نارفتہ طوفاں
جُنوں کے لئے پھول ہے ناشگفتہ گلستاں
کبھی اک گلِ نغمہ فردوسِ راحت ہوا ہے
کبھی حرفِ شیریں میں سو لذّتیں دو جہاں کی
کبھی دسترس میں ہیں لاکھوں طلسمی جزیرے
کہیں دور ـــــ رنگیں خیالات کی بستیاں ہیں
کبھی اک تبسم میں ہیں زعفراں زار پیہم شگفتہ
خرابات کی وادیاں اک ترنّم سے پیدا
کہیں ایک منظر یہ ہے منحصر حُسن جلوہ گری کا
کبھی اک تجلّی ـــــ جہاں در جہاں ہے
غرض سارے آفاق کی وسعتیں گم ہیں اس آدمی میں
بہت بیکراں یہ دل و جاں کی پنہائیاں ہیں ـــــ بہت بیکراں!!
یہ جن تو نہیں ہے ـــ اسے مار دنیا کچھ آساں نہیں ہے
یہاں تک رسائی ہے مشکل ـــــ دو عالم یہاں درمیاں ہیں!!
جنوں سے یہ انسان کتنا بڑا ہے ـــــ یہ کمزور انسان!!

خلدِ بازیافتہ — پاکستان

قدسیو عظمتِ آدم کے ترانے گاؤ !!
آج پھر بارگہِ قدس کا مردود انسان
شورشِ دہر ہوا جس کے عناصر کا خمیر
جس پہ تہمت رہی بے حرمتیٔ خلدِ بریں
عرشِ اعظم پہ کیا جس کو فرشتوں نے حقیر
جس کا مقسوم ہے بیتابیٔ دل سوزِ حیات
جبرِ ہستی ہے فقط جس کی متاعِ تقدیر
دونوں عالم کے علاوہ جسے بخشش میں ملے
نارسا فکر و دلِ خستہ و بیدار ضمیر
اپنی تکوین کی عظمت پہ ہوا ہے نازاں !!

آج وہ بارگہِ قدس میں مردود نہیں
خطۂ پاک جو آباد کیا ہے — کہ جو ہے
غیرتِ باغِ ارم، رشکِ فردوسِ بریں
بارشِ انوار کی جاری ہے فلک سے پیہم
فصل کوئی ہو زر و سیم اگلتی ہے زمیں
مرمر اجسام ہیں غیرت دہ حور و غلماں
رشکِ تسنیم ہے ہر چشمۂ آبِ شیریں
خاک میں اس کی ہے وہ جوشِ نمو کا عالم
موسمِ گل کے علاوہ کوئی موسم ہی نہیں
کر لیا جنتِ گم گشتہ کو حاصل اس نے
قدسیو عظمتِ آدم کے ترانے گاؤ !!

اپنی پوتی نمیر سعود تابش کی ولادت کے موقع پر

شکرِ ربِ ذوالجمال
کر دیا ہم کو نہال
پھول سارے کھِل گئے
رنگ و بو میں مل گئے

آئی گلشن میں بہار
اور آئی پہلی بار
باغ کا اک اک نہال
موسمِ گل کا جمال

تازہ ہے نخلِ امید
پائی بہجت کی نوید
یہ کلی ہے خوش خمیر
نام ہے اس کا نمیر

شاخِ جاں پر اک کلی
مسکرا کر کھِل گئی
خوش ہیں شیریں اور سعود
ہے نمیر ان کا وجود

یہ شگفتہ سی کلی
باغ کی ہے زندگی
پھوپیاں ہوں کیوں نہ شاد
دیں دعائیں جو ہیں یاد

باغ میں جس کی مہک
پھیلتی ہے دور تک
تابش و محمودہ بھی
ہیں غریقِ سرخوشی

بوٹا بوٹا باغ کا
اس کی خوشبو میں بسا
اب دعا یہ ہو قبول
ہوں شگفتہ اس سے پھول

ہائیکو

(جاپانی صنفِ سخن)

انتقام

۱۔ سورج کا یہ رُوپ
جھلس گیا ہے سایہ
تیز ہے کتنی دھوپ!!

تصویر

۲ کوئی آیا تھا
چھوڑ گیا دریا میں چاند
کس کا سایہ تھا!!

بدلا موسم

۳۔ ساون کے جھُولے
پینگیں لینے میں ہم تُم
کس کس کو بھُولے!!

جُدائی

۴۔ کوئی آس نہ پاس
ریل کی سیٹی چھُوڑ گئی
تنہا اک احساس!!

اِختلاف

میل نہیں باہم
پھر بھی ملتے جلتے ہیں
موتی اور شبنم!!

بصیرت

سُورج کیسا ہے
نابینا درویش کہے
رُوئی جیسا ہے!!

حرکت

قائم ایک اصُول
موجِ نمو کی جاری ہے
تُوڑو کوئی پھول!!

سہارا

بادل کا ٹکڑا
سر سے گذرا ہے جیسے
طائر کا سایا!!

تضاد

جگنو چمکا ہے
اس کے بعد فضاؤں میں
اور اندھیرا ہے!!

تجسّس

کچھ مڑ کر بھی دیکھ
دیدہ ور کہلاتا ہے
پس منظر بھی دیکھ!!

نمو

یہ قوت یہ بل
زمیں توڑ کر نکلی ہے
یہ کمزور کونپل!!

تعمیر

جو گُل کرتی ہے
شمع کو ـــ وہی ہوا تو
روشن رکھتی ہے!!

سرقہ

کتنی شوخ و شنگ
پھولوں سے لے اُڑتی ہے
تتلی سارے رنگ!!

مقابلہ

بپھری ہوا ہے
بپھری ہوا سے شاخ پہ لرزاں
اک گھونسلا ہے!!

وفا

یہ اہلِ دُنیا
کیوں بے وفا ہیں؟ میں سوچتا ہوں
مگر میرا کیا!!

قناعت

رزق کا دینے والا
کوئی جگہ ہو پل میں بہم کر دیتا ہے
اک مکھی اک جالا!!

سناٹا

گھر کی چھت ٹپکتی ہے
بوند کی دھمک سے ہے بام و در میں اک لرزش
کیسا ہے یہ سناٹا کیسی یہ خموشی ہے!!

وہم

یہ نمود کیسی تھی؟
شاخ پر نہیں کچھ بھی رنگ اڑ گئے سارے
پھول تھا کہ تتلی تھی!!

(یہ ہائیکو مقررہ بحر میں نہیں ہیں)

ھائیکو۔ طبع زاد

امکان

ایک دن وہ آئے گا
آسماں تو روشن ہے زرد چاند سے لیکن
وہ بھی ڈوب جائے گا!!

(طبع زاد)

وحدت

زندگی کی یہ سج دھج!
اک تضاد کے باوصف کتنے ہم شباہت ہیں
ایک بوند اک سورج!!

کربِ نمو

شاخ پر گلِ تازہ
کِھلتا ہے بکھرتا ہے کھلتا ہے بکھرتا ہے
یہ نمو کا خمیازہ!!

اندیشہ

سرِ بحرِ ظلمات!
قرصِ خورشید نگل جائے گی کوئی مچھلی
دن بھی ہو جائیں گے رات!!

زندگی

پھول توڑ کر توڑا
رشتۂ نمو ہم نے
باغ بھی کب چھوڑا!!

توانائی

رقصاں مست ہوا
گلشن سارا جاگ اٹھا
شاید پھول کِھلا!!

منظر

ساون دھاروں دھار
کویل، مور، پپیہے سے
بن گونجے چہکار!!

(مقررہ بحر کے مطابق)

عبرت

اندھے ہو گئے ہو کیا؟
دیکھ کر نہیں چلتے خشمگیں نگاہوں سے میں نے جب اسے دیکھا
واقعی وہ اندھا تھا!!

فراق

تتلیوں کی رُت آئی
پھول پھول مسکایا شاخ شاخ لہرائی
میں ہوں اور تنہائی!

زندگی

ہاتھ میں ڈالے ہاتھ
اِک لمبی پگڈنڈی پہ رواں ہیں
اِک بوڑھا اِک بچہ ساتھ!!

وصال

۱۔ یہ شبنمی رات
ہر رُخ کی ہوا خنک خنک ہے
کون ہے ساتھ؟

ایک احساس

۲۔ سحر کا جوشِ نمو
خنک فضا میں ہوا سے لچکتی شاخوں پر
پھول — منجمد خوشبو!

انجام

۳۔ میں نے صبح دم دیکھا
افق پہ ایک ستارے کو جھلملاتا ہوا
اشک آنکھ سے ٹپکا!

لله

(غزل)

خرمنِ جاں یا خرمنِ ہستی کس سے یہ وابستہ ہے — سوزِ دروں سے اپنا اک اک سانس شرارِ جستہ ہے

رنگ برنگے رنگ ہیں تیرے حسن سے یہ پیوستہ ہے — گنجِ چمن میں پتی لیا ہے خود بھی اک گلدستہ ہے

ہم تو ذریعہ جانتے ہیں مقصد کو حصولِ مقصد کا — اہلِ طلب کے مسلک میں تو منزل بھی اک رستہ ہے

ذوقِ اسیری بھایا ہے اس درجہ اسیروں کو صیاد — کوئی نہیں پرواز آمادہ گرچہ دامِ شکستہ ہے

قائم تو ہے سلسلۂ درد آلودۂ آہ سے بھی — کہنے کو رودادِ محبت اپنی جستہ جستہ ہے

قیدِ غم سے ہو بھی چکے ہیں کب کے وہ قیدی آزاد — اتنا حسن کا شورِ سلاسل زنداں میں پابستہ ہے

عشرتِ منزل و منزل سے آسودہ ہوں تو کیونکر ہوں — راہنما بھی نا آمادہ پائے طلب بھی خستہ ہے

تیرا یہ اظہارِ رعونت کم نہیں عجز نخوت سے — دیکھو اکڑ اکڑ کر چلنے والے سامنے سے قد پستہ ہے

دلکش دلکش لفظ و معنی بحر نہایت خوش آہنگ
تاباںؔ تیری تازہ غزل کا ہر مصرع برجستہ ہے

تاباںؔ دہلوی

نقد و نظر

حضرت تابش دہلوی نے نہ صرف زبان کی حیثیت سے بلکہ موضوع کے اعتبار سے بھی اردو ادب کی قدر و قیمت میں اضافہ کیا ہے' اگرچہ کہنے کو آپ کا دائرہ کار تغزل تک محدود نظر آتا ہے مگر اس تغزل میں آپ نے فلسفۂ حیات اور انسانی برادری سے تعلق رکھنے والے صدہا مسائل کو موضوع کلام بنایا ہے اور لطف یہ ہے کہ زندگی کی ان باتوں کو ایسے اسلوب سے لفظوں کا جامہ پہنایا کہ کسی جگہ یہ محسوس نہیں ہوتا کہ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں' وہ غزل سے ہٹ کر کوئی اور چیز ہے آپ کے کلام میں دہلی کے ہر مکتبۂ فکر کی بڑی گہری چھاپ ہے جو غالب سے شروع ہوتا ہے' اور اس کے ساتھ ہی وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جو دہلی کے اساتذہ سے مختص ہیں' بیان کی پختگی' بندش کی چستی' لفظوں کا صحیح استعمال' روزمرہ محاورے کی چاشنی' فکر کی گہرائی اور گیرائی' غرض کہ تمام وہ محاسن آپ کے کلام میں موجود ہیں جو ایک ماہر فن استاد اور ایک خوش بیان شاعر کے ہاں ہونا چاہیئے۔ وہ وارداتِ عشق کو اس طرح پیش کرتے ہیں:

کوئی تمنا پاس نہیں ہے کوئی تصور ساتھ نہیں — کیسے کٹے گی یہ شب ہجراں آج اکیلے شام سے ہیں
ابھی ہیں قرب کے کچھ اور مرحلے باقی — کہ تجھ کو پاکے ہمیں پھر تری تمنا ہے
تو مل گیا ہے مگر شوق کے مراحل ہیں — تری تلاش تری جستجو تو اب بھی ہے
ہم نے اس حسرت تماشا میں — نام جلووں کا بھی نظر رکھا
ترے حجاب و تجلی کے درمیاں اے دوست — بہت مقام نظر ہیں مری نظر کے لئے

تابش صاحب کے کلام کا اگر بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے تو اس میں موجودہ دور کے حالات و کیفیات کا پرتو غزل کی بھرپور رمزیت میں ملے گا جو قدم قدم پر معاشرے کو دعوتِ فکر دیتا ہے۔

نسیم امروہوی

صہبا لکھنوی مدیر افکار کراچی

انکشافِ ذات

پیدائش: ۹ نومبر ۱۹۱۱ء **بمقام:** دہلی

خاندانی نام سید مسعود احسن ہے۔ ابتدائی تعلیم بترتیب دہلی اور حیدرآباد دکن میں ہوئی۔ عربی و فارسی کی تعلیم دلّی کے ایک صوفی بزرگ منشی شیودیال سے حاصل کی حتیٰ کہ قرآن مجید بھی انہیں سے پڑھا۔ منشی شیودیال غیر معمولی صلاحیت کے مالک اور اخلاق و شرافت کے پیکر تھے۔ اُن کے فیض نے ہی عربی و فارسی کے مطالعے اور اردو شاعری کے ذوق کو پروان چڑھایا۔ میٹرک کے بعد آپ خانگی حالات کے سبب سلسلۂ تعلیم کو مزید جاری نہ رکھ سکے اور سنہ ۱۹۴۱ء میں آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت کرلی۔ سنہ ۴۸ء میں پاکستان آئے اور ریڈیو پاکستان کراچی کے نیوز سیکشن سے وابستہ ہوگئے۔ آپ ۴۱ء سے ۶۳ء یعنی ۲۳ سال تک مسلسل اردو کی خبریں نشر کرتے رہے۔ اس دوران میں آپ نے بے شمار مشاعرے بھی ریلے کئے۔ پہلا مشاعرہ جسے آپ نے آل انڈیا ریڈیو سے ریلے کیا [illegible] کا وہ تاریخی مشاعرہ تھا جس میں ایک دو کے تقریباً تمام مشاہیر شعرا شریک تھے

آپ کو مطالعہ اور علم کا شوق شروع ہی سے تھا اور یہی وجہ ہے کہ گھر اور ملازمت کی ذمہ داریوں میں گھِر کر بھی آپ نے تعلیم جاری رکھی اور [illegible] کے ۲۴ سال بعد ۵۸ء میں کراچی یونیورسٹی سے بی۔ اے کیا۔ آج کل آپ ریڈیو پاکستان کے شعبۂ تعلیم سے وابستہ ہیں

تابش صاحب کے دادا نظام الدین صاحب نظامی فارسی کے مستند ادیب و شاعر تھے۔ ان کی دو قلمی تصانیف [illegible] آپ کے پاس محفوظ ہیں۔ نظامی صاحب غالب کے ہمعصر شاعر شیفتہ کے عزیز دوستوں میں تھے آپ کے والد فیض حسن صاحب بھی شعر و ادب سے دلچسپی رکھتے تھے اور محسن کاکوروی سے ان کے گہرے دوستانہ روابط تھے۔

آپ کے پرنانا شمس العلماء منشی ذکاء اللہ اور نانا مولوی عنایت اللہ صاحب ناظم دارالترجمہ حیدرآباد دکن کی شخصیتیں اردو ادب میں کسی تعارف کی محتاج نہیں

تابش صاحب کی پہلی شادی ۱۹۳۳ء میں ہوئی۔ ۴۶ء میں بیوی کا انتقال ہوگیا۔ دوسری شادی نواب افضل یار خاں کی صاحبزادی سے ہوئی۔ افضل یار خاں صاحب کے خسر حکیم احسن اللہ خاں اور ان کے ماموں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ تھے۔ اردو کے عظیم شاعر غالب آپ کی موجودہ رفیقۂ حیات کے خالو

ان حقائق کی روشنی میں یہ کہنا غلط نہیں کہ ددھیال' ننھیال اور سسرال تینوں سلسلوں سے آپ کو علم و ادب' اور شعر و سخن کی عظیم روایات ورثہ میں ملیں۔

اپنے نانا مولوی عنایت اللہ ناظم دارالترجمہ حیدرآباد دکن کے ساتھ آپ پندرہ برس حیدرآباد میں مقیم رہے' ادبی و شعری ذوق کی تربیت تمام تر یہیں ہوئی اور یہیں آپ نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ حیدرآباد میں نانا کی وجہ سے نظم طباطبائی' امجد حیدرآبادی' فانی' مرزا فرحت اللہ بیگ، عبداللہ العمادی' مرزا یگانہ اور وحیدالدین سلیم جیسے جلیل القدر مشاہیر کی صحبتوں سے استفادہ کیا۔ ۲۰ برس کی عمر (۱۹۲۶ء) میں آپ نے پہلا شعر کہا:

کہاں کہاں مجھے مستور لوگ ڈھونڈ آئے
بھلا میں اُس کی گلی کے سوا کہاں ہوتا

۱۹۳۱ء میں آپ کی پہلی نظم 'دلی' کے عنوان سے ماہنامہ 'ساقی' دہلی میں شائع ہوئی جسے پڑھ کر میر ناصر علی مرحوم نے 'ساقی' کے ایڈیٹر شاہد احمد دہلوی سے کہا انشاء اللہ یہ بچہ کبھی بڑا شاعر بنے گا۔ شاعری کے علاوہ آپ ادبی و تنقیدی مضامین بھی لکھتے رہے ہیں۔ پہلا مضمون یاد ایام صحبت فانی کے زیر عنوان ماہنامہ "برہان" دہلی میں شائع ہو کر خاصا پسند کیا گیا۔ یہ مضمون فانی کے ذاتی حالات پر مشتمل تھا اس کے علاوہ آپ کے متعدد مضامین 'ساقی' 'آج کل' "علی گڑھ میگزین" وغیرہ میں شامل ہو کر کافی مقبول ہوئے۔ اس دوران میں آپ غزلیں' نظمیں اور گیت بھی برابر لکھتے رہے۔

تابش صاحب کے کلام میں حزن و یاس کا عنصر غالب ہے۔ ایک سوال کے جواب میں آپ نے وضاحتاً بتایا کہ ان کے اشعار میں یہ رنگ مخصوص خاندانی حالات کا نتیجہ ہے۔ مگر اس سے قطع نظر اس ضمن میں ان کا نظریہ بھی یہی ہے۔ "اگر آرٹ اور فن کا اعلیٰ شعور موجود ہو تو فن کار مغموم ہی رہتا ہے"۔

تابش صاحب اردو میں جن شعراء سے متاثر ہوئے ان میں مرزا مظہر جانِ جاناں' میر تقی میر' انعام اللہ خاں یقین' غالب' مومن' یگانہ' فانی' جوش اور اقبال کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ فارسی شعراء میں آپ کو عرفی' بیدل' خسرو اور غالب پسند ہیں۔ فراق گورکھپوری آپ کے نزدیک موجودہ دور کے سب سے بڑے نقاد ہیں۔

اپنا ادبی نقطۂ نظر بیان کرتے ہوئے آپ نے کہا۔

"اردو ادب پر آج سے زیادہ نازک دور کبھی نہیں آیا۔ اس لئے کہ یہ ایسے شاعروں کا دور ہے جو فن و شعور اور علم و مطالعہ سے قطعاً تہی دامن ہیں۔ مجھے فن شعر و ادب کے ارتقا یا شاعری کے فروغ سے اختلاف نہیں۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ آج کا شاعر مطالعہ اور علم کے حصول سے بالکل دلچسپی نہیں رکھتا' اور یہی وجہ ہے کہ اس کی تخلیقات میں فکر و فن اور زبان و بیان کی بے شمار خامیاں نظر آتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ عام رجحان نہ صرف اردو شاعری کے لئے بلکہ نثری ادب کے لئے بھی مضرت رساں ہے"۔

آپ کا پہلا مجموعۂ کلام "نیمروز" گزشتہ دنوں شائع ہو کر ادبی و علمی حلقوں میں کافی پسند کیا گیا ہے' اس کے علاوہ نظموں اور غزلوں کے دو اور مجموعے زیر ترتیب ہیں۔

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی

نیمروز کا شاعر

یہ اس دَور کے غزل گو حضرت تابش دہلوی کی غزلیات کا مجموعہ ہے۔ شروع میں تابش صاحب کا خود کا لکھا ہوا دیباچہ "حرفِ اوّل" کی سُرخی کے ماتحت ہے جسے غزل پر تنقید کے سلسلے میں اہم اضافہ کہنا چاہیئے۔ اس میں غزل کا ایک سچا فن کار اپنی مقبول صنف کی جدید دَور میں اہمیت کو نہایت سیدھے اور پُر زور طریقہ پر جتاتا ہے۔ کچھ عرصے سے ہمارے یہاں غزل کو فرسودہ صنفِ سخن کہا جانے لگا تھا۔ مگر تابش صاحب یہ ثابت کرتے ہیں کہ یہ صنف زمان و مکان سے بالاتر ہے، اس لئے آفاقی ہے اور جدید زندگی کے تقاضوں کو بھی پورا کر سکتی ہے۔ ان کی غزلیات کا مجموعہ ان کے اس نظریہ کی مثال ہے۔ اور عملاً یہ ثابت کرتا ہے کہ غزل ہیئت کے اعتبار سے قدیم ہی نہیں قدیم تر ہے مگر اسلوب اور تاثر کے اعتبار سے جدید بلکہ جدید تر ہے۔ "حرفِ اوّل" کے بعد ادریس صدیقی صاحب کا "جائزہ" ہے جو تابش صاحب کی سیرت اور ہستی پر خاص روشنی ڈالتا ہے۔ اور ان کی شرافت، ذہانت اور وضع داری کی روشنی میں ان کی غزل گوئی کا جائزہ لیتا ہے۔ یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ تابش صاحب ہمارے ان شاعروں میں ہیں جنہوں نے اپنی انفرادیت کو طرزِ فکر اور طرزِ ادا کے ذریعے ہمیشہ کے لئے اردو ادب پر ثبت کر دیا۔ اس "جائزہ" میں تابش صاحب کے مجموعۂ غزلیات کو اس پہلو سے دیکھا گیا ہے جس سے تابش صاحب خود نہیں دیکھ سکتے تھے۔

غرض ان تعارفی مضامین سے ہمیں زیرِ نظر مجموعۂ غزلیات کو تین خاص پہلوؤں سے دیکھنے کا راستہ مل جاتا ہے۔ اوّل یہ کہ یہ غزلیں صنفِ غزل کی دائمی روایات کی نہایت صحیح اور زوردار مثالیں ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان میں غزل کو وہ جدید اسلوب دیا گیا ہے جس کے بغیر ہماری غزل فرسودہ معلوم ہونے لگی تھی۔ اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ سچا شاعر روایات کے رُخ کو زمانے کے تقاضے کے موافق کس طرح موڑ سکتا ہے۔ تیسرے یہ کہ روایت اور بغاوت دونوں سے بالاتر جا کر اور دونوں کو اپنے مزاج کے موافق ملا کر تابش صاحب نے انفرادیت کا وہ درجہ حاصل کر لیا ہے کہ ان کی شاعری سب سے الگ اور اچھوتی اور منفرد شاعرانہ صفات کی حامل نظر آتی ہے حقیقت یہ ہے کہ تابش صاحب کی غزلیں جس کمال کے ساتھ ان کی انفرادیت کی آئینہ دار ہیں وہ اس دَور کے کم شاعروں کے حق میں آیا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ ایسی صحبتوں میں اب تک رہے ہیں جن کو ہماری تہذیب کا بہترین نمونہ کہنا چاہیئے۔ اور ان کی شاعری بھی تہذیب یافتہ ادب کی بہترین مثال ہے۔ صحت، متانت، توازن، نفاست اس کی وہ صفات ہیں جو سب میں پہلے ہمیں متاثر کرتی ہیں۔ یہاں ہمیں فطری زور بر طبع اس قاعدے سے قدرتی طور پر لگا ہوا نظر آتا ہے جو تہذیب میں پورے طور پر رچ جانے ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ غزل غنائی شاعری ہے

اور جذبات کی فراوانی اور طرز کی بے پناہ آمد اس کی نمایاں ترین خصوصیات ہونا چاہیئے۔ مگر تہذیب کے ارتقا کے ساتھ فن کاری کی بوقلمونی ان صفات پر ایک توازن عائد کئے بغیر اور ان میں باریکیاں پیدا کئے بغیر نہیں رہتی۔ اسی بات کو تابش صاحب نے اپنے "حرفِ اوّل" میں یوں کہا ہے: "وہ لوگ جو فن (آرٹ) کو وجدانی اور محض وجدانی سمجھتے ہیں آرٹسٹ اور آرٹ کے عوامل سے ناآشنا ہیں۔ میرے نزدیک فن (آرٹ) آمد اور آورد کی مجموعی صورت ہے ـــــ دوسرے الفاظ میں یوں کہیئے کہ آرٹسٹ کا تخلیقی تصور آمد ہے اور اس کی تخلیقی دنیا آورد۔" تابش صاحب کی شاعری روایت اور بغاوت کو ہم آہنگ کرکے اس انفرادی راہ پر چلتی نظر آتی ہے۔

ادریس صاحب نے جدید دور کے اہم ترین متغزلین کا ذکر کرکے تابش صاحب کا رشتہ فانی بدایونی سے جوڑا ہے۔ اور دونوں کے کلام کی مناسبت کو نمایاں کیا ہے۔ تاریخی پس منظر میں تابش صاحب کو یہی مقام دیا جاسکتا ہے۔ مگر ہمیں ان کی غزلوں میں دوسروں کی پیروی سے زیادہ ان کی اپنی باور خیالی نے زیادہ متاثر کیا۔ غنائی شاعری عام طور پر اور اس میں صنفِ غزل صاف طور پر شاعری کو موسیقی سے قریب ترین لے آئی ہے۔ غزل کا ہر شعر دشاعر ایک نیا راگ جگاتا ہے۔ تابش صاحب کی غزلیں بھی ایک ایسا نیا راگ سامنے لاتی ہیں جو ان کے فطری جذبات، ان کی تہذیب اور ان کے فن کارانہ شعور کو ملا جلا کر ایک نئی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ وہ اپنی انفرادیت کو اس قسم کے اشعار میں ادا کرتے ہیں جیسے ؎

ہم ہوش و بے خودی کو سموئے ہوئے سے ہیں
اس انجمن میں ہیں بھی تو کھوئے ہوئے سے ہیں

مگر وہ راگ جو اس شعر میں بھی اور ان کے تمام اشعار میں نہایت ہمواری کے ساتھ زندہ ہے ان اشعار میں چونکا دینے والی صورت اختیار کرلیتا ہے۔

جنوں کی چاکِ جگر ہم کو یادگار بہت ہے — نہیں بہار، نہ ہو حسرتِ بہار بہت ہے
مگر وہی ہے ترے غم کی تازگی کا سبب بھی — غمِ جہاں ہمیں ہر چند ناگوار بہت ہے
نشانِ منزلِ مقصود مل گئے تو ہیں تابش — ہماری راہ میں لیکن ابھی غبار بہت ہے

بہرحال اس مجموعے کو پڑھنے کے بعد یہ کہنا پڑتا ہے کہ تابش صاحب نے اُردو غزل گوئی کو ایک نیا موڑ دے دیا ہے۔ اس مجموعے کے شائع ہونے سے پہلے وہ زیادہ تر مشاعروں کی وجہ سے معروف رہے۔ مگر وہ مشاعروں کے شاعر نہیں ہیں کیوں کہ ان کی شاعری ایک دم سے چونکا دینے والی نہیں ہے۔ وہ پہلے دعوتِ فکر و نظر دیتی ہے اور پھر اپنے حُسن کا وہ عالم دکھاتی ہے جس میں فکر ایسے لطف لباس میں ملبوس نظر آتی ہے جس کے رنگ کی ہم آہنگی عام نظر کے بس کی چیز نہیں ہے۔ ذرا غور تو کیجئے کہ وہ اپنی بابت کیا کہتے ہیں اور اس ساری بات میں ان کی شاعری کی باریکی کس نزاکت سے سامنے آتی ہے۔

مل کے تابش سے ہوا ہے یہی محسوس کہ وہ
صاحبِ دل نہیں یا صاحبِ ادراک نہیں

آخر میں اس کتاب کے بے مثل گردپوش کا بھی ذکر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے جس کو آرٹ اکیڈمی کراچی نے اوّل انعام دیا ہے۔

ڈاکٹر ابوالخیر کشفی

تابش کی غزل

ہمارا معاشرہ ایک ایسے دَور سے گزر رہا ہے کہ:

پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

خواتین لباس کی نمائش کے نام پر اپنی نمائش کر رہی ہیں۔ سگرٹ کے اشتہاروں میں لباس سے قطع نظر ہمیں ایسے چہرے نظر آ رہے ہیں جن کے لبوں سے کبھی مسدس حالی کے بول ہمارے کانوں میں پڑتے تھے۔ ہمارے بچپن کے کانوں میں۔

ہمارے نوجوان درزیوں کے فن کو دانش گاہوں کے علم و فضل پر ترجیح دے رہے ہیں۔ غزل میں الف اور نون کے ارتباط کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ مختصر یوں سمجھئے کہ پروفیسر رشید احمد صدیقی کے الفاظ میں لوگ "اظہار کی جگہ ارتکاب" پر مائل نظر آ رہے ہیں۔

اس بات کو بھی ذہن میں رکھئے کہ فضا میں یہ آواز بھی بلند ہو رہی ہے کہ ہمارا ملک ایک نیا ملک ہے اور ہماری زندگی تجربات سے عبارت ہونی چاہیئے یہ کہنے والے اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ ایک بڑی اور قدیم قوم نے ایک نئے ملک کو جنم دیا ہے تاکہ اس کی روایات عظمیٰ کا تسلسل باقی رہے اور پھر تجربات خود کوئی مقصد نہیں۔ تجربہ کو فیشن کے طور پر اپنانے والے جدتِ فکر سے محروم ہوتے ہیں۔ ہاں وہ ذہن اور قومیں جو اپنی زندگی کو نئے اور بہتر سانچوں میں ڈھالنے کا حوصلہ اور اُمنگ رکھتی ہیں ان کی زندگی اور ادب میں تجربے اپنے حقیقی خط و خال، اور بیساختگی کے ساتھ آتے ہیں۔ معاشرہ کی اس رَو میں جہاں،

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

ایسی آوازیں بھی کبھی کبھار سنائی دیتی ہیں کہ "روایت سے دامن چھڑانے والے اصول ارتقا سے نابلد ہیں" زمانہ کا ساتھ دیجئے، مگر یوں نہیں کہ ہماری نسل کا پہچاننا مشکل ہو جائے"۔

یہ الفاظ تابش دہلوی نے اپنے مجموعۂ غزلیات "نیم روز" کے "حرفِ اول" میں لکھے ہیں اور یہ الفاظ ان کی شخصیت کو سمجھنے کیلئے کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ حضرت تابش، میرؔ و مرزاؔ کی خاکِ پاک سے اٹھے ہیں اور مجھے تو ان کے لہجہ میں ان بزرگوں کی جھلک نظر آتی ہے۔ انکسار کے ساتھ تمکنت اور جھپنے کی لکیروں میں دوستوں اور اپنے محبوب سے ذوالفقار علی بخاری کے الفاظ میں یہ خطاب کہ،

شاہوں کی بندگی میں سر بھی نہیں جھکایا

تیرے لئے سراپا آداب ہو گئے ہم

تابش کی رندگی میں ٹرا رکھ رکھاؤ ہے۔ ان کا دل "رہین وضعِ بزرگاں" ہے، بات کرتے ہیں تو اس درجہ ٹھہر ٹھہر کر جیسے وہ بسوں اور موٹر رکشاؤں کی تیز رفتاری کے جنون میں مبتلا شہر میں نہیں رہتے جہاں ہر آدمی اپنے آپ سے بھی بھاگتا ہے بلکہ وہ اپنے لہجے کے ٹھہراؤ سے ایک معتدل اور متوازن شہر کے باسی معلوم ہوتے ہیں، ایسے شہر کے باشندے جہاں لوگوں میں "جرأتِ رندانہ" بھی ہو اور "شوقِ فضول" بھی، جہاں چاندنی بھی ہو اور بعض نفاستیں خاص والوں سے لوگ انتہائی اہتمام کے ساتھ پان نکال رہے ہوں۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ تابش دلی سے تو چلے آئے مگر ان کا دل اب ان کی دلی ہے! ان کا دل اس شہر کی روایات کا خزینہ ہے جو اقبال کو سوادِ رومۃ الکبریٰ میں بھی یاد آیا تھا۔

وہ شخص جس کا دل اور ذہن روایات کا خزینہ ہو، اس کی شاعری میں بھی ہمیں اپنی بہترین روایات نظر آئیں گی۔ روایات کا احترام اور ان کے سایہ میں اپنی انفرادیت اور شخصیت کا ارتقاء ——— یہ ہے تابش کی غزل "نیم روز" کی پہلی غزل کا مطلع ہے،

مانا فروغِ حسن سے ہر ذرہ طور تھا
کیا مجھ کو اعترافِ تجلی "غرور" تھا

"غرور" کا یہ صرف زماں و مکاں کی وسعتوں کو سمیٹ کر ہمیں میر صاحب کی مجلس میں پہنچا دیتا ہے، اور پھر

جلوۂ حسنِ نظر یاد آیا
توبہ الفاظِ دگر یاد آیا

تابش کی یہ غزل پڑھتے ہی ہمیں وہ قیامت یاد آجاتی ہے جو بہ الفاظِ دگر کسی کا وقتِ سفر ہے

میر اور غالب کی زمینوں میں تابش کی غزلیں ان کے ادبی مطالعہ اور شعری روایت کے احترام و شعور کا نتیجہ ہیں۔ مگر ان غزلوں میں تابش کی انفرادیت بھی نظر آتی ہے۔ ترقی پسند تحریک کے آغاز کے ساتھ روایت کا لفظ گالی بن گیا تھا۔ مگر جب وہ طوفان (تحریک نہیں) بلکہ اس کا اُبال گزر گیا اور مطلع صاف ہوا تو یہ حقیقت کھر کر سامنے آئی کہ روایت کسی کی ادبی شخصیت کی تاب و توانائی کی پیمائش کا پیمانہ ہے۔ اس حقیقت کے حضور جس "حقیقت" نے ہمیں سر جھکانے پر مجبور کیا، وہ حسرت کی غزل ہے۔ حسرت جس نے اعلان کیا ؎

غالب و مصحفی و میر و نسیم و مومن
طبعِ حسرت نے اٹھایا ہے ہر استاد سے فیض

حسرت جس کے یہاں مصحفی کی شاعری میں رنگ کا نامکمل احساس مکمل ہو گیا، جس نے ترکیب مومن کی زیرنگیوں کو نیا انداز عطا کیا۔ جس کے یہاں نسیم کی شادابی شاداب تر ہو گئی۔ حسرت کی شاعری اس حقیقت کا اظہار ہے کہ بڑی شخصیت ہی صدیوں کی شاعرانہ روایتوں کی علامت بن سکتی ہے۔

تابش صاحب کے سلسلہ میں، میں کوئی ایسا دعویٰ نہیں کروں گا۔ لیکن یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ادبی روایات کو انہوں نے ایک خلاقانہ ذہن کے ساتھ قبول کیا ہے۔ ایک طرف تو ان کا مطالعہ وسیع ہے اور دوسری طرف وہ صحبت یافتہ آدمی ہیں۔ عہدِ حاضر کے شاعروں میں سے تابش سب سے زیادہ فانی سے متاثر ہوئے ہیں۔ وہ فانی کی محفل میں مدتوں بیٹھے ہیں۔ فانی کے اثر سے یا اپنی افتادِ طبع کے تحت تابش صرف اظہار کو فن نہیں سمجھتے بلکہ وہ شعر کو سخن کا پردہ بنانے کے قائل ہیں۔ یہ ایک بنیادی نکتہ ہے، اور اس کا خوشگوار اثر یہ مرتب ہوتا ہے کہ ایسے شاعر کے یہاں جذبہ کی شدت، گہرائی اور گیرائی تو ملتی ہے مگر وہ خود جذباتیت کا شکار نہیں ہوتا۔ ایسا ہی شاعر یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ

ع   ہم جان دے کے دل کو سنبھالے ہوئے تو ہیں

آدمی اپنے غم سے چھوٹا ہو تو خودکشی کرے گا یا اس کے نغمے کی کوئی لے نہیں ہوگی۔ تابش نے اپنی محرومیوں کا تماشا آپ دیکھا ہے —— DETACHMENTS (اپنی ذات سے بُعد) فن کا ایک بلند مرحلہ ہے، جبر و اختیار، غمِ جاوداں، اور مرگِ ناگہاں کے شاعرانہ استعارے فانی اور تابش دونوں کے یہاں ملتے ہیں فانی کا اثر مجھے تسلیم ہے (اور فانی کے ابتدائی دور پر غالب کے اثر کو آپ بھی تسلیم کریں گے) لیکن مجموعی طور پر تابش کے یہاں فانی کے اثرات کے ساتھ ساتھ اپنی ذات کی جلوہ گری بھی ہے:

اس اختیار کی مجبوریوں کو کیا کہیے — یہی کہ جبر کبھی اختیار ہو نہ سکا

جب تک غمِ الفت کی پناہوں میں نہیں تھا — دل شورشِ ہستی کی نگاہوں میں نہیں تھا

دنیا شریکِ نعمتِ غم بھی نہ ہو سکی — اپنے سوا ملا نہ کوئی رازداں مجھے

نعمت کا اعتبار ہے حسنِ قبول سے — عشرت بھی ایک غم ہے گوارا کہیں جسے

تابش صاحب کا یہ قول میں پہلے ہی پیش کر چکا ہوں کہ زمانہ کا ساتھ دیجئے مگر یوں نہیں کہ ہماری نسل ہی کا پہچاننا مشکل ہو جائے۔ بات صرف نسل کی تشخیص تک محدود نہیں رہتی بلکہ اس نشتر کی زد شریانِ قیسِ ناتواں تک ہے، یعنی سلسلہ حسب نسب تک جا پہنچتا ہے۔

تابش کی غزل میں زمانے کے تازہ تر رجحانات بھی ہیں وہ بیسویں صدی کے شاعر ہیں اور بیسویں صدی کے اس دور کے جس میں گلشن کم تعمیر کئے گئے اور صحرا زیادہ بسائے گئے ہیں، تابش کے یہاں اس دور کی شاعرانہ تصویریں ہیں۔

اگلی فصلِ بہار ہو شاید — خونِ دل اب ہے آستینوں میں

ہے آمدِ بہار مسلّم خزاں کے بعد — لیکن رہے گا دورِ خزاں بھی بہار تک

جس طرح میر صاحب کے یہاں "جگر" دل کا استعارہ ہے، اسی طرح تابش کے یہاں بہار کی معنویت کے پہلو ہماری زندگی کا احاطہ کئے ہوئے ہیں، اور زمانے کی اس تصویر کشی میں وہ اپنے کو، مجھے، آپ کو اور "اُن" کو یاد رکھتے ہیں۔

کس کو راہبر جانیں، کس کو راہزن سمجھیں — آج رہبر و رہزن ساتھ ساتھ چلتے ہیں

ہم سختیٔ دوراں سے ہوتے اور بھی نازک — پتھر نے یہاں کام کیا شیشہ گری کا

الفاظ کے معنی لغت سے نہیں معلوم ہوتے اچھے شاعروں کے کلام سے معلوم ہوتے ہیں" قاتل" کے یہ معنی مرزا مظہر جانجاناں کے سوا اور کون بتا سکتا تھا۔

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو — یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

' نسے کے اس مفہوم کا اظہار اکبر الہ آبادی کے سوا اور کون کر سکتا ہے۔

یوسف کو نہ سمجھے کہ حسیں بھی ہے جواں بھی — شاید نرے لیڈر تھے زلیخا کے میاں بھی

"سخت" کا لفظ بوجھل سہی مگر جوش نے اسے کس طرح رام کیا ہے۔ شعر کی بوتل میں جن کو بند کردیا ہے،

درا آہستہ لے چل کاروانِ کیف و مستی کو — کہ سطحِ ذہنِ انساں سخت ناہموار ہے ساقی

"کم بخت" کا لفظ ہمارے لئے، ہمارے بچپن اور لڑکپن میں کتنی بار ہمارے بزرگوں نے استعمال کیا ہے، مگر جوانی کے احساسات سے دو چار ہونے کے بعد فیض کے اس مصرع میں اس لفظ کا پس منظر اور پیش منظر ہمارے لئے بدل جاتا ہے؛

ہائے اُس جسم کے کم بخت دل آویز خطوط

اور دراتا لش کے یہاں "نارک" کے لفظ میں ہمت، بلندی، حوصلہ اور عظمت انسانی کی یہ متحرک تصویر تو دیکھئے۔ شاید عبد الرحمٰن بجنوری مرحوم نے یہ بات کہی تھی کہ،

"اچھے شاعر کا کلام میدانِ حشر ہوتا ہے، جہاں الفاظ کو پھر سے جلایا جاتا ہے"

ڈاکٹر اسلم فرخی

نذرِ تابش

پہلے دھیمے لہجے میں سوال جواب ہوتے رہے، پھر بحث شروع ہوئی تو گردن کی رگیں بھی پھولنے لگیں، تلخی کے آثار ظاہر ہونے مگر ایک صلح کُل نے بیچ میں پڑ کر بحث و تکرار کو "جدالِ سعدی با مدعی" ہونے سے بچالیا۔ بحث و تکرار از سرِ نو گفتگو کے دائرے میں آگئی۔ صلح کل نے پوچھا "آخر بات کیا ہے؟" ایک فریق نے کہا، "ایک لفظ کے تلفظ کا مسئلہ ہے ہم مُنفَعت کہتے ہیں مگر یہ مُنفِعت کہنے پر اصرار کر رہے ہیں حالانکہ مَنفِعت غلط ہے۔ صلح کل نے کہا "بھائی ان کے پاس مُنفِعت کہنے کی کوئی دلیل ہوگی۔ پوچھ لیتے ہیں۔ ہاں بھائی آپ مَنفِعت کیوں کہتے ہیں۔ کس لغت میں دیکھا ہے۔" فریق ثانی نے کہا۔ لغت میں تو نہیں دیکھا کل رات خبریں سن رہا تھا۔ مسعود تابش نے مَنفِعت پڑھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ صحیح تلفظ یہی ہوگا۔ تابش صاحب زبان کے اعتبار سے سند ہیں۔" صلح کل بولے۔ ہاں مجھے بھی اتفاق ہے کیوں کہ تابش صاحب کا تلفظ مستند ہے جو کچھ پڑھتے ہیں صحیح پڑھتے ہیں۔"

تابش صاحب کا عمومی حوالہ یہی مستند تلفظ تھا۔ اس لیے کہ اب تابش صاحب خبریں نہیں پڑھتے۔ صرف شعر پڑھتے ہیں مگر اس ضمن میں بھی استناد قابلِ توجہ ہے۔ شاہد احمد دہلوی مرحوم نے خدا انہیں جنت نصیب کرے اس حوالے کو ایک لطیفے میں مندرج کرلیا تھا۔ کہنے لگے۔ "کیوں میاں تابش وہ کیا فقرہ تھا جو تم نے خبریں پڑھتے ہوئے کہا تھا۔ "معاف فرمائیے میں اسے پھر

غلط پڑھتا ہوں۔" تابش صاحب مسکرا کر چپ ہو گئے عافیت پی جانے ہی میں تھی۔

مسعود الحسن تابش دہلوی کو خبریں پڑھتے سنتا رہا، مشاعروں میں دیکھتا بھی رہا، لمبا قد، بڑی بڑی روشن آنکھیں، ستواں ناک، چوڑی پیشانی، مسکراتا کتابی چہرہ، چال ڈھال میں وقار، جامہ زیب، لباس سے غیر معمولی نفاست، کپڑے عارف کامل کے قلب کی طرح بے داغ، نہ کوئی سلوٹ نہ شکن، صادق الخیری مرحوم کہا کرتے تھے "تابش کیا تم کپڑے پہننے کے بعد استری کرواتے ہو۔" گفتگو میں گھلاوٹ مگر میں انھیں دیکھتا ہی رہا۔ محفل صاحب سلامت رہی، شاہد بھائی کے ہاں آنا جانا ہوا تو تابش صاحب کو بھی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اس بزم بے تکلف میں بھی اپنے آپ کو لیے دیے رہتے۔ چنانچہ ہم جیسے چھٹ بھیوں نے ان سے دور ہی رہنے میں عافیت سمجھی مگر کب تک دور رہتے۔ محکمہ ایک، احباب ایک اور ملنے جلنے والوں کا حلقہ ایک، ریڈیو اسٹیشن، اسٹاف جنس اسکول سے بندر روڈ کی نئی عمارت میں منتقل ہوا تو ملاقات کے موقعے بھی بڑھے مگر مجھے نہ جانے کیوں عرصے تک یہ احساس رہا کہ تابش صاحب مُدمغ ہیں۔ کالے آدمی کو گھاس نہیں ڈالتے۔ اس احساس کی وجہ یہ تھی کہ مرحوم سرور قدوائی نے شاہد بھائی کے کہنے پر اپنے ہاں ایک طرحی مشاعرہ کیا۔ "محبت نہ پوچھیے، قیمت نہ پوچھیے،" تابش صاحب بھی مشاعرے میں شریک تھے جب وہ غزل پڑھ رہے تھے تو ایک شاعر نے مصرع اٹھایا۔ بد قسمتی سے انھوں نے مصرع اُٹھانے میں سہواً ایک لفظ بدل کر پڑھا۔ تابش صاحب نے فوراً ٹوکا "حضرت میں نے یہ لفظ نہیں یہ لفظ نظم کیا ہے۔" مصرع اٹھانے والے خاصے خفیف ہوئے اور انھوں نے بڑی معذرت کی۔ بات رفت و گزشت ہو گئی مگر میرا یہ گمان یقین میں بدل گیا کہ تابش صاحب کے مزاج میں کس قدر سختی ہے۔

اب غور کرتا ہوں تو محسوس ہوتا کہ جسے میں سختی سمجھتا تھا وہ سختی نہیں۔ رکھ رکھاؤ کی اعلیٰ ترین کیفیت کا اظہار تھا۔ انسان جب اپنے لیے کچھ اصول وضع کرتا ہے اور ان پر کاربند بھی ہو جاتا ہے تو پھر وہ کسی قسم کے گریز اور بے قاعدگی کو گوارا نہیں کرتا۔ نہ خود بے قاعدگی برتتا ہے نہ دوسرے کی بے قاعدگی گوارا کرتا ہے۔ تابش صاحب نے اپنے ذہن اور عادات و مزاج کا تشکیلی دور حیدرآباد دکن میں گزارا جو برصغیر میں ہند اسلامی تہذیب کا آخری اور مستند مرکز تھا۔ یہ بھی اتفاق کہ ان کا قیام مولوی عنایت اللہ دہلوی جیسے ذی علم اور درویش مزاج انسان کے یہاں رہا اور وہ کم عمری کے باوجود شاعروں، ادیبوں، عالموں کے اُس حلقے میں بیٹھتے اُٹھتے جو تہذیبی، ثقافتی اور علمی اعتبار سے اپنی مثال آپ تھا۔ مہاراجہ بہادر جیسے وضعدار علم دوست اور سخن پرور رئیس کی بارگاہ اور فانی جیسے شائستہ آدابِ زندگی شاعر کی صحبت نے تابش صاحب کی وضعداری کو اس انتہا پر پہنچا دیا جو سطحی نظر رکھنے والوں کو تکبر اور امانت سے عبارت معلوم ہوتی ہے۔

سطحی، ملاقات اور مشاہدے کے اس دور میں تابش صاحب سے منسوب ایک اور لطیفہ بھی سننے میں آیا۔ کوئی شعر پڑھا گیا، کسی نے غزل سنائی، سب نے تعریف کی، تابش صاحب نے بھی کلماتِ تحسین کہے، پھر شعیب حزیں یا کسی اور کی طرف دیکھ کر کہا "مگر فانی۔ . ." انھوں نے جواب دیا "فانی کی بات ہی اور ہے۔" اس تائید باہمی کے بعد دونوں فانی پرست خاموش ہو گئے۔ تابش صاحب فانی کی شاعری اور شخصیت دونوں سے بہت متاثر ہیں۔ مجھے کبھی کبھی یہ محسوس ہوا کہ خود ان کی شخصیت میں فانی کا سا رکھ رکھاؤ اور شاعری میں فانی کے شعری تفکر کا ہلکا سا پرتو ہے۔ میں نے بارہا فانی کے بارے میں ان سے گفتگو کی ہے۔ ایسے موقعوں پر "وہ کہیں اور سنا کرے کوئی" والی بات ہوتی ہے۔ انھوں نے فانی کے بارے میں جو مضمون لکھا ہے غالباً وہ فانی کی شخصیت کے حوالے سے سب سے بہتر مضمون ہے۔

رفتہ رفتہ تابش صاحب سے تعلقات بڑھے، قربت حاصل ہوئی تو اندازہ ہوا کہ اوپر سے غیر معمولی رکھ رکھاؤ کا اظہار کرنے والے تابش صاحب اندر سے بڑے نرم اور سراپا خلوص ہیں۔ دوستوں پر جان چھڑکتے ہیں۔ حالِ احساب ہیں، لوگوں کا خیال سب ہی کرتے ہیں تابش صاحب غیروں کا خیال بھی رکھتے ہیں۔ دنیادار ہوتے ہوئے دنیاداری سے متنفر ہیں اور ان میں سو عیبوں کا ایک عیب یہ ہے کہ غلط بات پر مصالحت کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ ادھر آپ نے کوئی ایسی بات کہی جو ناروا، بے جا یا غلط ہے اور ادھر تابش صاحب کے چہرے کا رنگ بدلا وہیں رو در رو بڑی شائستگی سے تردید کر دیں گے۔ لگی لپٹی نہیں رکھیں گے۔ ان کی اس عادت سے بہت سے لوگ ان سے ناراض بھی ہو جاتے ہیں کیوں کہ منافقت کا زہر اب ہمارے پورے معاشرے میں سرایت کر گیا ہے۔ منہ پر رام رام اور بغل میں چھری والوں کی کثرت ہے کہنے والے نہ حق بات کہنے کی جرأت کرتے ہیں، نہ سننے والوں میں حق سننے کی تاب ہے۔ ان حالات میں لوگ تابش صاحب سے ناراض نہیں ہوں گے تو کیا خوش ہوں گے۔ ویسے تابش صاحب نے ایک اور نادر طریقہ بھی اختیار کر رکھا ہے۔ آپ نے بڑے راز دارانہ لہجے میں چہرے پر غیر معمولی سنجیدگی طاری کر کے کوئی ناروا بات کہی، کسی کی مذمت کی، کسی کا استہزا کیا اور انھوں نے مسکرا کر کہا۔ اما ہٹو، اما نہیں کہہ کر ساری راز داری اور سنجیدگی کو مٹی میں ملا دیا۔ ایسے موقعوں پر بات کہنے والا اما ہٹو سن کر خاصا شرمندہ ہوتا ہے کہ ہم نے تو اتنی بڑی خبر سنائی اور انھوں نے ہنسی ہنسی میں اس کی ساری اہمیت ہی ختم کر دی۔ عام طور پر لوگ مذمت اور استہزا سے لطف لیتے ہیں لیکن جس کا دل صاف ہو وہ ان باتوں سے نہ لطف لیتا ہے نہ کہنے والے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ تابش صاحب کی روش بھی یہی ہے خود دو ٹوک بات کہتے ہیں اور فضول باتیں سننے سے پرہیز بھی کرتے ہیں۔

خوش بیانی، فصاحت اور زبان کی پرکھ تابش صاحب کو ورثے میں ملی ہے۔ مادری زبان، مادری زبان، ماں کی گود میں زبان سیکھی، سنتے آئے ہیں حقیقت تابش صاحب کی والدہ سے مل کر روشن ہوئی۔ تابش صاحب کی والدہ مرحومہ کو اللہ تعالیٰ نے فصاحت و ملاحت کی جو جولی۔ زبان کا جو دل موہ لینے والا انداز عطا کیا تھا کم از کم میں نے ایسا انداز اور جولی کہیں نہیں دیکھی۔ ہزاروں اشعار از بر تھے۔ مثلیں، محاورے، فارسی کے فقرے، نوک زبان تھے۔ گفتگو کیا تھی ایک طلسم تھا، سنتے جائیے اور عش عش کرتے جائیے۔ میں نے سنگ و خشت کے قلعۂ معلیٰ کو بار بار دیکھا مگر قلعۂ معلیٰ کی زبان کا لطف تابش صاحب کی والدہ کو سن کر حاصل ہوا۔ طلسم ہزار داستان کا نام پڑھا اور سنا تھا معنویت ان کی گفتگو سن کر واضح ہوئی۔ وہ سراپا محبت تھیں، سب پر جان چھڑکتی تھیں مگر غلط لفظ کی سہار نہیں تھی ادھر آپ نے کوئی غلط لفظ کہا اور انھوں نے ٹوکا۔ ایک بار میں نے گفتگو کے دوران رنگ کے حوالے سے "پیلا" کا لفظ استعمال کیا۔ تابش صاحب کی والدہ نے فوراً ٹوکا "اے میاں یہ پیلا کیا ہوتا ہے زرد کہو زرد، رنگ زرد ہوتا ہے۔" میں تو کیا چیز ہوں کوئی اور بھی یہ جملہ سنتا تو چہرے پر زردی کھنڈ جاتی۔ زبان کا یہ عرفان اور ملکہ تابش صاحب کو ورثے میں ملا ہے۔ مطالعے اور علم نے اس ملکہ کو علمی بنیاد بھی فراہم کر دی ہے چنانچہ "مستند ہے میرا فرمایا ہوا" کا اطلاق صحیح معنوں میں انھیں پر ہوتا ہے۔ زبان کے سلسلے میں جب گاڑی کہیں اٹکتی ہے تو تابش صاحب ہی یاد آتے ہیں یا پھر حقی صاحب کا خیال آتا ہے حقی صاحب نے تحقیق لغت میں عمر گزاری ہے تابش صاحب کو تحقیق لغت سے دلچسپی ضرور ہے مگر اپنے تخلیقی سفر کے حوالے سے جو کچھ کہتے ہیں بہت سوچ سمجھ کر، اس کہنے میں شعر و سخن اور عام گفتگو سبھی شامل ہے۔

تابش صاحب کو قریب سے دیکھنے کے بعد ایک دن مجھے خیال آیا کہ اگر صرف ایک لفظ میں ان کی شخصیت کا بیان مقصود ہو تو کون سا لفظ موزوں ہوگا۔ وہ لفظ بھی فوراً ہی ذہن میں آ گیا۔ نفیس، نکھری ہوئی شخصیت، وضعدار انسان اور اس قسم کی دوسری

ترکیبیں استعمال ہوتی رہتی ہیں مگر میری رائے میں تابش صاحب کی سیرت و کردار کا صحیح اظہار نفیس سے ہوتا ہے، زبان ہو، شاعری ہو، رہن سہن ہو، زندگی کا عام رویہ ہو، تابش صاحب ہر سطح پر نفیس ہی نظر آتے ہیں۔ بڑے باقاعدہ انسان ہیں۔ نظم و ضبط کے عادی، گھر پر ان کی نشست سب سے الگ تھلگ ہے صاف ستھری ہر چیز قرینے کی، ہر چیز اپنی جگہ، کتابیں ہوں، قلم، کاغذ، سب صاف ستھرے مجال کیا جو کوئی چیز بے جگہ ہو، سادگی پسند ہیں مگر سادگی میں بھی ایک آن ہے۔ وہ جو ہم میں سے بعض لوگوں کو رہنائے احساس کمتری اپنے ہاتھ سے کام کرنے یا گھر کا کام کرنے میں ایک طرح کا معذرتی رویہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ شرم سی آتی ہے تابش صاحب کے یہاں اس کا کوئی شائبہ بھی نہیں۔ ایک دفعہ انھوں نے مجھ سے کہا مجھے اپنے ہاتھ سے کام کرنے یا گھر کا کام کرنے میں کوئی شرمندگی محسوس نہیں ہوتی میں نہیں کروں گا تو کون کرے گا؟'

رکھ رکھاؤ اور چھوٹوں کا خیال ایسا کہ ایک دفعہ اسلام آباد میں وہ اور میں ایک مشترک عزیز کے یہاں گئے راستے میں ایک جگہ ٹھہرے پھل خریدے کہنے لگے چھوٹوں کے یہاں خالی ہاتھ نہیں جاتے۔ پھر خوش خوش ان صاحب کے یہاں پہنچے مجھے کبھی فون کرتے ہیں تو پہلا سوال یہ ہوتا ہے' معروف تو نہیں تھے، میں مخل تو نہیں ہوا۔" یہ ساری باتیں نفاست طبع ہی سے تعلق رکھتی ہیں۔

لباس کے بارے میں تابش صاحب نفیس نہیں بلکہ بڑے نفیس آدمی ہیں، جامہ زیب ہیں، جو لباس پہنتے ہیں بھلا معلوم ہوتا ہے شیروانی پہنیں، کوٹ پتلون پہنیں، ان دنوں بربنائے بزرگی صدریوں پر گزارا کرنے لگے ہیں۔ کچھ بھی پہنیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لباس خاص طور پر انہیں کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ ایک دفعہ میں نے ان کی شیروانی کی تعریف کی اور دریافت کیا کہاں سلوائی ہے؟ میرا خیال تھا کسی بہت معروف اور بڑی دکان پر سلی ہوگی کیوں کہ فٹنگ اور تراش خراش بہت اعلیٰ تھی۔ معلوم ہوا حیدرآباد کالونی کے کسی غیر معروف درزی سے تیار کی ہے ہدایات تابش صاحب کی تھیں کام اس کا ہے

ہے رگ ساز میں رواں صاحب ساز کا لہو

ہدایات وہی دے سکتا ہے جو فنکارانہ نظر رکھتا ہو۔ اچھے کپڑے بھی وہی پہن سکتا ہے جو ان کی تراش خراش کا صحیح طریقہ بھی جانتا ہو۔ محض اونچی دکان پر چلے جانے سے خوش پوشی کی تکمیل نہیں ہوتی۔ پھیکا پکوان ضرور ہاتھ آتا ہے۔

لباس کی طرح تابش صاحب کی تحریر بھی بڑی سجل ہے۔ نستعلیق لکھتے ہیں شکست کے قائل نہیں۔ اسے ناروا سمجھتے ہیں۔ بالعموم لکھ کر کاٹتے نہیں۔ شعر بڑی احتیاط سے کہتے ہیں مگر ضرورت پڑ جائے تو زود گوئی اور برجستگی کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں۔ ایک دفعہ عزیزوں میں شادی تھی۔ براتی جمع ہو رہے تھے۔ کسی بزرگ نے تابش صاحب سے کہا' لما تم نے سہرا نہیں کہا' تابش صاحب نے کاغذ منگوایا جیب سے قلم نکالا اور منٹوں میں سہرا لکھ کر ان صاحب کے حوالے کر دیا۔ سہرے میں نوشہ اور مختلف عزیزوں کے نام بھی تھے۔ یہ نہیں تھا کہ کسی پرانے سہرے کے اشعار لکھ دیے ہوں۔ مگر انھوں نے زود گوئی اور برجستگی کو اپنا شعار اور فن نہیں بنایا سوچ سمجھ کر کہتے ہیں اور ہر لفظ پر پوری طرح غور کرتے ہیں وہ شاعری میں گروہ بندی کے قائل نہیں۔ مولانا ماہر القادری ان کے بڑے گہرے دوست تھے۔ دونوں میں بڑی گاڑھی چھنتی تھی۔ ایک دوسرے کا احترام بھی کرتے تھے۔ ایک دفعہ میں نے مولانا کی موجودگی میں تابش صاحب سے پوچھا "ان کی زبان دانی کے بارے میں کیا خیال ہے۔' بے ساختہ بولے۔' اس اعتبار سے تو یہ گنوار ہے گنوار' لطف کی بات یہ ہے کہ مولانا نے تابش صاحب کی اس بات کا بالکل برا نہیں مانا بلکہ یہ جملہ سن کر ہنستے رہے۔

درونِ خانہ تابش صاحب سعادت مند اولاد، شفیق باپ، ذمہ دار شوہر اور مخلص عزیز ہیں۔ والد اور والدہ کی بڑی خدمت کی ہے خدمت کیا بار برداریاں کی ہیں۔ بالوالدین احسانا پر پوری طرح کاربند ہوئے ہیں۔ والدین کی خدمت سعی کرتے ہیں۔ تابش صاحب کے یہاں یہ جذبہ دوسروں سے زیادہ ہے۔ بچوں کو اچھی تعلیم و تربیت دی ہے۔ مگر وہ اس سلسلے میں کلاسیکی اصول، "کھلاؤ سونے کا نوالہ اور دیکھو شیر کی نگاہ سے" کے قائل ہیں۔ ان کے گھر کا ماحول صاف ستھرا اور پاکیزہ ہے۔ پھولوں کی ہلکی خوشبو، کمروں میں ہلکے رنگ، نفاست کا بھرپور احساس۔

قیامِ پاکستان سے پہلے دلّی، لکھنؤ، حیدرآباد دکن اور لاہور زبان و ادب کے بڑے مرکز تھے۔ دلّی اور لکھنؤ میں چشمک بھی تھی تابش صاحب چونکہ خالص دہلوی ہیں اس لیے وہ لکھنؤ کی زبان اور شاعری کے کچھ زیادہ قائل نہیں۔ ان کا ایک فقرہ کہ "لکھنؤ کی شاعری طوائف کا چونچلا ہے۔ بہت مشہور ہوا مگر میری رائے میں یہ فقرہ یک رُخہ ہے۔ یہ لکھنؤ کی شاعری طوائف کا چونچلا ہے نہ دلی کی شاعری تماشبین کی فریاد۔ دونوں اپنی جگہ قابلِ قدر ہیں مگر تابش صاحب یہ بات ہرگز نہیں مانیں گے۔

تابش صاحب دیندار آدمی ہیں، بزرگوں کے پاسدار، بزرگانِ دین کے عقیدت مند، حضرت سلطان جی رحمت اللہ علیہ سے خصوصی عقیدت رکھتے ہیں۔ وہاں کے حاضر باشوں میں ہیں۔ مقبول بارگاہ ہیں ایک دفعہ حیدرآباد میں تھے اور میعادی بخار میں مبتلا تھے خواب میں دیکھا کہ حضرت سلطان جی رحمت اللہ علیہ کا عرس ہو رہا ہے۔ یہ بھی شریک ہیں۔ آنکھ کھلی تو سوچنے لگے میں تو بیمار ہوں، سترہویں میں کیسے شرکت کر سکتا ہوں بات آئی گئی ہو گئی۔ ٹھیک ہو گئے تو دلّی آنے گاڑی فرید آباد پہنچی تو بڑی بھیڑ بھاڑ، خلق خدا کا ہجوم، پوچھا کیا بات ہے؟ معلوم ہوا کہ حضرت سلطان جی کی سترہویں ہے۔ زائرین شرکت کے لیے جا رہے ہیں۔ تابش صاحب گھر پہنچے بڑے اطمینان و سکون سے سترہویں میں شامل ہوئے اس وقت یہ احساس ہوا کہ وہ خواب نہیں تھا بُلاوا تھا۔ تابش صاحب جب بھی یہ واقعہ سناتے ہیں تو ان کی آنکھوں میں خصوصی چمک نمودار ہوتی ہے چہرا کچھ اور زیادہ متین ہو جاتا ہے۔ ایسے موقع پر ہر سننے والا ان کے حسنِ بیان سے متاثر ہوتا ہے۔

تابش صاحب مستقل مزاج انسان ہیں محنت سے ترقی کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں۔ ہمارے سامنے کی بات ہے کہ انھوں نے اسلامیہ کالج سے اعزاز کے ساتھ بی اے کیا۔ ایم اے میں بھی داخلہ لیا تھا مگر مصروفیت کی وجہ سے چھوڑنا پڑا۔ وہ آج بھی اپنے اساتذہ کا حق کی جاں اکثریت عمر اور تجربے میں ان سے چھوٹی ہے۔ بڑا احترام کرتے ہیں۔ بڑی عزت سے ان کا نام لیتے ہیں، فارغ التحصیل ہو جانے کے بعد بعض تلامذہ میں جو خود سری اور انانیت پیدا ہو جاتی ہے تابش صاحب اس سے کوسوں دور ہیں شاید اسی وجہ سے ان کے اپنے شاگرد (فن شعر میں ان کے شاگرد بہت ہیں) اُن کا بے حد احترام کرتے ہیں۔ تابش صاحب بھی اپنے شاگردوں سے بڑی محبت کرتے ہیں۔ بڑے خلوص سے ان کا تذکرہ کرتے ہیں اور بڑی محنت سے اصلاح دیتے ہیں۔ واصل عثمانی ان کے ایک بڑے لائق اور چہیتے شاگرد ہیں استاد کا ایسا ادب کرتے ہیں کہ بیٹا باپ کا بھی اتنا ادب نہیں کر سکتا۔ ایسے احترام سے نام لیتے ہیں، ایسی محبت سے تذکرہ کرتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے واصل صاحب کے اس رویے میں ان کی اپنی شرافتِ نفس کے ساتھ ساتھ تابش صاحب کی شفقت بزرگانہ کا حصہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔

تابش صاحب کے ملنے جلنے والوں کا حلقہ بڑا وسیع ہے حیدرآباد دکن، دلّی، لاہور، کراچی وہ جہاں رہے کثیر الاحباب رہے۔ ملنے جلنے والوں میں ہر طرح کے لوگ ہیں۔ تابش صاحب کی کمزوری یہ ہے کہ وہ ہر شخص سے برابری کی سطح پر ملتے ہیں۔ کسی سے مرعوب نہیں ہوتے نہ کسی کی بے جا تعریف کرتے ہیں۔ ایک اور عادت تابش صاحب میں یہ ہے کہ آپ نے اپنا کوئی مسئلہ بیان

کیا۔ مثلاً یہ کہ ایک ٹی وی خریدنا ہے پہلے تو تابش صاحب معمول کے مطابق لمبا ہتولو اور لمبا نہیں کہہ کر پر بشر کم کریں گے مگر جب یہ اندازہ ہو جائے گا کہ آپ سنجیدہ ہیں تو کہیں گے فکر کی کیا بات ہے فلپس میں میرے ایک دوست ہیں ایسے موقعوں پر وہ انگریزی کا ایک فقرہ کہتے ہیں "AND HE IS A BIG GUN THERE" میں ان سے کہہ دوں گا۔ اب آپ تو گھر بیٹھے عیش کر رہے ہیں اور تابش صاحب ان بڑی توپ کو فلیتہ دکھا رہے ہیں جب تک ٹی وی آپ کے گھر نہیں پہنچ جائے گا تابش صاحب چین سے نہیں بیٹھیں گے۔

کراچی کے شاعروں میں بہ اعتبار عمر تابش صاحب کا نمبر دوسرا ہے پہلا نمبر جلیل قدوائی کا ہے اللہ تعالیٰ انھیں تادیر سلامت رکھے اس بزرگی کا نتیجہ یہ ہے کہ مشاعروں کی صدارت کے فرائض بالعموم جناب تابش صاحب کے سپرد کر دیے جاتے ہیں تابش صاحب ہیں کہ پیری کے باوصف پہلو بدلے بغیر مسندِ صدارت پر بیٹھے رہتے ہیں۔ اس عمر میں یہ بڑا دل گردے کا کام ہے مگر وہ جو کسی شاعر نے کہا ہے

عاشقی کاہے کو ٹھہری یہ تو دربانی ہوئی

اس دربانی میں جو لطف ولذت ہے ضعفِ پیری اس کے سامنے کیا مال ہے۔

تابش صاحب قدیم اور جدید ادبی تاریخ کا جیتا جاگتا مرقع ہیں۔ نظم طباطبائی سے تاجدار عادل تک شاعروں اور ادیبوں کی متعدد نسلوں سے ان کا قریبی رابطہ رہا ہے مگر تابش صاحب اس رابطے کی ساری داستانیں دل میں لیے بیٹھے ہیں کھلتے کم ہیں کریدتے اور مسلسل سوال کرتے رہیے تو کچھ تذکرہ کر دیں گے اگر وہ اپنی یادداشتیں مرتب کر دیں تو ادب اور ادیبوں دونوں کے بہت سے نئے پہلو سامنے آئیں گے میں نے بارہا ان سے گزارش کی مگر مشاعرے انھیں کہاں چھوڑتے ہیں اور وہ خود بھی مشاعروں کو چھوڑنا نہیں چاہتے۔ مشاعروں کے حوالے سے مجھے یاد آیا کہ ایک بار میں نے تابش صاحب کے سامنے مولانا سیماب کا یہ مطلع پڑھا

دل کی بساط کیا تھی نگاہ جمال میں
اک آئینہ تھا ٹوٹ گیا دیکھ بھال میں

تابش صاحب کے چہرے پر سرور کی ایک لہر دوڑ گئی ایک لمحے کے لیے ماضی کے دھندلکوں میں کھو گئے پھر کہنے لگے مولانا نے یہ مطلع حے پور کے طرحی مشاعرے میں پڑھا تھا البرٹ ہال میں مشاعرہ ہوا تھا کیا دھوم دھام تھی کیا اژدہام تھا برصغیر کا کوئی معروف شاعر ایسا نہیں تھا جو موجود نہ ہو حاصل مشاعرہ سراج لکھنوی کا یہ شعر تھا۔

کچھ اور مانگنا مرے مشرب میں کفر ہے
لا اپنا ہاتھ دے میرے دستِ سوال میں

جس شخص کی یادداشت اور معلومات کا یہ عالم ہو اس کا ان یادداشتوں کو قلمبند نہ کرنا ظلم نہیں تو اور کیا ہے مگر میں یہ بات تابش صاحب کو سمجھا نہیں سکتا آپ سمجھائیے شاید آپ کی بات مان لیں اللہ تعالیٰ انھیں عمر خضر عطا فرمائے مگر ہر کام کا ایک وقت بھی تو ہوتا ہے۔

مختار زمن

تابش دہلوی، ایک تاثر

"اب آپ مسعود تابش سے خبریں سنیئے۔"

"اب حضرت تابش دہلوی کی غزل سماعت فرمائیے۔"

معلوم ہوا کہ یہ ایک ہی صاحب ہیں۔ ورود مسعود اگر مشاعرے میں مائیک کے سامنے ہو تو آپ غزل کے مزے لوٹیے اور اگر ریڈیو پاکستان کے اسٹوڈیو میں ہو تو ان سے دنیا جہان کی خبریں سنیئے۔ شاعری ان کی زندگی اور مجموعۂ کلام سرمایۂ حیات ہے۔ خبریں سنانا ان کا پیشہ اور وسیلۂ معاش ہے۔

مجھے یاد نہیں کہ میں نے پہلی دفعہ تابش صاحب کو کب اور کہاں دیکھا۔ اور سنا۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں اُن سے ہمیشہ سے واقف ہوں۔ ہاں ایک دفعہ ایسا ہوا کہ جب وہ ملے تو مسکرا کر بولے کہ "ہماری استانی جی کیسی ہیں؟"

عرض کیا۔ "جی کیا فرمایا؟"

کہنے لگے۔ "میری مراد آپ کی بیگم صاحبہ سے ہے۔ وہ ہماری استانی ہیں۔"

آپ جانتے ہیں کہ اردو میں اگر کسی کو استاد کہا جائے تو اس کے متعدد لغوی اور اصطلاحی معنی ہو سکتے ہیں۔ مگر "استانی" تو صرف پڑھانے والی ہی کو کہتے ہیں یا کہتے تھے اس لئے کہ ترقی یافتہ لوگ تو اب اس مخلوق کو "مس" کہنے لگے ہیں۔

میری بیوی واقعی استانی ہیں۔ لہٰذا تابش صاحب کا سوال اپنی جگہ صحیح تھا مگر یہ "ہماری استانی" والا معاملہ میری سمجھ میں نہ آیا کہ آخر موصوفہ اتنے بڑے اور مشہور شاعر کی استانی کب اور کیسے بن گئیں۔ تابش صاحب کا دل آویز تبسم ان کے چہرے کو برابر تابندہ کر رہا تھا اور میں شش و پنج میں گرفتار تھا۔ آخر انہوں نے خود ہی یہ معمہ سلجھایا۔ تقسیم کے بعد ہندوستان سے کراچی آکر انہوں نے اسلامیہ کالج میں داخلہ لیا اور نئے سرے سے اپنی تعلیم کا سلسلہ شروع کیا۔ اس زمانے میں میری بیوی وہاں لیکچرر مقرر ہوئی تھیں اور یوں وہ ایک استادِ سخن کی استانی بن گئیں۔ اب تابش صاحب کا یہ دستور سا ہو گیا ہے کہ جب ملتے ہیں تو استانی جی کی خیریت ضرور دریافت فرماتے ہیں۔

تابش صاحب ایک سنجیدہ اور باوقار آدمی ہیں۔ اگلی وضع داری اور شرافت ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ میانہ قد، کھلتا ہوا گیہواں رنگ، کسی قدر لمبا چہرہ، نہ بہت موٹے تازے نہ بالکل سینک سلائی۔ "خیر الامور اوسطہا" کی تفسیر ہیں۔ جاڑوں میں ہمیشہ شیروانی پہنتے ہیں۔ گرمی میں ململ کا کرتہ اور علی گڑھ کٹ پاجامہ یا کبھی کبھی بش شرٹ اور پتلون۔ مزاج میں رکھ رکھاؤ ہے۔ نفاستِ طبع اور سلیقے کا یہ عالم ہے کہ

اگر کئی دن کپڑے نہ بدلیں تب بھی ان کے کپڑے شکنوں سے اسی طرح پاک رہیں گے جیسے ان کی کشادہ پیشانی۔ ان کی آواز بھاری اور دبنگ ہے۔ مگر وہ چیختے چلاتے نہیں۔ سلجھے ہوئے، گمبھیر انداز میں تحت اللفظ شعر پڑھتے ہیں۔ شعر سناتے ہیں ایکٹنگ نہیں کرتے۔

تابش صاحب کا آبائی وطن دہلی ہے۔ وہ ۹۔ نومبر ۱۹۱۱ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا پہلی جنگ آزادی کے لگ بھگ لکھنؤ چلے گئے تھے۔ محسن کاکوروی سے ان کی دوستی تھی۔ تابش صاحب کے پردادا نظام الدین صاحب لائق بزرگ تھے۔ فارسی میں شعر کہتے تھے۔ "عنا قیدِ نورس" اور "سرودِ مستانہ" ان کے نثری اور شعری مجموعے ہیں۔ وہ مرزا غالب کا زمانہ دیکھے ہوئے تھے۔ اور مصطفیٰ خاں شیفتہ سے اُن کے قریبی مراسم تھے۔

تابش صاحب کے والد مولوی ثناء الحسن کھاتے پیتے زمیندار تھے۔ کچھ دن لکھنؤ رہے اور پھر اپنے وطن دہلی آگئے۔ تابش صاحب کی والدہ شمس العلماء منشی ذکاء اللہ کی نواسی تھیں۔ منشی صاحب کے فرزند مولوی عنایت اللہ حیدرآباد دکن میں ناظم دارالترجمہ تھے اور اپنے والد کی طرح صاحبِ قلم بزرگ تھے۔ انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے میں مولوی صاحب مرحوم کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ ان کی صلاحیت کا اندازہ اس واقعے سے ہوتا ہے کہ سر سید احمد خاں نے مولوی عنایت اللہ سے "پریچنگ آف اسلام" کا ترجمہ اس زمانے میں کرایا تھا جب مولوی صاحب علی گڑھ میں انٹرمیڈیٹ کے طالب علم تھے۔ تابش صاحب لڑکپن اور نوجوانی کے زمانے میں مولوی عنایت اللہ کے زیرِ نگرانی حیدرآباد میں رہے۔ یہ گھر ایسا تھا کہ اُن کے ادبی ذوق پر صیقل ہوتی رہی۔ درسی تعلیم کا سلسلہ لکھنؤ، حیدرآباد، دلی ہوتا ہوا کراچی تک جاری رہا۔ مگر شعر و ادب کی کلیاں حیدرآباد میں پھوٹنی شروع ہوئیں۔ دلی میں خوب کھلیں اور اب تک بہار پر ہیں۔ ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ قرآن شریف انہوں نے ایک ہندو سے پڑھا۔ کہتے تھے کہ دلی میں ایک صاحب شیو دیال کایستھ تھے۔ وہ وحدتِ ادیان کے قائل تھے۔ نماز بھی پڑھتے تھے اور پوجا بھی کرتے تھے۔ سنسکرت بھی جانتے تھے اور عربی فارسی کے بھی عالم تھے۔ ان کی آزاد خیالی کے باعث گھر والوں نے انہیں گھر سے نکال دیا۔ شیو دیال صاحب نے ایک مکتب کھولا۔ اسی مکتب میں تابش صاحب نے اُن سے قرآن پڑھا۔ شیو دیال نہایت نفیس طبع، خوش گفتار اور خوش خط انسان تھے۔ اب یہی وضع شاگرد کی ہے۔

چند در چند وجوہات اور خاندانی حالات کے باعث تابش صاحب کے والد اور والدہ بہت کم عرصے تک ساتھ رہے۔ والدہ الگ دلی میں سوئی والوں میں رہتی تھیں۔ ۱۲، ۱۳ برس کی عمر میں تابش کو مولوی عنایت اللہ کے پاس حیدرآباد روانہ کر دیا گیا۔ قدرت کے کارخانے بھی عجب ہوتے ہیں۔ دلی سے دور حیدرآباد کا قیام تابش صاحب کے لئے بہت سودمند ثابت ہوا۔ شاعری کا چسکا تو لکھنؤ ہی میں لگ چکا تھا۔ حیدرآباد نے طبیعت کو برق کر دیا۔ ان دنوں حیدرآباد کا ماحول ایسا تھا گویا ادب کی کہکشاں پھیلی ہوئی تھی۔ عبداللہ عمادی، مرزا ہادی رسوا، مولانا طباطبائی، مسعود علی محوی، ہوش بلگرامی، فانی بدایونی اور دوسرے اہلِ قلم کا جمگھٹا تھا۔ مولوی عنایت اللہ نے شادی نہیں کی تھی۔ شادی کہو، گھربار کہو، جو کچھ تھا کتابیں اور لائبریری تھی۔ ادیب اور شاعر ان کے یہاں آتے رہتے تھے۔ ۱۳، ۱۴ برس کا لڑکا مسعود ان کی باتیں سنتا اور اپنے دل پر نقش کرتا جاتا تھا۔

تابش کی ادبی زندگی کا اہم موڑ اس دن آیا جب فانی سے اُن کی ملاقات ہوئی۔ فانی ۱۹۳۲ء کے لگ بھگ حیدرآباد دکن پہنچے اور وہاں ایک اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہو گئے۔ حیدرآباد میں ایک عمارت "رافت منزل" تھی۔ ایک دن وہاں مشاعرہ ہوا۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد صدرِ مشاعرہ تھے۔ تابش صاحب کہتے ہیں کہ فانی نے ترنم سے غزل پڑھی۔ بھاری اور درد انگیز آواز، اور اس سے زیادہ درد انگیز کلام۔ نوجوان تابش کے دل پر بہت اثر ہوا۔ تیسرے چوتھے دن فانی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور شاگردی کے لئے درخواست کی۔ شاعری تو دس گیارہ برس کی عمر سے شروع کر دی تھی اور تخلص بھی رکھ لیا تھا مگر پہلے شعر میں مسعود ہی باندھا تھا ؎

کہاں کہاں مجھے مسعود لوگ ڈھونڈ آئے بھلا میں اس کی گلی کے سوا کہاں ملتا

تابش صاحب کہتے ہیں کہ جب میں نے حضرت فانی سے درخواست کی کہ مجھے اپنی شاگردی میں لے لیجئے تو انہوں نے فرمایا "میاں، شاعری درزی کا کام نہیں ہے کہ میں بتادوں کہ کپڑا یوں کاٹا جاتا ہے ۔ ۔" اس وقت تو ٹال دیا لیکن خانساماں تابش صاحب کی سعادت اور عقیدت کام آئی اور آخر کار فانی ان کے کلام پر اصلاح دینے لگے مثلاً تابش نے شعر کہا ؎

ہوش اور بے خودی کو سموئے ہوئے سے ہیں ہم اُن کی بزمِ ناز میں کھوئے ہوئے سے ہیں

فانی نے شعر میں اصلاح کی ؎

ہم ہوش و بے خودی کو سموئے ہوئے سے ہیں اس انجمن میں ہیں بھی تو کھوئے ہوئے سے ہیں

استاد اور شاگرد کا جو رشتہ اگلے وقتوں میں سننے میں آتا تھا اسی کا نمونہ فانی اور تابش نے پیش کیا۔ تابش صاحب کہتے ہیں کہ حضرت فانی مجھ سے بے حد محبت کرتے تھے۔ جس دن میں نہ جاتا، خود میرے گھر تشریف لے آتے۔"

تابش نے بھی استاد کی تعظیم میں کوتاہی نہ کی وہ فانی کو عظیم ترین شعراء میں شمار کرتے ہیں اور کہتے ہیں ۔

"فانی اپنے ہم عصروں میں بے حد ممتاز ہیں۔ میر کا غم غمِ روزگار ہے، فانی کا غم غمِ یار ہے گو اُن کے بعض اشعار میں غمِ روزگار بھی جھلکتا ہے میں نہیں مانتا کہ فانی محض یاس کے شاعر ہیں۔ میرے خیال میں فانی نے غم کو ذریعۂ نشاط بنایا۔ اور حوصلہ دیا۔ مثلاً ؎

ممکن نہیں ہے راحتِ دنیا کی آرزو غم پر گمانِ راحتِ دنیا کئے بغیر

یا

غم بھی گزشتنی ہے، خوشی بھی گزشتنی کر غم کو اختیار کہ گزرے تو غم نہ ہو

یا

ہر نفس عمرِ گزشتہ کی ہے میت فانی زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا

میں جب تابش صاحب سے فانی کے موضوع پر گفتگو کر رہا تھا تو مجھے محسوس ہوا کہ استاد کے ذکر سے اُن کی آنکھوں میں عقیدت کی چمک اُبھر آئی ان کے لہجے میں وہی کیفیت پیدا ہو گئی جو محبوب کے ذکر سے ہوتی ہے۔ وہ نہ صرف اپنے استاد کو چاہتے ہیں بلکہ انہیں عظیم شاعر ہونے کے علاوہ عظیم انسان بھی سمجھتے ہیں۔ کہنے لگے ۔ وہ بھی عجیب دور تھا۔ شام کو فانی کے یہاں اہلِ علم اور شعراء جمع ہوتے تھے قرینے سے کرسیاں پڑی ہوئی ہیں۔ یگانہ ہوتے، آزاد انصاری آتے، جوش آتے ہیں، ہوش بلگرامی آتے ہیں، نثار یار جنگ آتے ہیں۔ کرسیوں پر بیٹھے جاتے ہیں۔ محفلیں جمتی ہیں۔ شعر پڑھے جاتے ہیں۔ ادبی مباحثے ہوتے ہیں کس نے کہا کہ فانی صاحب کوئی افسردہ دل، زاہدِ خشک تھے؟ یہ بالکل غلط ہے۔

بعض دفعہ تو وہ ایسا مذاق کرتے تھے کہ بس آدمی پٹ جائے۔ کوئی چارۂ کار نہ رہے۔ فانی مرحوم نہایت خود دار آدمی تھے جب ان کی بیوی کا انتقال ہوا تو ہاتھ تنگ تھا۔ ان کے ایک یارِ غار نواب دوست محمد خاں تھے۔ انہیں یہ حال معلوم ہوا تو دوستی کا حق نبھانا چاہا ایک شخص کے ہاتھ چھ سو روپے بھیجے۔ فانی صاحب سخت برہم ہوئے اور نواب اپنی جگہ شرمندہ۔ بالآخر طے پایا کہ بہت سے لوگ "عرفانیات" جو تازہ تازہ چھپی تھی خرید لیں اور اس طرح ان کی مالی امداد کی جائے۔"

میں نے فانی اور تابش کے مراسم اور تلمذ کا قدرے تفصیلی ذکر اس لئے کیا ہے کہ شاگرد پر استاد کی جو چھاپ ہے وہ صاف نظر آ جائے۔ تابش صاحب نہ صرف فانی کی شاعری اور شخصیت سے متاثر ہوئے بلکہ اتفاق سے فانی ہی ان کی نثر نگاری کا بھی سبب بنے۔ ۲۷ اگست ۱۹۴۱ء کو فانی کا انتقال ہوا تو تابش صاحب نے نثر کا پہلا مضمون "یادِ ایامِ صحبتِ فانی" لکھا جس میں فانی کی نہایت

دل کش قلمی تصویر کھینچی گئی ہے۔ ان دنوں دلّی میں چند ادیبوں نے ایک حلقہ بنا رکھا تھا۔ وامق جونپوری، پرنسپل مشتاق احمد زاہدی، سید محمد جعفری اور مولوی حفظ الرحمٰن سیوہاروی وغیرہ اس میں شریک ہوتے تھے۔ تابش صاحب نے اپنا مضمون اس حلقے میں پڑھا۔ ۱۹۴۲ء میں یہ مضمون "برہان" دہلی میں شائع ہوا تو دھوم مچ گئی۔ رشید احمد صدیقی نے تابش سے درخواست کی کہ وہ علی گڑھ میگزین کے لئے بھی مضمون لکھیں اور بعد میں فانی پر تحقیق کرنے والے طلبا نے ان سے اور ان کی تحریروں سے استفادہ کیا۔ نثر میں ہاتھ کھلا تو تابش نے تابڑ توڑ مضمون نگاری شروع کر دی۔ ذوالفقار علی بخاری، محشر اور میراجی کی قلمی تصویریں بنا ڈالیں۔ بطور شاعر ان کی شہرت برصغیر کے ادبی حلقوں میں پہلے ہی پھیل چکی تھی۔ ان کا کلام "ساقی"، "ادبی دنیا" اور "ادب لطیف" جیسے چوٹی کے رسالوں میں شائع ہونے لگا۔ ۱۹۳۸ء میں ان کی ایک نظم "دلّی" چھپی تو میر ناصر علی جیسے قدآور ادیب نے انہیں بلوا بھیجا، اور دعا دی۔ حیدرآباد میں فانی کے ہمراہ وہ مہاراجہ کشن پرشاد جیسے عظیم المرتبت شخص کی خدمت میں حاضر ہو چکے تھے۔ مہاراجہ کو مغلیہ تہذیب کی آخری نشانی سمجھئے۔ ایسے وضع دار، ادب دوست، ادیب نواز، لکھ لٹ اور کریم النفس آدمی تھے جن پر شرافت وارہی جاتی اور ثقافت صدقے ہوتی تھی۔ اُن کی داد و دہش کے طریقے بھی نرالے تھے۔ تابش صاحب ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ غزل پیش کی تو مہاراجہ نے نہایت بزرگانہ شفقت سے فرمایا "میاں آپ اجازت دیں تو میں اسے اپنی بیاض میں لکھ لوں۔" تابش کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ چنانچہ مہاراجہ نے چند اشعار اپنی بیاض میں ٹانک لئے اور بطور حوصلہ افزائی ایک اشرفی تابش صاحب کو عطا کی۔

تابش صاحب ماشاءاللہ شعر و ادب اور شرافتِ خاندانی کے علاوہ نیک طبیعت اولاد کی دولت سے بھی مالا مال ہیں۔ ان کی پہلی شادی ۱۹۳۹ء میں عرب سرائے (دہلی) کے سیدوں کے گھرانے میں ہوئی مگر بیوی ایک بچی چھوڑ کر چل بسیں۔ اب وہ لڑکی شادی شدہ صاحب اولاد ہے۔ ۱۹۴۶ء میں دوسری شادی نواب طالع یار خاں کی پوتی سے ہوئی۔ ان سے تین لڑکیاں اور ایک لڑکا ہے۔ لڑکا ابھی پڑھ رہا ہے۔ صاحب زادی شفیقہ ماشاءاللہ چشم بد دور ایم۔ اے پاس ہیں اور ایک بینک میں افسر ہیں۔

ایک دن میں نے تابش صاحب سے پوچھا کہ آپ شعر کسی کی فرمائش پر کہتے ہیں یا کوئی خاص کیفیت طاری ہو جائے تو کلام موزوں ہو جاتا ہے۔ کہنے لگے "میں فرمائش پر شعر نہیں کہتا۔ اور بھائی میرا حال تو یہ ہے کہ شعر کی تخلیق اور زچگی میں کوئی فرق نہیں سمجھتا۔"

فانی کے علاوہ تابش صاحب اگلوں میں میر تقی میر، مرزا مظہر جان جاناں، غالب اور مومن سے متاثر ہیں۔ آج کے ادیبوں میں وہ فراق کو بہت بڑا ادیب اور نقاد مانتے ہیں۔ شروع کے دور میں وہ انجمن ترقی پسند مصنفین سے بھی منسلک رہ چکے ہیں۔ کہنے لگے:۔

"عام طور پر جدت کا مفہوم غلط سمجھا جاتا ہے۔ میری رائے میں تو ہم روایت کے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتے۔ روایت، ماضی و مستقبل کی درمیانی کڑی ہے۔"

تابش صاحب شاعر ہیں، کاریگر نہیں۔ غالباً اسی لئے ان کی شعر گوئی کی رفتار سست ہے۔ جب طبیعت شعر کہلواتی ہے تو کہنے ہیں۔ سال میں چار پانچ غزلیں ہو جاتی ہیں۔ ۱۹۶۳ء میں ان کے کلام کا مجموعہ "نیم روز" شائع ہوا تھا۔ اب ان کا دوسرا مجموعہ کلام شائقین ادب کے ہاتھوں میں آنے والا ہے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ آپ خود ہی دیکھ لیجئے گا۔ یوں بھی اس مضمون کا مقصد اُن کے کلام پر تبصرہ کرنا نہیں ہے۔ یہ کام تو ناقدین فن ہی کر سکتے ہیں۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ ان کا شمار شعرائے پختہ کار اور اساتذۂ روزگار میں ہوتا ہے۔ وہ ہماری صالح اقدار کے نگہبان ہیں۔ اور اُن سے اور اُن جیسوں سے ہماری زبان کی آبرو باقی ہے۔

عبداللہ خاور

نیمروز میری نظر میں

"نیمروز" کے حرفِ اوّل میں تابش دہلوی نے غزل اور غزل گوئی پر کچھ باتیں کہی ہیں جو کئی حیثیتوں سے قابلِ غور ہیں ــــ
"نیا شعور روایت سے مسلسل بغاوت کر رہا ہے، حتیٰ کہ اہمال کو اس بغاوت پر ترجیح دی جاتی ہے۔ سوچنا یہ چاہیئے کہ اگر کسی قوم کے ادب سے روایت کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا جائے تو جو کچھ باقی بچے گا، وہ کیا ہوگا۔ فرد کے ذہنی ارتقا کی طرح، ادب کا ارتقا زینہ بہ زینہ ہوتا ہے۔ روایت اس کڑی کا نام ہے جو ماضی کو حال سے اور پھر حال کو آنے والے دَور سے ملاتی ہے۔ اس حقیقت سے جو شعراء منحرف ہوں گے وہ اپنے عارضی جزیرے کے رابنسن کروسو بننے کے خود ذمہ دار ہوں گے اور یہ یاد رہے کہ رابنسن کروسو ایک افسانوی کردار ہے جسے موت سے بچنے کے لئے خود ایک روایت بننا پڑا۔"

تابش نے لکھا ہے "روایت سے دامن چھڑانے والے اصولِ ارتقا سے نابلد ہیں۔" یہ بات تابش نے اپنی غزل گوئی کے اعتذار میں نہیں کہی ہے بلکہ اُن شعرائے کبار سے مخاطب ہو کر کہی ہے جو روایت سے بغاوت کے جوش میں مہمل گوئی اختیار کرتے چلے جا رہے ہیں۔ روایت کا پاس تابش کا مزاج ہے۔ لیکن یہ روایت پسندی جامد نہیں۔ "جدید حالات اور جدید خیالات سے متاثر ہونا زندگی کا اصول ہونا چاہیئے۔" روایت اور حقیقت پسندی کی کارفرمائی ملاحظہ فرمائیے ؎

اس قدر کیوں دشمنِ جاں ہو گئے   تم کہ ہم سے آشنا بھی کم رہے

تابش غزل میں وسعتِ مضامین کے قائل ہیں لیکن انہوں نے کلاسیکی افسانہ نگاروں کی طرح اپنا RANGE مقرر کر لیا ہے۔ عشق ازلی آہنگ ہے اور یہی اُن کا RANGE ہے۔ غیر عشقیہ کوائف، گاہ گاہ کی طرح ان کے کلام میں ملتے ہیں، لیکن یہ تو سوچیئے کہ "خود عشق حیاتِ انسانی کا کتنا بڑا مسئلہ ہے۔ . . . . عشق کوئی فیشن نہیں ہے جسے ہر چھٹے مہینے بدل دیا جائے۔ مجنوں کے لہجہ اور آپ کے لہجہ میں کوئی فرق نہیں۔ صرف اس کے فعالی اور انفعالی تاثرات میں فرق ہو سکتا ہے" ؎

کیوں نہ کریں اربابِ محبت، جان و دل سے ان کو قبول
درد کے کچھ پیغام ملے ہیں اور تمہارے نام سے ہیں

جوشِ ہجراں روک دیتا گردشِ افلاک بھی   کوئی کافر درمیانِ صبح و شام آ ہی گیا

غزل کے لئے تابش کردار کی گمبھیرتا ضروری سمجھتے ہیں۔ کوئی ابنِ آدم جو زندگی، عشق، تمدن، سماج اور تاریخ کے دھارے

سے خونچکاں گزرا ہو، غزل گوئی کے لئے موزوں ہے۔ ورنہ شعر بکھر جائیں گے اور موزوں نہ ہوں گے۔" غزل میں اسلوب پیدا کرنے کے لئے آدمی مظہر جان جاناں کی طرح گمبھیر شخصیت رکھتا ہو یا میر تقی میر کی طرح ایک دردمند دل یا غالب کی طرح شوخ و فطین ہو یا پھر فانی کی طرح یا مرد۔"

غزل میں قدیم و جدید کچھ نہیں۔ یہ صرف 'اسلوب' کا فرق ہے۔

"آج بھی میر، غالب اور فانی جدید ہیں' اور ہمیشہ رہیں گے۔ اسی طرح غزل کے باب میں عوامی اور غیر عوامی شاعری کا بیبل لگانے کے بھی تابش قائل نہیں۔ فنون لطیفہ میں سے ہر فن سے محظوظ ہونے کے لئے اس کے مبادیات کا علم ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ لیکن یہ مطالبہ صرف غزل ہی کے شاعر سے کیا جاتا ہے کہ ایسے شعر کہو جو' تانگے والے سے لے کر' ابوالسقراط" صاحب تک بیک وقت سمجھ لیں۔" اچھی شاعری کو قبول عام کی داد عوام سے نہیں، خواص سے ملتی ہے۔"

'آمد' اور' آورد' کی بحث بھی شعر گوئی کے باب میں بہت پرانی ہے لیکن اس سلسلے میں حسرت کے بعد، تابش نے جو بات کہی ہے وہ صرف ایسا شخص کہہ سکتا تھا جسے فن کی نزاکتوں کا پورا احساس ہو۔

'وہ لوگ جو آرٹ کو وجدانی اور محض وجدانی سمجھتے ہیں، آرٹسٹ اور آرٹ کے عوامل سے ناآشنا ہیں۔ میرے نزدیک آرٹ آمد اور آورد کی مجموعی صورت ہے۔ آمد سے میری مراد وہ وجدان ہے جو کسی تخلیق کے وقت آرٹسٹ پر طاری ہوتا ہے اور آورد سے میرا مطلب وہ محنت اور جفاکشی ہے جو اس وجدان کو متشکل کرنے میں اور اسے مقید کرنے اور گرفت میں لانے کے لئے کرنی پڑتی ہے۔" ہمارے موجودہ شعراء اس آورد سے کام نہیں لیتے۔ عرفیت کی اس منزل پر پہنچنے کے بعد جب رسالوں کے مدیر اُن کا کلام بلا تکلف چھاپنے لگتے ہیں وہ فن پر غور و فکر یا بقول تابش آورد کا صرف بند کر دیتے ہیں اور ان کا کلام پڑھنے والوں کے لئے وبالِ جان ہو جاتا ہے۔

غزل اور غزل گوئی کے اس مخصوص نظریہ کو سامنے رکھتے ہوئے "نیمروز" کا مطالعہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ فن کے باب میں وہ بڑے سخت گیر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل تعقید، ذم، تنافر صوتی، شکست ناروا اور شتر گربہ کے معائب سے یکسر پاک ہے۔ عروض پر بھی انہیں دسترس حاصل ہے، اور ایسی کہ بعض ناآشنا اور سرکش بحروں میں بھی انہیں شاعرانہ ابلاغ و اظہار میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ تبھی تو

ع نہیں بہار، نہ ہو، حسرتِ بہار بہت ہے

ع کشمکشِ دہر سے نجات نہیں ہے

ع دور، نیاز شعبدہ گر سے، دور

جیسی خطرناک بحروں سے تابش مشاق پیراک کی طرح پار اُتر گئے ہیں۔

تابش کا ڈکشن دراصل شیریں فارسیت سے مرکب ہے۔ چنانچہ ان کا کلام بہ اعتبار زبان نہ تو اوق کے ذیل میں آتا ہے اور نہ سہل ممتنع کی صف میں۔ اور جہاں تک سہل ممتنع کا سوال ہے وہ بڑے سے بڑے شاعر کے یہاں بھی شاذ ملتا ہے۔ کسی کا مستقل اسلوب نہیں۔ غزل گوئی کا متوازن آہنگ بھی یہی چاہتا ہے، زبان نہ تو فلسفہ و منطق کی ہو، نہ بالکل بازاری۔ تابش نے غزل کے مزاج کو سمجھتے ہوئے وہی درمیانی زبان استعمال کی ہے جس سے تغزل نکھرتا ہے ؎

وہ قریبِ خرمنِ تمکیں، کسی لہجے کی آنچ دھیما دھیما شعلۂ آواز یاد آتا رہا
ہوں پرستار اک مجسم حسن کا قد و گیسو و لب و رخسار کیا
تیرگی کے بعد خونی ہے اُفق ہیں نمایاں صبح کے آثار کیا

سست ہے سیل دروسینوں میں — دل گزرتے ہیں اب مہینوں میں
چھاؤں تری زلفوں کی دُور ہوتی جاتی ہے — میں جس تھا سکوں حاصل، اب وہ سائے ڈھلتے ہیں
اے بے خبر، وہ تیرے تغافل سے مٹ گئیں — اب لذتیں کہاں ہیں غمِ جاں گداز میں

مندرجہ بالا اشعار میں نے تابش کی زبان کے سلسلے میں نقل کئے ہیں۔ لیکن انہیں اشعار سے میں تابش کے نظریہ حسن و عشق کی بات دوبارہ چھیڑنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے غزل کے لئے عشق کو اپنا RANGE بنایا ہے۔ اس سلسلے کا سب سے پہلا شاعر مومن تھا اور تابش نے اپنی تاثر پذیری کے سلسلے میں مومن کا ذکر بھی کیا ہے۔ لیکن کیا ان اشعار میں مومن کی تقلید کا سُراغ ملتا ہے؟

تابش نے اکثر شعراء کا مطالعہ بڑے غور سے کیا ہے۔ لیکن وہ شعر کہنے میں اس کا پورا اہتمام کرتے ہیں کہ کسی خیال، کسی آواز، کسی لہجے کی بازگشت پیدا نہ ہو جائے۔ تابش نے عشق اور حُسن کو کس طرح محسوس کیا ہے اس کا اندازہ ماقبل اشعار سے ہوتا ہے اس کے ساتھ جن اشعار میں سیاسی یا سماجی مفہوم ادا ہوا ہے ان میں بھی انداز ابلاغ غمِ جاناں کا مرہون معلوم ہوتا ہے تابش کا عشق محبوب تک محدود نہیں۔ اس کی زد میں وہ خود بھی ہیں اور آپ بھی۔ اس لئے وہ آپ کو "ہم نفس" اور "ہم سخن" ہی کہتے ہیں۔

تابش کے چند عشقیہ شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

اب بھی آتا ہے خیال دل وحشی، لیکن — جس طرح ذہن میں بھولا ہوا نام آتا ہے
دوام ہجر ہے، اے جانِ آرزو مندان — اب اس سے بڑھ کے ترا انتظار کیا ہوگا
یہ متاعِ دل و جاں میری ہے — کوئی دزدیدہ نظر ہونے تک
آپ بدلیں نہ جفا کی عادت — دل کے انداز بدل سکتے ہیں
ترے قربِ حسیں سے، جو نشاطِ زندگی ٹھہرے — وہ لمحے بھی مری عمرِ گریزاں ہوتے جاتے ہیں
ایک بے نام تمنا کی بدولت کیا کیا — محو کر شرمندگیٔ شرح و بیاں ہوتی ہے

جب تابش پر غمِ دوراں کوئی تازہ ستم ڈھاتا ہے تو انہیں تسکین کے لئے بھی کوئی عشقیہ واردات، کوئی بھولی ہوئی چوٹ یاد آتی ہے ؎

یوں دل کا قرار لُٹ گیا ہے — گویا کوئی ساتھ چھُٹ گیا ہے
تازہ بھی کچھ تو ہیں افتاد اب کے — آپ بھی آئے بہت یاد اب کے

مندرجہ ذیل اشعار میں سماجی تنقید کا دھیما لہجہ اور شیریں طنز ملاحظہ فرمائیے ؎

منکرِ شعر ہوئے جاتے ہیں تابش احباب — نا رسا شاعری الہام ہوئی جاتی ہے
شکست دل کی اک اک آہ میں آواز آتی ہے — مگر دنیا، کہیں خونِ ستم سے باز آتی ہے
تنہا تابش اک بے چارہ ہے — رکھنا یارب خیر کی تیرے دُور
آپ بدلیں نہ جفا کی عادت — دل کے انداز بدل سکتے ہیں
نہ راس آج تک آیا ہمیں کوئی ماحول — اک آشیاں کے لئے بارہا چمن بدلے

اب میں تابش کے چند ایسے اشعار پیش کروں گا جن میں سرچشمۂ خیال روایتی معلوم ہوتا ہے لیکن اسلوب اور نئے نقطۂ نظر نے اشعار کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے ؎

رضائے دوست مری بندگی پہ ہے موقوف   یہ اختیار، بصد جبر، اختیار ہوا
فائدہ وحشت سے کچھ ہو، یا نہ ہو   کم سے کم موسم کا اندازہ رہا
دل کی امیدواریاں نہ گئیں   اس کرم کا کوئی ٹھکانہ تھا
بے جنوں، جامہ تار تار کیا   جب خزاں کو کہیں بہار کیا
دیدۂ قیس بند ہے شاید   پردے اٹھے ہوئے ہیں محمل کے
پاؤں کے ذرّے ہوئے ہیں آفتاب   سر سے اٹھا سایۂ دیوار کیا

آخر میں چند متفرق اشعار پیش کرتا ہوں جن سے تابش کے فکر و فن کی نمائندگی ہوتی ہے ؎

زبانِ حال سے سمجھا وہ میری محرومی   خدا کا شکر کہ پیرایۂ سخن بدلا
کوئی دیوانہ گزرا آبلہ پا   کہ سیل رنگ ویرانے سے گزرا
اے دردِ عاشقی تری غیرت کو کیا ہوا   جیتے ہیں زندگی کو سہارا سمجھ کے ہم
مے کشو، احتیاط، ٹھیس نہ آئے   ہاں کھنک سی ہو آبگینوں میں
اس وقت ہوا کا رُخ بدل جائے   ممکن ہے کوئی چراغ جل جائے
موسم گل سے فقط اتنا ہوا   کچھ شہیدوں کا لہو تازہ رہا

رازؔ مرادآبادی

سید مسعود الحسن تابشؔ دہلوی

میں علی گڑھ یونیورسٹی کا طالب علم تھا۔ شاید ۱۹۳۷ء میں علی گڑھ کی نمائش میں ایک آل انڈیا مشاعرہ ہوا تو دہلی سے ایک نوجوان سال شاعر بھی اس محفل میں شرکت کے لئے آئے۔ صابر دہلوی سے میری اس سے پہلے ملاقات ہو چکی تھی۔ یہ صاحب حیدرآبادی کاٹ کی شیروانی پہنے اور حیدرآبادی قسم کی ٹوپی سر پر دھرے نہایت لئے دیئے مشاعرہ میں بیٹھے تھے۔ میں نے اپنی زبان میں ان صاحب کی طرف اشارہ کرکے یا تو روشؔ مرحوم یا صابرؔ سے پوچھا۔ "یہ ثقہ شاعر کون ہے؟" تو انہوں نے کہا۔ ارے تم نہیں جانتے یہ حضرت تابشؔ دہلوی ہیں، اور حیدرآباد میں مقیم ہیں۔ آج کل گھر آئے ہوئے تھے تو ہم لوگ انہیں بھی لے آئے۔ ان حضرت نے میری اُردوئے معلیٰ کا تذکرہ سن رکھا تھا، فوراً ہاتھ بڑھایا اور نہایت خوش دلی سے میری زبان میں اپنا تعارف کرایا۔ پھر بات آئی گئی ہو گئی۔

فانیؔ بدایونی کے انتقال کے بعد خیال آیا کہ علی گڑھ میگزین کا ایک نمبر شائع کیا جائے۔ میں اس زمانے میں میگزین کا مدیر تھا۔ چنانچہ ایسے اصحاب کو خطوط لکھے جن کا جناب فانیؔ سے گہرا تعلق تھا۔ ماہر القادری مرحوم کی زبانی تابشؔ صاحب کے بارے میں علم ہوا تو میں نے انہیں بھی خط لکھا۔ اس وقت موصوف آل انڈیا ریڈیو سے خبریں پڑھنے پر مامور ہو چکے تھے۔ میں نے درخواست کی اور تابشؔ بھائی نے اپنا مضمون بھیج دیا۔ جو میگزین میں دوسرے اکابرین و عشاقِ فانیؔ کے ساتھ شائع ہو گیا۔ اب ہم ایک دوسرے سے خاصے قریب آ چکے تھے لیکن ابھی ملاقات تک کی نوبت نہیں آئی تھی۔ اتفاق دیکھئے کہ ۱۹۴۳ء میں ایک تقریر کے سلسلے میں آل انڈیا ریڈیو دلّی جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ میں مسلم یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کر رہا تھا۔ میری تقریر بڑے بخاری صاحب نے بھی سنی اور مجھے اپنے کمرے میں بٹھا کر مجھ سے باتیں کیں اور پھر رشید صدیقی مرحوم کو خط لکھا کہ مجازؔ کی تو ہم قدر نہ کر سکے لیکن یہ میرا وعدہ ہے کہ اگر آپ نے رازؔ کو ہمیں دے دیا تو ہم اس کی ناز برداری میں کسر نہ اٹھا رکھیں گے۔ غرض اس طرح ہم پروگرام اسسٹنٹ ہو کر دلّی اسٹیشن پر تعینات ہوئے تو شاہدؔ بھائی، اخلاق احمد دہلوی، ن۔م۔ راشد، انصار ناصری، تابشؔ بھائی، اپندر ناتھ اشکؔ، میراجی اور نہ معلوم کس کس سے ملے اور گھل مل گئے۔ اور آج تک وہی رسم و راہ چلی آتی ہے۔

ایک دن سید مسعود الحسن تابشؔ سے ریڈیو میں ملازمت کا ذکر چل نکلا تو کہنے لگے 'میاں جو حادثہ تمہارے ساتھ پیش آیا اُس سے بڑا لطیفہ ہماری ملازمت کا ہے۔ میں نے کہا بتایئے۔ کہنے لگے تم تو اسٹوڈیو سے پکڑ میں آئے، ہمیں بخاری صاحب نے اپنے گھر میں گرفتار کیا تھا! کے ہاں ماہانہ ادبی محفلیں ہوتی تھیں، جن میں ڈاکٹر تاثیر، ن۔م۔ راشد، میراجی، کرشن چندر اور اُس وقت کے بہت سے ادیب اور شاعر جایا کرتے تھے۔ شاہدؔ بھائی مرحوم کے ساتھ ہم بھی وہاں گئے۔ وہاں طریقہ یہ تھا کہ لوگ اپنی تحریریں اور شعر سناتے اور پھر اس پر تبادلۂ خیالات ہوتا۔ یعنی حلقۂ اربابِ ذوق

والا معاملہ تھا۔ ن۔ م۔ راشد نے نظم پڑھی اور ریکٹ چھرائی توین نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔ مجھے اس وقت یہ خبر نہ تھی کہ بخاری صاحب کی توجہ خصوصی طور پر میری آواز پر ہے۔ جب محفل ختم ہوئی تو بخاری صاحب نے شاہد احمد دہلوی مرحوم سے کہا کہ تابش صاحب کا کیا شغل ہے۔ انہوں نے بتایا کہ حیدرآباد دکن میں ملازم ہیں۔ لیکن یہ حضرت اپنی والدہ کے اکلوتے صاحبزادے ہیں۔ والدہ کی خواہش ہے کہ حیدرآباد کے بجائے یہیں رہیں خواہ کم ہی کمائیں۔ بخاری صاحب نے زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ کہا: شاہد صاحب، انہیں کل ریڈیو سٹیشن لے آئیے۔" چنانچہ ہم ریڈیو اسٹیشن پہنچے تو بڑے بخاری صاحب نے ہماری بڑی خاطر مدارات کی اور دلی کے اسٹیشن ڈائرکٹر رشید احمد کو فون کر کے کہا کہ ہم لوگ فلاں اسٹوڈیو میں جا رہے ہیں، آپ بھی آ جائیں۔ ابھی تک مجھے یہ علم نہ تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔ تو مجھے ایک اسٹوڈیو میں بٹھا دیا گیا۔ اور کہا کہ ایک دو شعر کسی شاعر کے پڑھیں۔ اس وقت میرے ذہن میں داغ کا یہ مقطع آیا ؎

جو گزرتے ہیں داغ پر صدمے
آپ بندہ نواز کیا جانیں

اس کے بعد مجھ سے کہا گیا کہ یہی شعر مختلف لہجوں میں پڑھوں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ اب شاید یہ لوگ میرے لہجے اور آواز دونوں سے مطمئن ہو چکے تھے۔

بخاری صاحب نے مجھ سے کہا: "تابش صاحب، ہم یہ چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے ہاں سے خبریں پڑھیں اور ادبی اعلانات کریں۔ اور ہم فوری طور پر ڈیڑھ سو روپیہ آپ کو پیش کر سکیں گے۔ میں نے کہا والدہ سے دریافت کر کے دو تین دن میں جواب دوں گا۔ والدہ کے لئے یہ خبر ایسی تھی کہ جیسے انہیں گوہر مقصود ہاتھ آگیا ہو۔ چنانچہ ہم نے ہامی بھر لی۔

یہ واقعہ شاید اکتوبر ۱۹۴۱ء کا ہے اور ۱۹۴۷ء تک ملک ستمبر ۱۹۴۷ء تک ہم تھے اور خبریں اور ادبی اعلانات۔

میں تو ۱۹۴۵ء کے اواخر میں تبدیل ہو کر آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ چلا گیا مگر تابش بھائی دلی ہی میں رہے۔ پھر اُن سے اس وقت ملاقات ہوئی جب ۱۹۴۸ء کے ڈان مشاعرہ میں شرکت کے لئے میں ڈھاکہ سے کراچی آیا۔ تو ان حضرت کو ریڈیو پاکستان کراچی سے وابستہ دیکھا۔ جب دو یار ملتے ہیں تو بہت سی باتیں ہوتی ہیں۔ چنانچہ آل انڈیا ریڈیو دلی کا ذکر چھڑا تو کہنے لگے ہم لوگوں نے کیا زمانہ دیکھا ہے۔ حسن نظامی، رشید صدیقی، پروفیسر مجیب، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں جیسے لوگ تقریریں کرتے تھے۔ دفتر میں محمود نظامی، رشید صاحب، بخاری صاحب، انصار ناصری، ن۔ م۔ راشد، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، میراجی، ابو سعید قریشی اور حامد علی خاں جیسے ادیبوں کی صحبتیں میسر تھیں گانے والوں میں ہندوستان بھر کے اساتذہ فن یک جا ملتے تھے۔ فن کاروں میں تاج، محمد حسین، ایس ایس ٹھاکر، فاطمہ خانم، اختری بیگم اور صفیہ معینی جیسی آوازیں موجود تھیں وہ صحبتیں اور وہ محفلیں یاد آتی ہیں تو دل تڑپ کر رہ جاتا ہے۔

پھر کہنے لگے ریڈیائی زندگی کا ایک دن تو میرے لئے وہ خوبصورت ترین دن تھا جب ۳۔ جون کو حکومت برطانیہ نے پاکستان بننے کو تسلیم کر لیا تھا۔ اور حکومت برطانیہ کی طرف سے وائسرائے نے تقریر کی تھی، کانگریس کی طرف سے جواہر لال نہرو نے، مسلم لیگ کی طرف سے قائداعظم نے اور اقلیتوں کی طرف سے سردار بلدیو سنگھ نے۔ یہ ساری تقریریں انگریزی میں تھیں اور وائسرائے نے انہیں خود VETT کیا تھا۔ قائداعظم کی تقریر کا ترجمہ انصار ناصری نے کیا تھا اور انہیں کو پڑھنا تھا۔ سردار بلدیو سنگھ کا ترجمہ مجھے یعنی تابش دہلوی کو پڑھنا تھا اور جواہر لال کا ترجمہ شکیل احمد کو پڑھنا تھا۔ ہم لوگ اسٹوڈیوز میں تیار بیٹھے ہیڈ فون لگائے ہر ایک کی انگریزی تقریر سُن رہے تھے کہ میں نے سنا کہ قائداعظم نے تقریر کے آخر میں "پاکستان زندہ باد" کہا۔ یہ لفظ تقریر کے اصل متن میں موجود نہ تھا۔ مجھے یہ بات بے حد پسند آئی اور میں فوراً اٹھ کر بھاگا۔ اور انصار ناصری کے اسٹوڈیوز میں دبے پاؤں پہنچ کر کاغذ کے پُرزے پر "پاکستان زندہ باد" کے الفاظ لکھ کر اُن کے سامنے رکھ دیا۔ وہ بڑے سٹپٹائے مگر میں نے

اشارے سے کہا کہ یہ الفاظ قائد نے اپنی تقریر میں کہے ہیں۔ جان جائے مگر یہ لفظ بہرحال ادا کرنے ہیں۔ اور اس وقت دل باغ باغ ہوگیا جب الصار ماہری نے ملازمت کی پروا کئے بغیر یہ لفظ اپنے ترجمے میں شامل کر لئے۔ اب تو تحریک پاکستان کی تاریخ پر بھی یہ واقعہ مرقوم ہے۔

جس زمانے میں تابش دہلوی نے ملازمت شروع کی تھی اس زمانے میں مہرا سب سے اچھا اناؤنسر تصور کیا جاتا تھا۔ چنانچہ ابتدائی چند دن مہرا ہی نے تابش صاحب کو اس فن سے روشناس کرایا۔ پھر ۱۹۴۷ء کے اواخر کا ذکر کرتے ہوئے ستمبر ۱۹۴۷ء کے بارے میں کہنے لگے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں کا نئی دلی میں قتل عام ہو رہا تھا۔ میں ڈیڑھ بجے کے قریب دفتر پہنچا تو مسٹر بکنش ڈی جی کو ایسا منتظر پایا۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ میری گاڑی میں بیٹھو۔ میں تمہارے گھر چھوڑے آتا ہوں اور جب تک میں دوبارہ گاڑی نہ بھیجوں دفتر نہ آنا۔ اب مسلمانوں کے لئے صورت حال دلی میں بے حد خراب ہو چکی تھی۔

چنانچہ ۱۷ ستمبر کو ہم لوگ گھر سے نکلے اور ایک ٹرین کے ذریعے لاہور آ گئے۔ اس وقت ہم کئی وقت کے فاقے سے تھے۔ صرف تن کے کپڑے جو میلے ہو چکے تھے وہ ہمارا اثاثہ تھے۔ ایک دوست نے اپنے گھر ٹھیرایا۔ ہمت بندھائی اور میں نے ریڈیو پاکستان کا رُخ کیا کہ ایک وہی ٹھکانہ ایسا تھا جہاں میں لوگوں کو جانتا تھا۔ یہاں سب نے میرا خیر مقدم کیا اور مجھے یکم اکتوبر سے پھر سے ملازم رکھ لیا۔ اس لئے کہ اس وقت تک اسٹاف آرٹسٹوں کی نوکری پکی نہیں تھی۔ اور پھر ۱۹۴۷ء سے ۱۹۸ء تک میں نے ریڈیو پاکستان، کراچی میں ملازمت کی اور اب بفضلہ ریٹائر ہو گیا۔

میں نے ہوائی لطیفوں کے بارے میں سوال کیا تو بولے ' اسے ہم ریڈیائی شرارت کہتے ہیں۔ ہم نے تو تمہارے استاد، رشید صاحب تک کو نہیں چھوڑا۔ ایک دن ولایت خاں ستار پر کا نگڑا بجا رہا تھا اور اس کے فوراً بعد رشید صدیقی کی تقریر تھی۔ میں نے اعلان کیا ابھی آپ پروفیسر رشید صدیقی سے ستار پر راگ کا نگڑا سن رہے تھے، معاف کیجئے ' ابھی آپ استاد ولایت خاں سے ستار پر راگ کا نگڑا سن رہے تھے۔ اب رشید صدیقی صاحب سے ملال چھوڑ دی پر بات چیت سنیں '۔

رشید صاحب نے یہ اعلان سنا تو مسکرائے اور تقریر کے بعد کہنے لگے۔ تابش صاحب ' ہم سے بھی مذاق۔ پھر کہنے لگے اس سے بڑا لطیفہ تو اس دن ہوا جس دن جرمن نے ہتھیار ڈالے۔

۱۹۴۵ء کا ذکر ہے پہلے شاہ برطانیہ نے تقریر کی۔ اس کے بعد چرچل نے تقریر کی۔ اس کے فوراً بعد میں [illegible] روشنی ملی تو ہم نے اعلان کیا " چلو کاہے کو جھولی سادھ تیاں " اور وقفہ دے کر میں نے کہا: یہ اس دادرے کے بول ہیں جو آپ گلاب بائی سے سنیں گے۔

تابش بھائی ' آل انڈیا ریڈیو میں تو آپ نے ۳ جون کا اعلان کیا تھا۔ ریڈیو پاکستان میں بھی کوئی ایسا واقعہ یاد ہے۔

' راز صاحب، یاد کیوں نہیں۔ یہاں بھی دو موقعے ایسے آئے جو زخم بن کر دل پر آج تک کھٹک رہے ہیں۔ ایک اعلان تھا حضرت قائد اعظم کی رحلت کا، اور دوسری خبر جس نے دل خون کر دیا وہ پہلے وزیر اعظم جناب لیاقت علی خاں کی شہادت کی خبر تھی۔ یہ دونوں باتیں آج بھی یاد آ جاتی ہیں تو بے حد ملال ہوتا ہے۔ مگر خبر سناتے وقت تو نیوز ریڈر اپنی آواز سے نہ غم کا تاثر دے سکتا ہے نہ خوشی کا۔"

اچھا، اب تابش بھائی آپ کو اپنے جو شعر پسند ہیں ذرا وہ تو لکھا دیں۔

" راز صاحب، اگر آپ اسے تعلّی نہ سمجھیں تو میں یہ کہوں گا کہ شاید یہ شعر اردو شاعری میں نئے ہوں ؎

دولتِ نکہتِ گُل صبح کو ہوگی تقسیم
ہم پہنچ جائیں گلستاں میں صبا سے پہلے

⁂

فائدہ وحشت سے کچھ ہو یا نہ ہو   کم سے کم موسم کا اندازہ رہا

لب پہ دنیا کی شکایت بھی نہیں　　　　ہو گئے ہیں ہم بھی دنیادار کیا

❖

ترا وصال تو کس کو نصیب ہے لیکن　　　　ترے فراق کا عالم بھی کس نے دیکھا ہے

❖

اپنے دشمن سے ہوں واقف تا حشر　　　　کسی دیرینہ شناسا کی طرح

❖

ساقی تو ہی روکے گا اس گردشِ دوراں کو　　　　آخر ترے ہاتھوں سے پیمانہ گزرتا ہے

"اور لگے ہاتھوں آج کل کے مشاعروں کے بارے میں ایک دو باتیں ہو جائیں۔"

"آج کل کے مشاعرے تو دنگل ہوتے ہیں۔ ہر روایت اور تمام آداب سے عاری۔ آج کل کے شعراء فنِ شعر سے نابلد ہیں۔ البتہ گروہ بندی میں طاق اور انجمنِ تحسینِ باہمی کے ممبر ہیں۔ ایسی صورت میں ہم جیسے لوگ جنہوں نے بزرگوں کی آنکھیں دیکھی ہیں کیسے خوش ہو سکتے ہیں۔"

"اب ریڈیو سے فارغ ہو کر کیا کرنے کا ارادہ ہے؟"

"راز بھیا، وہ ادبی کام سمیٹ رہا ہوں جو ریڈیو کی ملازمت کی نذر ہو گیا تھا حالانکہ وہی کام میری شہرت کا سبب تھے یعنی میری شاعری اور وہ مضامین جو میں نے ان بزرگوں کے بارے میں لکھے تھے جن سے میں نے بھی کچھ سیکھا ہے۔ اب وقت میسر آیا ہے تو ان پر نظر ڈال رہا ہوں تاکہ یہ قرض اپنے سر سے اتار دوں اور انہیں کتابی شکل دے دوں۔"

"خدا آپ کو اس کارِ خیر میں کامیاب کرے! اچھا، خدا حافظ۔ یار زندہ صحبت باقی۔"

سحر انصاری

تابش دہلوی کی شاعری

تابش دہلوی ہمارے شہر کی ایک ثقہ ادبی شخصیت ہیں۔ دہلی، حیدرآباد دکن اور کراچی۔ شہروں کی ایک ایسی تہذیبی تثلیث ہے جس کی جھلک تابش صاحب کی وضع داری اور شاعری دونوں میں ملتی ہے۔ وہ ایک پختہ قادر الکلام شاعر ہیں اور دیگر اصناف سخن کے ساتھ ساتھ غزل سے ان کی طویل وابستگی بجائے خود ان کی انفرادیت کا اشارہ بن چکی ہے۔ اس طویل عرصے میں تابش صاحب نے زمانے کے بھی کئی رنگ دیکھے ہیں اور غزل کے بھی لیکن انہوں نے نہ زمانے کے تغیر سے ایسی کوئی تبدیلی قبول کی کہ انکی اپنی پہچان جاتی رہے اور نہ غزل کے ہر نئے رنگ پر فریفتہ ہونے کی کوشش کی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ تابش صاحب اپنے عہد کے ان چند ممتاز غزل گو شعرا میں سے ہیں جن کی شخصیت کا بھی ایک اعتبار ہے اور غزل کا بھی۔

تابش صاحب کی غزل اُن کی شخصیت کا پرتو لئے ہوئے ہے۔ ان کی غزل میں وہی متانت، سنجیدگی اور نرمی ہے جو ان کی شخصیت اور زندگی کے عام آداب میں نظر آتی ہے۔ تابش دہلوی کی غزل غم ذات، غم کائنات، عشق، تفکر، اخلاقیات، تصوف یا فلسفہ میں سے کسی ایک موضوع کے گرد گھومنے والی نہیں ہے۔ ان کی غزل میں خاصا تنوع ہے اور تنقید کی مروجہ آسانیوں کی رُو سے ان کی غزل کو کسی ایک خانے میں رکھ کر دیکھنا ممکن نہیں ہے۔

تابش دہلوی ایک حساس، سنجیدہ اور صاحب نظر شاعر کی حیثیت سے زندگی کے ہر پہلو پر غور کرتے اور جذبے اور فکر کی ہم آہنگی سے اپنے تجربات کو غزل کے رنگ میں پیش کرنے کی طرف توجہ دیتے ہیں اُن کی غزل کسی فیشن کی پابند نہیں ہے۔ نہ وہ اتنے قدیم اور روایتی ہیں کہ ان کی غزل کو عجائب خانے کے نوادر میں شمار کیا جائے اور نہ اتنے جدید کہ تقویم کی طرح اسے بدلتے چلے جائیں۔ تابش صاحب نے قدیم و جدید اور روایت و تجربے کے مابین ایک توازن قائم کیا ہے۔ اس عمل میں ان کے مزاج کو بڑا دخل ہے جو ہر قسم کی افراط و تفریط سے گریزاں ہے۔

تابش صاحب اکثر کہا کرتے ہیں "بھائی، کرنے کی ود یا ہے"۔ انہوں نے خود بھی اپنے خاندانی بزرگوں شمس العلماء منشی ذکاء اللہ اور مولوی عنایت اللہ دہلوی کی شہرت سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا بلکہ اپنی انفرادی جدوجہد سے خود اپنے لئے ایک مقام پیدا کیا ہے۔ ان کی غزل کا مزاج بتدریج ایک انفرادیت کے رنگ میں ڈھلا ہے۔ "نیم روز" تابش صاحب کا پہلا مجموعہ ہے جس سے ان کا رنگ تغزل بطور خاص نمایاں ہوا، لیکن تازہ مجموعہ "چراغِ صحرا" زیادہ نکھرا ہوا اور تابش صاحب کی تخلیقی اپج کو زیادہ بہتر طریقے سے سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

ن م۔ راشد نے اپنے ایک مضمون میں آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت کے دوران پیش آنے والے ایک واقعے کو یوں بیان کیا ہے:۔

'ایک مرتبہ مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین دلی ریڈیو اسٹیشن پر تشریف لائے۔ میں نے اپنے عزیز دوست تابش کا اُن سے تعارف کراتے ہوئے کہا، ڈاکٹر صاحب یہ تابش دہلوی ہیں۔ ہمارے بہت اچھے اناؤنسر۔ فانی بدایونی کے رنگ میں شعر کہتے ہیں (تابش کو اس بات پر بڑا ناز تھا)۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا، لیکن کیا حرج ہے اگر اپنے رنگ میں شعر کہیں؟'

مجھے اس واقعے کی یاد یوں آئی کہ اس کے حوالے سے میں تابش دہلوی اور غزل کے بارے میں شاید کچھ کہہ سکوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ آج کل ادبی حلقوں میں فانی کی غزل کو کس نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ لیکن ان کے اندازِ بیان سے اگر ایک طرف فراق کو تازہ کاری کی خوشبو آئی تو دوسری طرف مجاز اور جذبی ایسے صاحبِ اسلوب شعراء نے بھی فانی سے گہرا اثر قبول کیا۔ ممکن ہے ایک زمانے میں فانی سے اپنی قربت کی بنا پر تابش صاحب ان کے رنگ میں شعر کہنے پر ناز کرتے ہوں۔ لیکن بات بنیادی وہی ہے جو ڈاکٹر صاحب نے کہی تھی یعنی اپنے رنگ میں شعر کہنا۔ میں سمجھتا ہوں کہ تابش صاحب کی غزل پر شاید اسی لئے گفتگو ممکن ہے کہ انہوں نے اپنے رنگ کو نمایاں کرنے کی سعی کی ہے۔

فانی بدایونی اور تابش دہلوی کے مزاج، ذاتی واقعات و احساسات، عہد اور حیثیت میں بہت فرق ہے۔ اگر وہ فانی کے ظاہری رنگِ سخن پر مائل رہتے تو شاید انہیں فانی کی آوازِ بازگشت سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا لیکن ان کی غزل ایک اور ہی رنگ و آہنگ کی آئینہ دار ہے جو خود تابش دہلوی کا ہے۔

فانی کو جب میں غزل کے ایک صناع (CRAFTSMAN) کی حیثیت سے دیکھتا ہوں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اُردو غزل کی دو دھاراؤں یعنی میر اور غالب کو تخلیقی سطح پر انہوں نے یکجا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ عمل جزوی طور پر ہوا ہے ورنہ اس امتزاج کے بعد تو فانی کو ان دونوں سے بڑا شاعر ہو جانا چاہیئے تھا۔ تابش دہلوی کے یہاں اگر فانی سے متاثر ہونے کی کوئی مماثلت مجھے نظر آتی ہے تو یہی کہ وہ اپنی غزل کے لب و لہجے میں میر اور غالب کو تخلیقی سطح پر یکجا کرنا چاہتے ہیں۔ اس میں شاید اس بات کا دخل ہو کہ تابش صاحب دلی والے ہیں اور ان کی ذہنی تربیت میر اور غالب کے لب و لہجے کے سائے میں ہوئی ہو۔

تابش صاحب کی غزل میں ان اجزا کے علاوہ، جن کا ابھی ابھی تذکرہ ہوا ہے، اپنے عہد کے مسائل سے آگہی اور اپنے عہد کے طرزِ سخن سے باخبری کے اشارے بھی ملتے ہیں۔ اس طرح تابش دہلوی کی غزل کا خمیر ایک ایسے اسلوب سے اٹھا ہے جسے ان کی شاعرانہ صلاحیت، لطافتِ احساس اور شعورِ زبان و بیان نے ایک مدت میں تشکیل دیا ہے۔

تابش صاحب کی شاعری غزل اور نظم کی کئی صورتوں پر مشتمل ہے۔ ان کی شاعری اور تنقیدی مضامین کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے تخلیق کے عمل اور اس سے وابستہ عوامل پر خاصا غور و خوض کیا ہے۔ ان کے اسلوب میں وجدان کی بے ساختہ کارفرمائی کے ساتھ ساتھ ایک شعوری صناعی بھی ملتی ہے۔ ان کی غزل کلاسیکی روایتوں سے ہم رشتہ ہے لیکن یہ کلاسیکی روایتوں کی نقالی نہیں ہے بلکہ روایت کو ایک تسلسل میں برتنے کے علاوہ اپنی انفرادیت کے خد و خال کو واضح کرنے کا عمل بھی اس میں شامل ہے۔

تابش دہلوی کے یہاں تجربے کے معنی تبدیلیٔ ہیئت نہیں ہے بلکہ ایک اندرونی کیمیا گری ہے جس کے نتائج کو تخلیقی سطح پر منتقل کرنے کے لئے وہ لفظوں کے بہت موزوں اور متناسب سانچے تلاش کرتے ہیں۔ تابش صاحب کو لفظوں کے انتخاب اور استعمال کا خاص ملکہ ہے۔ اس سلیقے سے لفظ برتتے ہیں کہ اس کے ظاہری اور معنوی حسن میں ایک خوش گوار جہت کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ ان کی غزل کے اسلوب کا ایک خاص جزو PARADOX ہے جس سے وہ ایک لطیف احساس پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ چند شعر دیکھئے:-

نیم روز

فائدہ وحشت سے کچھ ہو یا نہ ہو   کم سے کم موسم کا اندازہ رہا

ہزار دیدہ و دل فرشِ راہ تھے لیکن   بقدرِ شوق ترا انتظار ہو نہ سکا
گزرا اسی پہ سہل ہے طوفانِ رنگ و بو   جو موسمِ بہار میں دیوانہ بن گیا

چراغِ صحرا

دل ہمہ زخم زخم ہے، لیکن   اس سے اندازۂ نمو تو ہوا
بازگشتِ شورِ غرقابی سہی   کوئی تو آواز ساحل سے اٹھی
اک خوابِ اجل ہی سہی ختمِ شبِ فرقت   جھونکا کوئی آیا تو نسیمِ سحری کا

اس حیثیت میں تابش صاحب کے مزاج کی کلید مضمر ہے۔ وہ زندگی میں ایک حرکت، مثبت تغیر اور تبدیلی کے خواہاں ہیں خواہ یہ تبدیلی کسی منفی صورتِ حال کے حوالے ہی سے کیوں نہ آئی ہو۔ اس انداز کے اشعار تابش صاحب کے یہاں خاصی تعداد میں ہیں۔

ایک ایسے دور میں جب زبان کو بہت کم شاعر اور ادیب اہمیت دے رہے ہیں، تابش دہلوی کے یہاں ایک سلیقہ، فن کارانہ دیانت داری اور لفظوں کی جمالیات کا شعور ملتا ہے۔ دراصل زبان کے سلسلے میں ایک انتہا پسندانہ رویہ تو وہ تھا جب ' خالص زبان ' کے شعر ساری طرزِ ادا کو ایک چٹکلہ بنا دیتے تھے اور اب دوسری انتہا وہ ہے کہ ہر شخص اس فکر میں ہے کہ کسی طرح نئی زبان لکھ کر دکھائے۔ چنانچہ حال ہی میں ایک شاعر نے 'کہکشاں' کا قافیہ لکھ کر نوٹ لگا دیا کہ میرے خیال میں اس سے بھی کہکشاں کا مفہوم ادا ہو جاتا ہے۔ ایسے رویے کو زبان کے سلسلے میں ' انارکی ' سے تعبیر کرنا مناسب ہوگا۔ اس فضا میں تابش صاحب اور ان کی قبیل کے بعض شعرا کا دم بہت غنیمت ہے اور تنہا اسی خصوصیت کے پیشِ نظر ان کی غزل کا مطالعہ کیا جائے تو غزل کے ایک دلکش اور متناسب طرز کا قائل ہونا پڑے گا۔ یہاں تفصیل کا موقع نہیں لیکن اپنے خیالات کی تائید میں چند اشعار پیش کرنا چاہوں گا جس سے تابش صاحب کی غزل کا طرز شاید نمایاں ہو سکے۔

اک کفِ خاک ہی صحرا نہیں   کون یہاں خاک بسر ہو گیا
ہو گئی ساری زندگی تعبیر   اتنا دیکھا ہے ہم نے خواب ان کا
ہیں بظاہر سکوں سے جو لوگ   کس نے دیکھا ہے اضطراب ان کا
سربستہ راز ہائے چمن فاش ہو گئے   کھلنے نہ پائے تھے ترے بندِ قبا ابھی
حال یوں بھی کہا نہیں اپنا   کوئی قصہ نیا نہیں اپنا
محرومیوں نے خوب پناہیں تلاش کیں   میں تھک گیا جہاں اسے منزل کہا گیا
اندازۂ عافیت کا اک وقت تھا ہمیں   جب سیلِ ناگزشتہ کو ساحل کہا گیا
یقیں کسی کو نہیں میری تیرہ روزی کا   حقیقتوں نے فسانہ بنا دیا ہے مجھے
یہ ذائقہ مرے لہجے میں کچھ یوں ہی تو نہیں   غمِ حیات نے اپنا مزہ دیا ہے مجھے
تری حدیثِ محبت رہے سدا رنگیں   دلِ فسردہ میں اتنا لہو تو اب بھی ہے
مرے وطن کی فضاؤں میں کیوں ہے سناٹا   سب اہلِ حق تو ابھی حلقۂ رسن میں نہیں
غرض ہنر کے ساتھ نبھے وضعِ عشق بھی   تابش تری طرح سے غزل خواں کوئی تو ہو

غزل اپنی ایمائیت اور رمزیت کے ہزار رُوپ رکھنے کے باوجود کہیں کہیں یہ احساس دلاتی ہے کہ 'کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے' تابش صاحب بھی اس احساس سے نہیں بچ سکے۔ اس کا اندازہ ان نظموں سے ہوتا ہے جو 'غبارِ انجم' میں شامل ہیں۔ یہ نظمیں

موضوعات کا تنوع لیے ہوئے ہیں۔ ان میں قومی و ملی کے ساتھ ساتھ رومانی اور فلسفیانہ موضوعات بھی ہیں۔ تابش صاحب کی نظموں میں بھی تشبیہات و استعارات کی تازگی ملتی ہے اور وہ بیانیہ انداز کو طول دینے کے بجائے ایجاز و اختصار سے کام لیتے ہیں۔ اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے غزل کی رمزیت نے یہاں بھی ساتھ نہیں چھوڑا۔ نظم "عورت" کے یہ شعر دیکھئے ؎

نغمے کی طرح زبانِ احساس　　خوشبو کی طرح متاعِ انفاس
یک میکدہ سرخوشی سراسر　　یک بوستاں تازگی برابر
بھٹکے ہوئے راہرو کا صحرا　　تشنہ دہنی کو موجِ دریا
پھیلے تو مثالِ دامنِ ہوش　　سمٹے تو بہت ہی تنگ آغوش

غالب پر ایک قصیدہ غالب ہی کی زمین میں کہا ہے اور مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ غالب پر لکھی جانے والی چند تخلیقی نظموں میں اس کا شمار ہونا چاہئے۔ یہ محض رسمی اظہارِ عقیدت سے آگے کی چیز ہے۔ اسی قصیدے میں ایک غزل بھی آتی ہے۔ اس کے یہ شعر دیکھئے

مل گئی وحشی کو سودا سے نجات　　در کھلا دیوار میں یا سر کھلا
ہے قیامت اس کی مژگاں کا خیال　　رکھ دیا ہے دل میں اک نشتر کھلا

اس مجموعے کی چند قابلِ ذکر نظمیں "مسافر"، "حضرت فانی بدایونی کی موت پر"، "جیون - تین روپ"، "معدلت"، "میراثِ آدم"، "ترغیب" ہیں۔ ایک نظم جنگ جو اقوامِ عالم کے نام ہے۔ اس میں تابش دہلوی نے آزاد نظم کا پیرایہ اختیار کیا ہے اور یہ اپنے موضوع اور اندازِ بیان کے لحاظ سے ایک کامیاب نظم ہے۔

"تقدیس" میں نعتیں بھی ہیں اور ایک مرثیہ "آگ" کے عنوان سے ہے جس کے بیاسی بند ہیں۔ اس میں بھی تابش صاحب کی قادر الکلامی نمایاں ہے۔ مرثیہ لفظی و معنوی محاسن کے ساتھ ساتھ حسنِ تاثیر کا بھی حامل ہے۔ "غبارِ انجم" تابش صاحب کی شاعری کے سارے رنگوں کی ایک قوسِ قزح ہے۔ اس کے رنگ الگ الگ بھی خوب ہیں اور ان کا مجموعی حسن بھی ایک دل کش اکائی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

ادریس صدیقی

جائزہ

تابش دہلوی سے میں پہلی بار ملا تو ان کی شرافت سے متاثر ہوا۔ دوسری ملاقات میں ان کی ذہانت کا قائل ہونا پڑا۔ اور تیسری ملاقات میں ان کی وضعداری کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو گیا ـــــ یہ ابتدائی ملاقاتیں ماضی کے دھندلکوں میں تحلیل ہو چکی ہیں اور ان کی تفصیلات پر دبیز پردے پڑ چکے ہیں لیکن میرے تاثرات آج بھی وہی ہیں اور میں انہیں ایک شریف، ذہین اور وضعدار انسان کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ریڈیو پاکستان کے ایک شعبے میں ہم لوگوں نے برسوں ایک ساتھ کام کیا اور ایک دوسرے کے دل و دماغ کی پیمائش کرتے رہے۔ اتفاق سے یہ شعبہ ایسا ہے جہاں شعر و ادب کی تنقیدی اور نظریاتی بحث سے زیادہ الفاظ کی مزاج پرسی کی جاتی ہے اور متبادل اور مترادف لفظوں کی چھان بین ضروری ہوتی ہے غالباً آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میں ترجمے کے شعبے کا ذکر کر رہا ہوں ـــــ کبھی کبھی ایک لفظ پر اتنی بحث چھڑ جاتی کہ لفظ بیچارہ درمیان سے غائب ہو جاتا اور بحث کا سلسلہ مولوی عبدالحق کی ڈکشنری سے گزرتا ہوا برہانِ قاطع تک جا پہنچتا۔ اکثر ہم لوگ اپنی بات رکھنے کے لیے اچھی خاصی لغت کو غلط اور غیر مستند قرار دیتے۔ کیوں کہ اس بحث میں نہ صرف سخن فہم بلکہ غالب کے طرفدار بھی شریک رہتے لیکن تابش صاحب ایسے موقعوں پر ایک ادائے خاص سے نکتہ سرا ہوتے جس کا مقصد یہ بھی ہوتا کہ اب "صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے" غرض خوب بحث ہوتی اور ایک ایک لفظ کی کھال کھینچی جاتی۔ تابش صاحب الفاظ کے بڑے اچھے مزاج داں معلوم ہوتے ہیں۔ الفاظ کی سیرت اور ان کے مزاج کے بارے میں یہاں بابائے اردو کی بات یاد آ رہی ہے۔ انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "الفاظ ایک طرح سے جاندار ہوتے ہیں۔ وہ انسان کی طرح پیدا ہوتے ہیں مرتے، اور گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں۔ ہر لفظ اپنے ساتھ ایک تاریخ رکھتا ہے جو خود اس کی ذات میں پنہاں ہے وہ گذشتہ زمانے کی تہذیب اور معاشرت کی یادگار ہے ـــــ"

تابش صاحب دوستوں اور لفظوں کے انتخاب میں بڑی احتیاط برتتے ہیں۔ اور اس معاملے میں دوسروں کی کسی لغزش کو معاف نہیں کر سکتے۔ بلکہ ان کا بس چلے تو غلط لفظ لکھنے اور بولنے والے کو یا تو کالے پانی بھجوا دیں یا سات برس کے لیے دلی کا ویزا دلوا دیں ـــــ وہ خود بھی دلی کے روڑے ہیں جہاں کے خاک نشینوں، کو ہمیشہ اپنی زبان پر ناز رہا ہے اس لیئے وہ بجا طور پر زبان دانی کا ـــــ خصوصاً جامع مسجد کی سیڑھیوں کی زبان جاننے کا دعوی کر سکتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ دلی چھٹے مدت ہو گئی اور اب وہ بیتی باتیں صرف یادداشت کا ایک حصہ ہو کر رہ گئی ہیں تاہم بقول غالب

ہم وہاں نہیں یہ وہاں کے نکالے ہوئے تو ہیں۔

دلّی سے یہ دور کی نسبت تو بہرحال قائم رہے گی۔

تابشؔ وہ شہرِ حسن کہ دلّی ہے جس کا نام وابستہ آج بھی ہیں اُسی سرزمیں سے ہم

تابشؔ صاحب کو نئے نئے الفاظ تلاش کرنے اور ان کے صحیح معنی و مفہوم متعین کرنے سے گہری دلچسپی ہے اور ظاہر ہے یہ کام مستند لغات کی مدد کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ کبھی کبھی وہ دفتر پہنچتے ہی آواز لگاتے ہیں "چپراسی! ——— ذرا لانا تو جامع اللغات ——— غین کی تختی" (یہ انداز کچھ مرزا رفیع سوداؔ سے ملتا جلتا ہے جو اسی لہجے میں غنچہ کو قلمدان لانے کا حکم دیتے تھے) یہ مانوس آواز سنتے ہی ہمارا ماتھا ٹھنکتا ہے اور کان کھڑے ہو جاتے ہیں ——— اور پھر تھوڑی سی دیر کی ذہنی کشمکش کے بعد ہمیں کسی پرانے لفظ کا صحیح تلفظ معلوم ہو جاتا ہے یا نئے لفظ کے پرانا معنی ——— لفظوں کا شوق تو نہیں ہے فائدہ ہمیں پہنچتا ہے اور اس طرح ہمارے علم میں خواہ مخواہ اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ سعدیؔ نے صحیح کہا ہے؛

ہمنشیں تو از تو بہ باید تا ترا عقل و دیں بیفزاید

تابشؔ صاحب کے مزاج میں سادگی کے ساتھ بڑی نفاست بھی ہے خصوصاً لباس کے معاملے میں ان کی خوش ذوقی اور وضع احتیاط قابلِ رشک ہے مجال نہیں کہ کپڑے پر ذرا سی شکن پڑ جائے کیوں کہ اس سے پہلے ان کے ماتھے پر شکن پڑتی ہے کبھی کبھی تو وہ ایسی باتیں کہتے ہیں جن پر کسی طرح یقین کرنے کو جی نہیں جی نہیں چاہتا۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتے اس لیے کرنا ہی پڑتا ہے مثلاً کسی نے ان کی نفیس شیروانی دیکھ کر کہا۔

تابشؔ صاحب! آپ کی شیروانی کا رنگ بڑا دلکش ہے کہاں سے خریدا ہے یہ کپڑا؟" ایک مخصوص لہجے میں جواب ملے گا "معاف کیجئے حضرت! یہ نئی نہیں، سترہ برس ہو گئے ہیں اس کو ———" اب جملہ حاضرین آنکھوں سے شیروانی کا "نیا پن" دیکھ رہے ہیں اور کانوں سے اس کا "پرانا پن" سن رہے ہیں۔ اس قدر زندہ و بیدار اور جوان قسم کی شیروانی اور سترہ برس، ماہ و سال کی گردشوں کا اس کا مطلق اثر نہیں۔ لیکن تابشؔ صاحب کے پاس ایسی بہت سی چیزیں ہیں مثلاً وہ قیمتی قلم کی سوانح حیات بیان کرتے ہوئے انکشاف کریں گے "میاں! یہ طالب علمی کے زمانے کی یادگار ہے اور اب بھی اسی آن بان سے لکھتا ہے۔"

بھئی! یہ تو اپنے اپنے سلیقے کی بات ہے اور اس میں قطعی مبالغہ نہیں کہ تابشؔ صاحب بے حد سلیقہ شعار واقع ہوئے ہیں۔ وہ زندگی کے ہر معاملے میں منفرد سلیقے کا اظہار کرتے ہیں۔ بلکہ یہ ان کے مزاج میں داخل ہوتے ہیں۔ اگر ان کے کلام میں ایک خاص قسم کا شاعرانہ رکھ رکھاؤ نظر آئے تو سمجھنا چاہیئے کہ یہ چیز شخصیت کے دریچے سے ان کی شاعری میں داخل ہوئی ہے۔

تابشؔ صاحب بڑے شگفتہ مزاج اور سدا بہار آدمی ہیں۔ پچاس برس کی عمر ہے۔ آج تک ان کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکی۔ ان کی زندگی زندہ دلی سے عبارت ہے اور انہیں دیکھ کر ماننا پڑتا ہے۔ بڑھاپا محض ایک اضافی تصور ہے۔ عمر سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں۔ وہ پچیس برس پہلے بھی جوان تھے اور انشاء اللہ پچیس برس بعد بھی جوان ہی رہیں گے جی چاہتا ہے کہ انیسؔ کی رباعی کا شعر اس طرح پڑھا جائے۔

جو جاکے نہ آئے وہ لڑکپن دیکھا جو آکے نہ جائے وہ جوانی دیکھی

لیکن مجھے لگتا ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کو دو خانوں میں تقسیم کر لیا ہے ایک دل کے باہر کی دنیا جہاں وہ مسعود تابشؔ کی حیثیت سے ہنستے بولتے ہیں اور دوسری داخلی زندگی جس میں وہ صرف تابشؔ دہلوی ہوتے ہیں اور غزل کہتے ہیں۔

غزل ان کی زندگی میں کب داخل ہوئی۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ البتہ یہ معلوم ہے کہ وہ چھتیس برس سے اس غزلِ رعنا کے شیدائی ہیں اور دشتِ غزل کی سیاحی کر رہے ہیں۔

بیسویں صدی میں ان کی اس محبوب صنفِ سخن ——— غزل پر کئی بلائیں نازل ہوئیں ان میں سب سے خوب صورت بلا ترقی پسندی تھی جو آندھی کی طرح گزر گئی۔ اس تحریک کے زیرِ ہمارے شعر و ادب کے معیار و مزاج میں جو خوش گوار تبدیلیاں ہوئیں ان کا اعتراف نہ کرنا ادبی بد دیانتی ہے لیکن ترقی کے جوش میں شاعروں کے ایک انتہا پسند طبقے نے غزل کے حسن نظر انداز کر دیا۔ غمِ روزگار کے اس قدر زور دار نعرے لگائے گئے کہ غمِ عشق کی صداقت مشتبہ ہوگئی اور ۱۹۳۶ء کے بعد تو کچھ شاعروں نے ترقی پسند نظریات کو امرت دھارا کے طور پر استعمال کیا اور خاطر خواہ فائدہ حاصل کیا۔ کسی زمانے میں تصوف کو بھی اسی طرح ہر کس و ناکس نے استعمال کیا تھا۔ ترقی پسندی اور تصوف دونوں چیزیں ہمارے شاعری کا مذہب رہ چکی ہیں ——— لیجئے میں تو تنقید نگاری کرنے لگا حالانکہ مجھے صرف اتنی بات کہنی ہے کہ اس عہد میں جن بزرگوں نے غزل کا چراغ روشن رکھا ان میں حسرتؔ، فانیؔ، اصغرؔ اور جگرؔ کے نام سرِ فہرست ہیں۔ اور ان میں سے فانیؔ کا رنگ داثر قبول کرنے والوں کی فہرست مرتب کی جائے۔ تو اس میں تابشؔ کا نام جلی حروف میں لکھا ہوگا۔ بلکہ میں یہ کہوں گا کہ یہ فہرست بھی تابشؔ ہی مرتب کر سکتے ہیں۔ کیوں کہ وہ عرصے تک فانیؔ کے ہم جلیسوں اور ہم نشینوں میں رہے ہیں اور ان کے معتقدوں کو اوروں سے زیادہ جانتے ہیں ——— فانیؔ بدایونی شاعری میں افادیت اور مقصدیت کے بجائے "خالص شعریت" کے قائل تھے۔ تابشؔ کا نظریہ ان سے مختلف نہیں، خیال و بیان کے اعتبار سے بھی وہ فانیؔ کے بہت قریب پہنچ جاتے ہیں ان اشعار کے مزاج پر غور کیجئے:

غم بھی مسلسل ہو تو خوشی ہے، ایسی خوشی مقسوم کہاں
درد بھی شاید دل بن جاتا، درد مگر پیہم نہ ہوا

دادِ تمنا اب کیا چاہیں جب وہ تمنا ہی نہ رہی
آپ شریکِ غم نہ ہوتے، دل بھی شریکِ غم نہ ہوا

حسن و محبت ایک ہیں دونوں، فرقِ نظر کا دھوکہ ہے
بزمِ جہاں میں تیری تجلی شمع بھی ہے پروانہ بھی

عشرتِ یاس میں کشمکشِ غم کب تھی
رنگ امید نے بدلا مرے کاشانے کا

غم کیا کوئی خوشی بھی نہیں مقصدِ حیات
گھبرا گئے ہیں اس دلِ بے مدعا سے ہم

اک کشاکش بھی ہے رنجِ نامرادی کے سوا
ہائے کیا کہیئے دلِ مایوس کس مشکل میں ہے

اِک مرگِ ناگہاں ہے مجھے ایک اک نفس　　یہ زندگی بھی زندگیٔ جاوداں نہیں

ہر لمحہ ایک موت ہے، ماتم ہے ہر نفس　　اس زندگی کی ہم پہ ہے تہمت لگی ہوئی

تابشؔ صاحب کے دوستوں کا حلقہ ان کے دل کی طرح وسیع ہے ، میرے خیال میں تو ساری دنیا ان کی دوست ہے کیونکہ میں نے دشمنوں سے بھی ان کی تعریف سنی ہے اور انہیں بھی دشمنوں کی تعریف کرتے دیکھا ہے۔ ایسی صورت میں بنائے مخاصمت کا سراغ لگانا اور بھی مشکل ہے۔ آدابِ مجلس کا جیسا سلیقہ انہیں ہے بہت کم لوگوں کو ہوگا لیکن وہ اس معاملے میں انشاءاللہ خاں انشاؔ نہیں، میر تقی میرؔ ہیں۔ خاکساری کے ساتھ خودداری ان کا جزوِ ایمان ہے۔

علمِ مجلسی کا جتنا بھرپور مظاہرہ کسی بڑے مشاعرے کے اسٹیج سیکریٹری کو کرنا پڑتا ہے۔ اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں، ایک طرف خواتین و حضرات کے ہنگامے، مطالبے، دوسری طرف شعرائے کرام اور ان کی نازک مزاجیاں، بیک وقت دونوں کے سامنے سرخرو ہونا آسان بات نہیں۔ مجمع پر تو شاید پولیس بھی قابو پا سکتی ہے۔ لیکن شاعروں کو قابو میں رکھنا سیکریٹری کی ذمہ داری ہے۔ میں نے کئی بار دیکھا کہ تابشؔ صاحب نے یہ ذمہ داری نہایت حسن و خوبی کے ساتھ پوری کی اور داد وصول کی ——— غزل پر جو داد ملتی ہے وہ الگ اس طرح مجموعی طور پر انہیں دوسروں سے زیادہ داد مل جاتی ہے تابشؔ "مشاعرے باز" شاعر تو نہیں ہیں البتہ مذکورہ خدمات کی بنا پر انہیں "مشاعرہ نواز" کہا جا سکتا ہے"

جہاں تک تابشؔ کے شاعرانہ مرتبے کا تعلق ہے اس کا فیصلہ تنقید نگار کر سکتا ہے تنقیدی بحث میں مجھے پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ البتہ میرا جی چاہتا ہے کہ اپنی پسند کے کچھ اشعار پیش کر دوں کہ نئے غزل گو شعراء کا کوئی معیاری انتخاب شائع کیا جائے تو اس میں اس غزل گو کے اس قسم کے اشعار کو شامل کرنا ضروری ہوگا

شرم رکھ لے تو ہی اربابِ وفا کی یارب　　نعمتِ درد بہت عام ہوئی جاتی ہے

سازِ دل ٹوٹ گیا ہے شاید　　لب پہ آتی نہیں فریاد اب کے
بڑھ گئی دامِ بہاراں کی گرفت　　خود اسیروں میں ہے صیاد اب کے

رنجِ ہستی بھی وہی، تلخ نوائی بھی وہی　　غم نیا ہو تو نئی طرزِ فغاں ہوتی ہے
شدتِ درد چھپائے نہیں چھپتی اے دوست!　　کوششِ ضبطِ فغاں بھی تو فغاں ہوتی ہے

اس کرم کا بھی کچھ ٹھکانہ ہے　　کوئی امیدوار ہی نہ رہا
نعمتِ درد کیا ملی تابشؔ　　کچھ ہمیں سازگار ہی نہ رہا

مجھکو گوارا اپنی حیاتِ غم کی اک اک مجبوری — کاش ہر اک محرومی کا احساس گوارا ہو جاتا
کوئی نفس تو عنوان بنتا ذوقِ ثباتِ ہستی کا — دم ہی لبوں پہ آتے آتے نام تمہارا ہو جاتا

رہبر نے سرِ راہ گذر چھوڑ دیا ساتھ — احسان مسافر پہ رہا ہمسفری کا
اک خواب اجل ہی سہی ختم شبِ فرقت — جھونکا کوئی آیا تو نسیمِ سحری کا

اس خوفِ اسیری سے ہے مفہومِ چمن خبط — ہر شاخِ نشیمن تو کہیں دام نہیں ہے

دولتِ غم سے نا آسودہ، درد کی لذت سے محروم — تجھ کو سبب معلوم ہو شاید دل کی اس ناشادی کا
صحنِ چمن ہے گوشۂ زنداں، حلقۂ زنجیر اک اک گل — کس نے اسیری کی صورت میں دیکھا خواب آزادی کا

ہر جفا کار سے حسرت کشِ آزار ہوئے — ہم سے اس عہد میں کم لوگ طرحدار ہوئے
تیرے دیوانوں کو آگے نہیں جانے دیتے — تیری دیوار کے سائے بھی تو دیوار ہوئے

میری نگاہوں میں اس سے بڑھکر نہیں ہے کچھ اعتبار منزل — کہ نارسائی کو چاہیئے تھا رہ طلب میں کوئی بہانہ

شاید وہی ہے میرے لیے منزلِ مراد — جس رہ گذر میں چھوڑ گیا کارواں مجھے

شاعر کی حیثیت سے تابش دہلوی کو کسی تعارف کی ضرورت نہیں۔ ان کے کلام کا یہ پہلا مجموعہ ضرور ہے لیکن مشاعروں اور رسائل کی برکت سے دور کے لوگ انہیں قریب سے جانتے ہیں۔ یہ سوال بہرحال جواب طلب ہے کہ چالیس سالہ شاعرانہ زندگی میں یہ پہلا مجموعہ کیوں ہے؟ کاتنے اور لے دوڑنے کے اس صحافتی دور میں اتنا انتظار کون کرتا ہے۔ اس مجموعے کی اشاعت پر لوگ انہیں مبارک باد دیں گے۔ لیکن میں اتنے طویل عرصہ تک اشاعت سے باز رہنے پر بھی انہیں مبارک باد پیش کرنا چاہتا ہوں۔ یہ بڑے حوصلے کی بات ہے اور یہ صبر و ضبط یقیناً قابلِ داد ہے۔ اللہ پاک ہمارے نئے شعرا کو بھی اس شانِ بے نیازی کا کچھ حصہ عطا فرمائیے تاکہ ادب اور صحافت کا فرق باقی رہے۔

تابش دہلوی کی پسندیدہ کتاب لغت اور محبوب شاعر غالب ہے۔ وہ دوسروں کا "ناطقہ سر بگریباں" کرنے کے لیے انہیں سند کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ غور کیا جائے تو لغت اور غالب۔ اصل میں دونوں ایک ہیں۔ ایک کی مدد کے بغیر دوسرے سے نجات پانا مشکل ہے اور جس نے دونوں کو سمجھ رکھا ہو وہ دوسروں کے لیے برہانِ قاطع ثابت ہوتا ہے۔

تابش صاحب ان مہلک ہتھیاروں سے میدان مار چکے ہیں، مگر وردشمس توان کا نام سنتے ہی ہتھیار ڈال دیتا ہے اس وقت تابش صاحب اسے ایک فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ دیکھیں گے جیسے کہہ رہے ہوں "حضرت! پڑھ کے آیا کیجئے" شاید وہ اس راز سے واقف ہیں کہ پڑھا لکھا انسان بحث و تکرار سے گریز کرتا ہے۔ تابش دہلوی کی شاعری پر بحث کی راہیں نکل سکتی ہیں۔ لیکن ان کی شخصیت میں داخل ہونے کا ایک راستہ ہے ——— خلوص اور انسان دوستی کا راستہ ——— ان کی سیرت و کردار میں بہت سے ایسے دلکش اور دلچسپ عناصر ہیں جن کا تفصیل سے ذکر ہوتا تو مزے کی بات ہوتی۔ میں صرف پرانی بات دہرانا چاہتا ہوں۔

تابش دہلوی سے میں پہلی بار ملا تو ان کی شرافت سے متاثر ہوا۔ دوسری ملاقات میں ان کا قائل ہونا پڑا۔ اور تیسری ملاقات میں ان کی وضعداری کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو گیا۔ یہ ابتدائی ملاقاتیں ماضی کے دھندلکوں میں تحلیل ہو چکی ہیں۔ اور ان کی تفصیلات پر دبیز پردے پڑ چکے ہیں۔ لیکن میرے تاثرات آج بھی وہی ہیں اور میں انہیں ایک شریف، ذہین اور وضعدار انسان کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔

فاش میگویم و از گفتۂ خود دلشادم ۔۔۔ بندۂ عشقم و از ہر دو جہاں آزادم

(حافظ)

سید ابوالخیر کشفی

تلاشِ جلوۂ حرفِ سپاس

نعت صرف ایک صنفِ سخن نہیں۔ یہ اظہار و سکوت کا سنگم ہے۔ جب بے زبانی، زبان بن جائے تو نعت کا کوئی شعر نازل ہوتا ہے۔ نعت، ذاتِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے شاعر کے سارے وجود کے تعلق کے اظہار کا نام ہے۔ سارا وجود میں نے یوں کہا کہ آدمی اپنی فردیت (اور انفرادیت) کے ساتھ ساتھ اپنی ذات میں انجمن اور غالب کے لفظوں میں محشرِ خیال بھی ہے۔ ایک امتی کے رشتے سے اس ذات کے سامنے اپنی ذات کو گم کر دینا ہماری معراج ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ہماری معراج کے مبصر، اور ادراک و آگہی کے دبستانوں کے مشاہد اور طالبِ علم کی حیثیت سے ان علوم و حقائق کا شعور رکھنا جو اس امی لقب کی گفتار اور عمل سے وجود میں آئے اور یوں کہ حیاتِ انسانی کا راستہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بدل گیا اور صراطِ مستقیم اهر کر رموز موعود تک کے لیے قائم ہوگئی ـــــ اپنے آپ کو گم کر دینے اور صراطِ مستقیم اور انسانیت کے مستقبل کو پالینے کے لیے جب شعر کے قالب میں ڈھلتی ہے تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ اس شاعر کے لیے مقامِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم غیب نہیں بلکہ شہود ہے۔

تابشؔ دہلوی صاحب کی نعتوں کے مطالعے نے مجھے یہی احساس دیا ہے۔ اور میں سوچتا رہا کہ تابشؔ کے کلام میں زبان کی جو رمز شناسی ہے، الفاظ کے بطون میں پہنچ کر معانی کے گہر تلاش کرنے کا جو رجحان ہے، برہنہ گفتاری کی جگہ رمز و ایما سے ان کی جو وابستگی ہے، الفاظ و مفاہیم و جذبات کے درمیان وحدت پیدا کرنے کی جو اہلیت ہے۔ لفظوں کو ہشت پہلو نگینوں کی صورت جڑنے اور انہیں شمع کی طرح روشن کرنے کی جو قدرت ہے۔ ان سب کا مقسوم و مقدر یہی تھا کہ یہ سب خوبیاں اور قدرتیں نعتِ سرورِ کونین ؐ کے سلسلے میں ان کے کام آئیں۔ تابشؔ کے سفینۂ فن کو آخر ساحلِ محمدی مل گیا ـــــ ہر زندہ چیز کی طرح ہمارے سخن کو بھی اپنی منزل کی تلاش رہتی ہے۔

قرآن حکیم ذات و صفاتِ سید لولاک صلی اللہ علیہ وسلم کا آئینہ اور مرقع ہے اور یہ مرقع تابشؔ کے پیشِ نظر رہا ہے۔

محورِ ہستی فقط ذاتِ رسول — دین و دنیا مصطفیٰ تا مصطفیٰ
نظمِ ہستی میں توازن کیلئے — ساری دنیا اور تنہا مصطفیٰ

ایسے شعر کہے نہیں جاتے عطا کئے جاتے ہیں۔ ہمارا دورِ نعت گوئی کا دور ہے کہ انسان خسران و نامرادی کی وادی سے نکلنا چاہتا ہے اور اس سعی و کاوش میں مصطفیٰ سراجِ منیر ہیں۔ میرے ماں باپ ان پر فدا ہوں " ساری دنیا اور تنہا

مصطفیٰ" مقام نبوی سے آگہی کا اظہار اس قوت سے غالب و اقبالؔ کے بعد مجھے تابشؔ کے ہاں اس طرح نظر آیا ہے۔

تیر قضا ہر آئینہ از ترکش حق اُست لیکن کشودِ آں ز کمانِ محمدؐ سُت (غالبؔ)

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست اگر باو نرسیدی تمام بولہبی ست (اقبالؔ)

آیئے اب ذرا" دین و دنیا مصطفیٰ" تا مصطفیٰ" اور" ساری دنیا اور تنہا" کا مطالعہ قرآن حکیم کی روشنی میں کریں۔ سورۃ الفتح میں سلسلہ کلام یہ ہے کہ وہ اللہ ہی تو ہے جس نے ہدایت اور دین حق کے ساتھ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا تاکہ یہ دین تمام ادیان پر غالب آجائے۔ اور اس کے فوراً بعد ارشاد ہوتا ہے وکفیٰ باللہ شھیدا یعنی اللہ کی گواہی کافی ہے اور اللہ کی شہادت بعد ہی فرمایا گیا کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔ سورہ سبا میں ارشاد فرمایا جاتا ہے۔ وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا۔ اور اے محمدؐ ہم نے تم کو عالم انسانیت کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔ یہی بشارت یہی تنذیر نظم ہستی میں توازن کی اساس رہے اور وہی ذات محور ہستی ہو سکتی ہے جس کے لیے فرمایا گیا کہ اللہ رسولؐ پر شاہد ہے اور رسولؐ مومنوں پر شاہد ہیں۔ اور شہادت ابدی ہے تابشؔ صاحب نے نظم کی ہیئت کا بھی سہارا لیا ہے۔ لیکن ان کی اکثر نعتیں" غزل پیکر" ہیں۔ غزل جس کا ہر شعر اپنی دنیا آپ ہوتا ہے۔ یہی وہ صنف ہے جس کا ارتکاز اور وسعت ہمارے لیے عشق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اظہار کو سہل بنا دیتی ہے۔

حرا سے لے کر تا شہر مدینہ نظام نور کا ایک سلسلہ ہے

دو انتہاؤں حرا اور مدینہ کے درمیان تابشؔ نے نظام نور کے اس سلسلہ کی یادوں کے باب ہم پر کھول دیئے ہیں جسے ہم اسوۂ حسنہ کہتے ہیں۔ اور تابشؔ نے" نظام رسول" کی ترکیب کی مدد سے ہمیں یہ قرآنی سبق یاد دلایا ہے کہ اللہ اور رسول کی پیروی ہی سے ہم رحم کے مستحق ہو سکتے ہیں (آل عمران) اور اتباع رسولؐ ہی محبت کے دعوے کا ثبوت ہے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ..... (آل عمران)

نصیب شوق اگر ان کا نقش پا بھی نہیں مری نجات کا پھر کوئی راستہ بھی نہیں

اتباع کے لیے نقش پا کا استعارہ کیسا بلیغ ہے۔

انسان دل اور دماغ کا مجموعہ ہے۔ اس کے کارناموں اور اظہار میں انہیں دونوں اجزاء اور عناصر کی یکجائی ملتی ہے تابشؔ صاحب کی نعت اسی یکجائی اور یکسوئی کا مرقع ہے ان کا قلب بھی مومن ہے اور ذہن بھی مومن ہے۔ قلب و ذہن دونوں قرآنی اصطلاح فواد میں سمٹ آتے ہیں۔ تابشؔ کی نعت خود تابشؔ کی گواہی ہے۔ محمدؐ عربی کی رسالت پر ان کے ایمان اور حضورؐ کی ذات سے ان کی محبت کی۔ وہ قریہ محمدؐ میں اپنی پوری ذات کے ساتھ داخل ہوئے ہیں۔ اور اب یہی قریہ ان کی شہریت کا نشان ہے۔ وہ قریۂ محمدؐ میں صبح و شام محمدؐ کی تقویم میں زندہ ہیں۔ اور یہ وہ زندگی ہے جو آدمی کو ابدیت کی حدوں تک پہنچا دیتی ہے" خودی عشق محمدؐ سے خود نگر و خود گر و خود گیر" بنتی ہے اور پھر آدمی موت پر غالب آجاتا ہے۔

بہت گردشیں اس زمانے نے بدلیں نہ بدلے مگر صبح و شام محمدؐ

اس حقیقت تک پہنچ جانا اپنی زندگی پر شہادت دینا ہے۔

تابش صاحب زبان کی صحت کے بارے میں نہایت سخت گیر اور روایت پرست ہیں وہ ان دو تین آدمیوں میں سے ہیں جنہیں میں دلی کا لہجہ قرار دیتا ہوں لیکن عشقِ نبی کے مرحلوں میں ایسے مرحلے بھی شامل ہیں جو زبان کے زنداں کو توڑ دیتے ہیں ؎

حب دیار نبیؐ میں آیا ہوں　　　اک نئی زندگی میں آیا ہوں

یہ احساس بہت شدید ہے کہ دیار نبیؐ، ایک نئی زندگی ہے، تابش صاحب اپنی غزل میں نئی زندگی میں آنا کبھی نہ کہتے، لیکن نعت میں ایک شدید جذبے کے اظہار نے ان کے روایتی ذوقِ زبان دانی پر غلبہ حاصل کر لیا۔ "نئی زندگی میں داخل ہونا" کتنا محدود اظہار ہوتا۔ عرض کرنے کا مدعا یہ ہے کہ حب نبیؐ اپنے اظہار کے طریقے خود تراشتا ہے۔

تابش صاحب کی ذوق گوئی کے محاسن اور ان کے نعتیہ اشعار کے تاثر کو تفصیل سے پیش کرنا اس وقت میرے لیے ممکن نہیں دو ایک اشارے اور اپنے پسندیدہ شعروں میں سے چند آپ کی خدمت پیش کروں گا۔

نعت گوئی صرف اظہارِ محبت نہیں، یہاں اخفائے محبت کی منزل بھی آتی ہے یا کم سے کم اپنے اظہار کے سیل رواں پر بند باندھنا پڑتا ہے۔ تابش صاحب نے یہ کام بعض مقامات پر ردیف سے لیا ہے۔ مثلاً ان کی یہ نعت ؎

راحتِ دل، سکونِ جاں یعنی　　　دہی غم خوارِ عاصیاں، یعنی

تابش صاحب کی نعتیہ شاعری کی دوسری نہج تغزل اور لہجۂ غزل کو سرکارِ رسالت پناہ کے مرتبہ سے ہم آہنگ بنانا ہے یہ صفت ہمارے کئی ان اچھے نعت گو شاعروں کے ہاں بھی ملتی ہے جو غزل کی صنف میں امتیاز رکھتے ہیں۔ لیکن تابش صاحب کو بے محابا اظہار کی صنف نہیں سمجھتے جیسا کہ میں نے تمہیدی حصہ میں عرض کیا ہے کہ وہ برہنہ گفتاری کی جگہ رمز و ایما کے آدمی ہیں ان کے رمز و ایما میں ضبط و نظم کے بھی بہت سے پہلو ہیں جو کچھ تو ان کی زندگی کی قدروں کا نتیجہ ہیں اور کچھ فانی بدایونی سے وابستگی کا۔ چند شعر اس اشارہ کی روشنی میں ملاحظہ ہوں ؎

گدائے مصطفیٰؐ کیا ہو گیا ہوں　　　میں آپ اپنی تمنا ہو گیا ہوں

کس قدر روشنی ہے طیبہ میں　　　اس قدر روشنی میں کیا دیکھیں

رشد و ہدایت کی روشنی کی ارزانی نوعِ انسانی کے لیے اپنی جگہ، مگر یہ ساقی سبب نور سے آگے کہاں جائے۔

کرم کے ساتھ قبول کرم کی طاقت بھی　　　حضورؐ مجھ میں حضوری کا حوصلہ بھی نہیں

دوسرے مصرع میں حضور اور حضوری کی نسبتوں پر غور فرمایئے اور "ح" کے صوتی اثر

ہر اک سانس کی آمد و رفت ہے　　　مدینہ کی تازہ ہوا کی طرح

اپنی زندگی کو فیضِ مدینہ اور نسبتِ مدینہ کے حوالے کر دیا ہے۔

وہ بھی سایہ تھا تیرے دامن کا　　　　میں اگر روشنی میں آیا ہوں

بقول مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، ہر چیز کا ایک شجرہ نسب ہوتا ہے، اور مسلمان کی زندگی کی روشنی اور علم کا کوئی اعتبار نہیں اگر ان کا سلسلہ نسب دامن مصطفیؐ سے نہیں جا ملتا۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستگی کی بنا پر جب خاک مدینہ کے ذرے کہکشاں معلوم ہونے لگتے ہیں تو وہ شخصیتیں کیوں نہ محبوب ٹھہریں جو ان کی رسالتؐ کی شاہد اور سچائی کی شہادتیں تھیں۔ صدیق اکبرؓ کہ وہ ؎

ثانی اسلام و غار و بدر و قبر

ہیں اور فاروقؓ تو فاروق بین الملتین ہیں، اور عثمانؓ غنی رسالت کا نقش جلیل ہیں۔ اور حیدر کرارؓ تو پروردہ آغوش رسالت ہیں، تابشؔ ان کے ذکر کے بغیر نعت کہہ بھی سکتے تھے۔

تیری سچائی کا پرتو سینہ بوبکرؓ میں　　　　فکر کا مظہر تری، فاروقؓ کی دانش وری
تیرے جود و لطف کا آئینہ عثمان غنیؓ　　　　تیری صولت کا مرقع جوش ضرب حیدریؓ

تابشؔ کے مرقع نعت میں شاعرانہ محاسن اور عقیدہ کی صحیح سمت۔ دونوں چیزیں جمع ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سپاس ہم پر واجب ہے۔ درود و سلام ہو یا نعت ــــــ یہ سب حرف سپاس کی منزلیں ہیں اور ہم پر اپنے رسولؐ اور ان کے بعد کے اپنے اکابر کا ایک احسان یہ بھی ہے کہ حرف سپاس بھی، ہمیں عطا کیے گئے اور آداب ادائیگی حرف سپاس بھی سکھائے گئے اور سب کچھ کہہ کر آدمی کو یہی اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ؎

ان کے شایاں ہو ایسا حرف سپاس　　　　صرف لوح و قلم نے دیکھا

اور لوح و قلم کے اس حرف سپاس کے نور کی چھوٹ تابشؔ کی نعت رہی ہے۔ اے زمینوں کے فرش کو بچھانے والے، اور اے آسمانوں کے خیموں کو ہمارے سروں پر بلند فرمانے والے اپنی رحمتیں اپنے عبد اور رسول حضرت محمد مصطفیؐ پر نازل فرما جس نے تیری نشانیوں کو رونق بخشی اور جس نے تیرے علم کی نگہبانی فرمائی اور جو تیری مخلوق کی طرف تیری سب سے بڑی آیت بن کر آیا　　　　اور اے رب جلیل! تابشؔ دہلوی کے حرف سپاس کو اپنی سرکار اور بارگاہ نبوت میں درجہ امتیاز عطا فرمانا اور ان کی اس تمنا کو حقیقت بنا دے ؎

مرے ذہن و دل کو فراخی ملے　　　　حرم کی کشادہ فضا کی طرح

میں تابشؔ صاحب کا ممنون ہوں کہ مجھے انہوں نے اس کار سعادت میں شریک بنایا اور یوں مجھے بارگاہ ذکر رسالتؐ میں چند لمحے گزارنے کا موقع ملا۔ خدا اس سلسلے کو جاری رکھے۔

عثمان رمز

تابشؔ دھلوی کی نعتیہ شاعری

حضرت تابشؔ دہلوی ہمارے عہد کے ایک منفرد شاعر ہیں ۔ ان کی انفرادیت کا راز ان کی غزل گوئی میں ہے یا نعت گوئی میں اس کا تعین بڑا مشکل ہے ہے. کمیت کے اعتبار سے ان کی نعتیں چاہے کم ہی کیوں نہ ہوں کیفیت کے اعتبار سے ان کا درجہ بہت بلند ہے .

عقیدہ کی صحت، مقام رسالت کی پہچان، کار نبوت کی تفہیم، مدحت رسول کے آداب اور طیبہ کی مرکزیت وہ چند نمایاں خصوصیات ہیں جو تابشؔ دہلوی کی نعتوں میں جا بجا جلوہ گر نظر آتی ہیں، تابشؔ دہلوی نعتیں کیوں کہتے ہیں . یہ انہی کی زبانی سُنیے ؎

میں محمد کی ثنا کرتا ہوں   اس طرح حمد خدا کرتا ہوں

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ثنا کرتے وقت نئے پرانے اور چھوٹے بڑے نعت گو شعراء کی شاعری کی اچھی خاصی تعداد کبھی بہک گئی، کبھی بھٹک گئی اور کبھی ایمان ہی کے لیے خطرہ بن گئی اس لیے کہ وہ حقیقت نگاری سے زیادہ مبالغہ طرازیوں مستند حقائق، روایات معجزات کی طرح غیر متحقق روایات و معجزات اور معنی سے زیادہ لفظوں سے کھیلنے کے عادی نظر آتے ہیں .

مقام رسالت کے حوالے سے جناب تابشؔ دہلوی کے مندرجہ ذیل اشعار نقل کرتا ہوں :

؎ احد نہیں، مگر احمد ہیں کیا، یہ کیا معلوم   حجاب میم یہاں کب کسی سے اٹھا ہے
؎ کوئی مثیل ہے نہ بدل ہے حضور کا   سایہ کہاں کہ نور ہی سایہ ہے نور کا
؎ دیدہ و دل انہی سے ہیں تابشؔ   ان کو غیب و حضور پایا ہے

میں اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہوں کہ جس توحید خالص کے لیے نبی احمدؐ مجتبیٰ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالےٰ دنیا بھر کے انسانوں کے مبعوث کیا تھا اس کی اُمت کے علمائے سو، خود ساختہ فلسفیوں اور دانشوروں نے مختلف حیلے بہانوں سے علم کے نام پر جہالت اور جہالت کے نام پر جاہلیت کو فروغ دیا۔ خود نبی اکرم کے عہد زریں میں اور آپ کے بعد بنی اسرائیل علمار حبین سے بیٹھے تھے نہ ہی نصرانیوں کے راہب اور مذہبی پیشوا۔ بنو عباسیوں کے عہد خلافت میں بیت الحکمت کا قیام، یونانی فلسفیوں کی کتابوں کے تراجم اور درباری علماء کے مصنوعی اختلافات چند

ایسے محرکات تھے۔ جنہوں نے اہل ایمان کے عقیدہ توحید، رسالت اور آخرت کو ہلا ہلا کر رکھ دیا۔ چونکہ اللہ کے نبی، آخری نبی ہیں۔ قرآن مجید وہ آخری کتاب ہے جو منزل من اللہ ہے اور چونکہ آپ کی امت آخری امت ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ نے دین مبین کی حفاظت کی ذمہ داری بھی خود اٹھا رکھی یہی وجہ ہے کہ ہر فرعونے را موسیٰ کے مطرز پر ہر صدی اور ہر دور ابتذال میں کوئی نہ کوئی مصلح بھی پیدا ہوتا چلا آرہا ہے۔

بنی اسرائیل نے حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیا اور نصرانیوں نے حضرت علیہ السلام ابن مریم کو۔ نصرانیوں کے علماء بیت المقدس کی فتح کے موقع پر اس بحث میں الجھے ہوئے بتائے جاتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ کا بول و براز پاک تھا یا ناپاک، مسلم معاشرہ میں لایعنی نبی ختمی مرتبت کو نعوذ باللہ بس اللہ کے برابر بنا دینے کی سعی نامحمود۔ آپ کا سایہ تھا یا نہیں، اور آپ حاضر و ناظر تھے یا نہیں۔ بے سود اور مضرت رساں مباحث سادہ لوح اہل ایمان اور مسلمانوں کے سواد اعظم کو تر کے میں ملے ہیں نہ جانے ہمارے علماء، فلسفیوں اور دانشوروں کو کب ہوش آئے گا نہ جانے کب وہ ان روایتی مسائل کے دباؤ سے چھٹکارا حاصل کر سکیں گے، تابش دہلوی نے انہیں محولہ دباؤ کے تحت تینوں اشعار کہے لیکن اسلام کے بارے میں ان کے نجی مطالعے، اہل بیت میری مراد ہے گھر والوں کی تربیت دکن اور دلی میں نصیب ہونے والی اہل دانش اور اہل دل کی صحبتوں نے نہ صرف تابش کی بنیادی، عقائد کو تحفظ فراہم کیا ہے بلکہ انہیں اسلام کے ایک نیم تحرکی اور نیم انقلابی تصور سے بھی روشناس کرایا ہے اس پس منظر میں آپ جناب کے پہلے شعر ہی کو لے لیں۔ اس کے پہلے مصرع میں "احد نہیں" کے ٹکڑے نے مقام احمدؐ کا واضح تعین کیا ہے۔ البتہ حجاب میم یہاں کب کسی سے اٹھتا ہے" اس کو آپ چاہیں تو شاعرانہ تعلی کہہ لیں۔ آپ چاہیں تو مبالغہ آرائی قرار دے دیں یا آپ اسے شاعر کے جذبہ تجسس اور تحیر سے معنون کر دیں۔ دوسرے شعر میں "سایہ کہاں" کا ٹکڑا پڑھ کر ماتھا ٹھنکتا ہے لیکن جب شعر کو ایک سے زیادہ بار پڑھیں گے اور "کوئی مثیل ہے نہ بدل ہے حضور کا" کی عبارت پر مشتمل پہلے مصرعہ کو بار بار دہرائیں گے اور "نور ہی سایہ ہے نور" کی منزل پر پہنچیں گے تو آپ خود ہی محسوس کریں گے کہ اس شعر میں نبی کے اس سایے کا ذکر ہی نہیں کیا گیا ہے۔ جسے لوگ عرف عام میں "سایہ" کہتے اور سمجھتے ہیں۔

اسی طرح تیسرے شعر کے دوسرے مصرعہ میں تابش دہلوی کا یہ فرمانا کہ "ان کو غیب و حضور پایا ہے" حاضر و ناظر کے روایتی مسئلہ سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھتا۔ اس لیے پہلے مصرعہ کا مضمون "دیدۂ و دل انہی سے ہیں تابش" سے منفق نہیں کیا جاتا۔ اس طرح حضرت تابش کے عقیدے کی پختگی مسلمہ ہو جاتی ہے۔

مقام رسالت ہی کے حوالے سے جناب تابش نے اور بھی شعر کہے ہیں۔ ان میں سے چند ایک ملاحظہ فرمائیں۔

مہبط وحی و مرکز الہام   کاشف سر کن فکاں یعنی ..
محور ہستی نقطہ ذات رسول   دین و دنیا مصطفیٰ تا مصطفیٰ
تابش ایمان ہے مرا قرآن پر   اور قرآن سراپا مصطفیٰ

آپ مندرجہ بالا اشعار کو جتنی توجہ کے ساتھ پڑھیں گے اتنی ہی لذت اور سرور آپ کو ملے گا نیز آپ خود بھی اس بات کو محسوس کریں گے کہ تابش دہلوی نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کو فوق یا غیر معمولی فرد یا مافوق الافراد یا بشر کی حقیقت سے نہیں

ہیتیں کیا بلکہ ان کی سی پرانی نعتوں کو پڑھنے کے بعد میں نے یہ تاثر لیا ہے کہ حضرت تابشؔ دہلوی نے نبی اکرم کی ذاتِ گرامی قدر کو ایک مبلغ، ایک مصلح، ایک انقلابی، ایک بشیر و نذیر اور ایک تقدیر ساز قائد کی حیثیت روشناس کرایا ہے "مہبطِ وحی" "ثمرِ اکرِ الہام" کاشفِ سرِ کن فکان، سرخیلِ نوریاں، قاسمِ کوثر و جناں وغیرہ جیسی تراکیب ٹکڑے اور اصطلاحات آپ کو تابشؔ کی نعتوں میں جا بجا چراغِ راہ کی طرح روشنی بکھرتی نظر آئیں گی۔ ویسے یہ تابشؔ کے قارئین کا مسئلہ ہے کہ وہ ان کے خیالات کی گہرائیوں میں اتر سکتے ہیں۔ ویسے تابشؔ دہلوی کو خود بھی اس امر کا احساس ہے کہ:

جتنی تری صفاتِ حمیدہ ہیں آشکار   تنگ اتنا ہو گیا ہے احاطہ شعور کا

جہاں تک معاملہ ہے کارِ نبوت کی تفہیم کا تو حضرت تابشؔ دہلوی کہتے ہیں۔

ترے ہی نورِ رسالت کی تابناکی سے   اُفق اُفق پہ نیا آفتاب چمکا ہے
یہ دین بھی تجھ سے ہے یہ دنیا بھی تجھی سے   تجھ سے نہ تعلق ہو تو دنیا ہے نہ دیں ہے
مثلِ خورشید وہی بامِ سحر سے اُٹھے   نور لے کر جو ترے فیضِ نظر سے اٹھے
دولتِ نور ہوئی ہے ترے در سے تقسیم   لاکھ خورشیدِ ہدایت ترے گھر سے اٹھے
دکھاؤ راہ ہمیں کوئی راہ نما بھی نہیں   کہ ہم تو جادۂ منزل سے آشنا بھی نہیں

"نور" کا لفظ، "نورِ رسالت" اور "دولتِ نور" کی ترکیبوں کے ساتھ ساتھ "نظامِ نور" کی ترکیب وہ ٹھوس حقیقیں ہیں جو واضح انداز میں کارِ نبوت پر روشنی ڈالتی ہیں۔ حضرت تابشؔ نے "نور" کے لفظ کو کہیں "نورِ اسلام" کے معنوں میں، کہیں نورِ رسالت کے معنوں اور کہیں "نورِ اسلام" کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ آپ ان کے اشعار پڑھ کر دیکھیں قرآن اور سیاق و سباق پر ہی اس بات کی تصدیق کریں گے۔

جناب تابشؔ دہلوی نے باتوں باتوں میں مجھے یہ بتایا ہے کہ انہوں نے بطحا اور یثرب کے معنی علی الترتیب "وادی غیر ذی ذرع" اور بنجر زمین کے ہوتے ہیں، تابشؔ دہلوی کی لطیف طبیعت ان کی خوش فکری اور حقیقت نگاری کے جذبوں کو بھلا یہ بات کیسے گوارا ہو سکتی تھی کہ وہ مدینۃ النبی کے لیے ایسے الفاظ استعمال کرتے۔ جن کے معنی میں سقم اور کراہت کے پہلو نکلتے ہوں۔ حضرت تابشؔ نے تو مدینۃ النبی کو کسی اور ہی نگاہ و نظر سے دیکھا ہے۔ لیجیے ان کا شعر دیکھیے:

جیسا طیبہ کو ہم نے دیکھا ہے   کم نے جانا ہے، کم نے دیکھا ہے

تابشؔ کے اس دعویٰ اور اس جراُتِ اظہار کی تائید میں بھی کچھ اشعار ملاحظہ ہوں

حرا سے لے کر تا شہرِ مدینہ   نظامِ نور کا اِک سلسلہ ہے
یہ معراج یہ ارتقائے مدینہ   کہ ڈالی حرم نے بنائے مدینہ
خلدِ نظارہ ہے طیبہ احتیاط اہلِ نظر   ہر نظر کے ساتھ تہذیبِ نظر بھی چاہیے

اس موضوع پر اور بھی خاصے اشعار پیش کئے جاسکتے ہیں۔ مگر طوالت کا خوف دامن گیر ہوتا ہے۔
بات اتنی سی ہے کہ آپ شہرِ نبیؐ کو مدینہ کہیں یا طیبہ اس کی پہچان محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نورِ رسالت ہے، سارا شہر نبی اسی نور سے جگ مگ کر رہا ہے۔ اور قیامت تک یہ نور جگ مگاتا رہے گا۔ سحتِ فکر تابش کا اس سلسلے میں آپ اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ "مدینہ" کی بنیاد "حرم" نے ڈالی ہے جبکہ حرم کی بنیاد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے طوفانِ نوح کے بعد نئے سرے سے ڈالی تھی "مدینہ" اور "حرم" کا انسلاک بھی ملحوظِ خاطر ہے اور ساتھ ہی ساتھ "حرا" اور "مدینہ" کے گہرے رشتے کو بھی دل و دماغ کے سامنے رکھیں۔ "مکاں" کی پہچان اس کے "مکین" سے ہے اور "مکین" کی پہچان اس کے عظیم اور لافانی کارناموں سے ہے۔ ان محولا بالا اشعار میں "نظامِ نو" اور تہذیبِ نظر کی دو ترکیبیں اور دو ٹکڑے بڑے اہم ہیں۔ یہ دونوں ترکیبیں معنی کے ایک دفتر کی حامل ہیں۔ اپنی بعثت کے بعد محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تیئیس سالہ جانگداز جد و جہد کے نتیجے میں جو اسلامی انقلاب برپا کیا ہے۔ اور فتحِ مکہ میں جس طرح آپ نے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کی قیادت فرماتے ہوئے پوری سرزمین حجاز و نجد کو اسلام کا ایک مضبوط قلعہ بنا دیا تھا۔ مدینہ کہیں یا طیبہ وہی شہرِ نبی دینِ اسلام کا دار الخلافہ بن گیا تھا۔
یہیں دنیا کی وہ عظیم عدلیہ، انتظامیہ اور مقننہ پروان چڑھتی تھی۔ اور وہیں "سرخیلِ نوریاں" کی قیادت میں لشکرِ اسلام اٹھے۔ جنہوں نے نظامِ نور کے سامنے آنے والے ہر نظامِ طاغوت کو مغلوب کرکے رکھ دیا تھا۔ آپؐ کی حیاتِ طیبہ میں شہرِ نبی مدنیت اور تمدن کا گہوارہ بن چکا ہے۔ جس سے ابھرنے والی نئی تہذیب کو منفق اور جدا نہیں کیا جاسکتا۔ اسی باعث شہرِ نبی کو دیکھنے اور سمجھنے کے لیے "تہذیبِ نظر" کی ضرورت محسوس کی گئی۔
تابش دہلوی ان زائرینِ حرم میں سے ہیں۔ جنہوں نے گھر سے پہلے زیارت کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ انہوں نے جسم و جان ہی نہیں بلکہ پورے وجود کو ایک نئی ترتیب دی تھی۔ اس لیے وہ کہتے ہیں:

ؔ شوقِ طیبہ میں جو گھر سے چلئے — پاؤں تھک جائیں تو سر سے چلئے
شوق کا ہے یہ تقاضا کہ یہاں — روح کے جذب و اثر سے چلئے

جب مدینے میں تابش پہنچے تو ان کی روح کے جذب و اثر کا یہ عالم بھی دیدنی رہا ہوگا جب انہوں نے یہ کہا۔

یہ زمین کوئے نبی ہے تابش — اس جگہ پلئے نظر سے چلئے

مدینہ میں روح کے "جذب و اثر" اور "پائے نظر سے چلنے والے زائر کی وارفتگی، فنائیت اور ساتھ ہی ساتھ استعجاب و حیرت کا یہ عالم تھا کہ تابش کو یہ بھی کہنا پڑا کہ؛

کس قدر روشنی ہے طیبہ میں — اس قدر روشنی میں کیا دیکھیں

تابش دہلوی نے اپنی ایک نعت کے مطلع میں یہ بات کہی ہے کہ "ان سے اپنا شعور پایا ہے، نور سے ہم نے نور" اس طرح زیرِ حوالہ شعر کے منظر نامے پر اگر نظر ڈالی جائے تو ایک تابش کے اپنے وجود کا نور، دوسری طرف تہذیب و تمدن یعنی طیبہ کا نور، تیسری طرف "نظامِ نور" کا نور چوتھی طرف "سرخیلِ نوریاں" کا نور اور ان کے اوپر اور ان سب کے اندر "نور" "علیٰ نور" اور "نور السموات" کا نور۔ پس نور کے پردے ہی پردے روضۂ رسولؐ، بس نور کے پردے

ہی پردے اور شہر نبی۔ ان انوار و تجلیات کا مشاہدہ کرنے کے لیے تابش کیا بڑے سے بڑے عُبّاد اور زہاد کی آنکھوں کا نور بھی کبھی کافی نہیں ہو سکتا۔

میں نے اس مضمون میں اب تک حضرت تابش دہلوی کی جن معنوی خوبیوں اور صفات کا ذکر کیا ہے وہ ان کی نعت گوئی کے تمام گوشوں اور زاویوں پر محیط نہیں ہے بلکہ اس کی قوس نعت گوئی کا ایک حصہ ہے بہت سارے گوشوں اور زاویوں سے صرف نظر کرتے ہوئے جس بات کا ذکر اب میں کرنا چاہتا ہوں وہ حضرت تابش کا جذبہ عشق نبی ہے۔ کہتے ہیں۔

سوزِ عشق نبیؐ بھی مل جائے — جب دلِ ناصبور پایا ہے

ایک اور شعر میں فرماتے ہیں:

اپنی صورت مصطفیٰؐ کے آئینے میں دیکھئے — معرفت میں انکی کچھ اپنی خبر بھی چاہیئے۔

تیسرے شعر میں لکھتے ہیں؛

حرارت ملے ہم کو عشق نبیؐ کی — بہت اپنے دامن کو تر دیکھتے ہیں

اس سلسلے کے چوتھے شعر میں کہتے ہیں:

رہے گرم بازارئ عشق احمدؐ — مجھے آنسوؤں تک کی قیمت ملی ہے

جناب تابش دہلوی کو نبیؐ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے آداب و احترام کے سارے جذبے اسی عشق نبی کے طفیل میں ملے ہیں۔ انہوں نے نبی کریم کی شان میں مدحت کے تمام کلمات ایک عاشق صادق بن کر کہے ہیں نہ کہ مجذوب بن کر۔

حضرت تابش کی نعت گوئی کے کچھ صوری محاسن بھی ہیں۔ اس سلسلے میں میرے احساسات یہ ہیں کہ عقیدہ کی صحت، مقام رسالت کی پہچان، کار نبوت کی تفہیم اور مدحتِ نبی کے لیے حسب حیثیت آداب و احترام کے لیے جناب تابش نے صنف نعت گوئی کو نئی لفظیات کا ایک ضروری ذخیرہ، نئی ڈکشنز کی ایک نئی پونجی اور نئی تراکیب کا ایک نیا سرمایہ دیا ہے۔ اس سلسلے میں پہلے لفظیات اور ڈکشنز کو ملاحظہ فرمائیں۔

جلوہ تقاضا، لطافت طلبی، دریا لقبی، سیراب لبی، صدف صدف، طور در طور، پستی کو مذاق برتری، وہم کی دیوار میں در، عفتِ مریم کا آئینہ، قبول کرم کی طاقت، جلوہ ارزانی اور مصر کی سوداگری وغیرہ۔

اب تراکیب ملاحظہ کریں۔

پردۂ اسرارِ خرد، چشم کیمیاگر، غازۂ رخِ گردِ سفر، حیرتِ چشم کلیم، شرفِ اجتبائی، سرخیلِ نوریاں، کاشفِ سرِّ کن، دلدارِ خستگاں، تہذیب نظر، مصدرِ خیر، منبعِ الطاف، قاسمِ کوثر دجناں اور گردشِ انوار وغیرہ

اتنی ساری باتوں کے بعد آپ شاید میری اس رائے سے اتفاق کریں گے کہ حضرت تابش نے نعت کہنے کی پُرکیف حالت میں "جذب" کے مقابلے میں جذبوں اور احساسات، لاشعور کے مقابلے میں شعور، بے خبری کے مقابلے میں خبر اور آگہی، افکارِ پرشکستہ کے مقابلے میں پرواز تخیل اور لفظوں کے مقابلے میں معنیٰ کی گہرائیوں سے کام لیا ہے۔ تابش کی نعت گوئی کی انہی خوبیوں کو دیکھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ:

اس سعادت بزورِ بازو نیست — تا نہ بخشند خدائے بخشندہ

تابش دہلوی اُردو کے ان معدودے چند شاعروں میں سے ہیں جو شاعری کو "حمزہ کا قصہ" یا "لڑکوں کا کھیل" نہیں سمجھتے۔ بلکہ قدیم دہلوی شعراء کی طرح وہ قطرہ میں دجلہ اور جزو میں کل دیکھنے دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ "نیم روز" کی غزلوں کے مطالعہ سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ تابش، بعض دوسرے معاصر شعراء کی طرح فکر و فن کے سلسلے میں سہل انگار نہیں ہیں، وہ الفاظ کی تلاش میں تراکیب کی ایجاد، استعارات کے ابداع اور محاورات کے استعمال میں پوری توجہ صرف کرتے ہیں، اسی لئے ان کے یہاں زبان و بیان کی وہ بے اعتدالیاں نظر نہیں آتیں جو دورِ حاضر کی شاعری میں عام ہیں اور جنہیں آج کا شاعر اپنے جہل و تساہل کو زیرِ نقاب رکھنے کے لئے جدت و اختراع کا نام دیتا ہے۔

ایک اور چیز تابش کی شاعری کو دوسرے غزل گو شعراء سے ممتاز کرتی ہے اور یہ ہے دہلویت کا پاس۔ تاریخ میں دہلویت نام ہے سلاطین و امراء کے تزک و احتشام کا اور ہند ایرانی تہذیب و ثقافت کی مرکزیت کا، لیکن شاعری میں دہلویت کہتے ہیں خیال کی پاکیزگی کو، جذبہ کی صداقت کو، بیان کی صفائی کو، اسلوب کی دلکشی کو، روحانی اقدار کے پاس کو، داخلیت کے انعکاس کو۔ لفظ و معنی کے باہمی ارتباط کو، دردمندی و انسان دوستی کو اور میر و مرزا سے لے کر سائل و بیخود تک کی روایاتِ شعری کے احساس کو۔ یہ ساری چیزیں تابش کی شاعری میں شعوری یا غیر شعوری طور پر بڑی خوبصورتی سے در آئی ہیں۔ اور اسی کی بدولت ان کی شاعری میں معنی خیزی و دلنشینی کی وہ سنجیدہ فضا پیدا ہوئی ہے جس سے ان کے بہت سے ساتھی محروم ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری

ڈاکٹر محمد عُذیر

حضرت تابشؔ دہلوی کی دید باز دید میں شخصیت نگاری

زندہ شعراء میں کلاسیکی رچاؤ اور ٹکسالی انداز میں جدید حوالوں اور فکری گہرائی کے ساتھ حضرت تابشؔ دہلوی جیسا کوئی اور غزل گو شاعر نہیں ہے۔ میں ایک عرصہ سے ان کی غزلیں سنتا آرہا ہوں جس کا آغاز فضلی مرحوم کے بیت الغزل کے مشاعروں سے ہوا۔ ایک بار رہیں یوم جگر کا مشاعرہ تھا اور جگرؔ کا ایک مصرعہ تھا ؎ افسانہ کہیں ختم سر دار ہوا ہے

اس مشاعرہ میں تابشؔ صاحب کی غزل کا ایک شعر ایسا تھا جس نے مشاعرہ لوٹ لیا اور میں چونکا کہ کس غضب کا شعر ہے ؎

دنیا سے ہوا ہوں غم دنیا کا طلبگار بازار کا سودا سر بازار ہوا ہے۔

اور بھی عمدہ شعر پیش کئے جا سکتے ہیں ؎

ٹوٹ کر عہد تمنا کی طرح معتبر ہم رہے فردا کی طرح

تابشؔ صاحب نے زمان و مکان کو خوب ملایا ہے اور تخیل کی جدت کا بھی مظاہرہ کیا ہے۔ مثلاً دو شعروں میں ؎

چھوٹی پڑتی ہے انا کی چادر پاؤں ڈھکتا ہوں تو سر کھلتا ہے

؎ اس قدر کوئے شب و روز سے ناواقف ہوں بار ہستی نہیں معلوم کہاں رکھنا ہے

تعجب ہے کہ اب تک اہل ذوق نے حضرت تابشؔ کو کوئی لقب نہیں دیا۔ میں ہر چند کہ ادب و شعر کے میدان میں سبزۂ بیگانہ ہوں ضروری سمجھتا ہوں کہ "شمس الشعراء" یا "آفتاب سخن" کا لقب تابشؔ صاحب کو پیش کیا جائے۔ تابشؔ صاحب کی شاعری کی عمر بفضل تعالیٰ طویل ہے اور وہ اس عرصہ میں مختلف شخصیتوں سے ملے ہیں۔ ان سے ربط ضبط بھی رہا ہے۔ چنانچہ ان کی نثری کتاب "دید باز دید" شخصیتوں پر نگاہِ غائر اور ان کے تاثرات کا دلچسپ مجموعہ ہے۔ ادبی خوبی یہ ہے کہ شخصیتوں کی ادبی تصویر اس قدر استادانہ انداز سے پیش کی گئی ہے کہ کم از کم الفاظ میں اس شخصیت کا بھرپور تعارف کرا دیا جائے۔ اور کردار کی خوبیاں اور ان کی خصوصیات بیان کر دی جائیں۔ اس کتاب کے ۲۴ میں سے ۲۲ مضامین مختلف شخصیتوں کے بارے میں ہیں۔ سہولت کی خاطر ہم نے شخصیت نگاری کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے (۱) تعارف (۲) کردار فضائل اور (۳) نظریۂ فن اور شاعری تابشؔ صاحب نے ان تینوں کا حق ادا کیا ہے۔ شخصیت نگاری کے بارے میں خود تابشؔ صاحب کے ایک اقتباس سے

ابتداء کرنا مناسب ہوگا۔ فرماتے ہیں۔

"عظیم شخصیتوں کو دیکھ لینا بھی عظمت ہے اور مجھے یہ شرف حاصل ہے کہ میں نے برصغیر کی بعض ادبی و علمی شخصیتوں کو دیکھا ہے اور بہت قریب سے دیکھا ہے۔ اسمیں مہاراجہ سر کشن پرشاد، راجہ پرتاب گیر، سر نظامت جنگ، فصاحت جنگ جلیل مانکپوری، نظم طباطبائی، مرزا ہادی رسوا ، سید عبد العماد، وحید الدین سلیم پانی پتی، مسعود علی محوی، مولوی عبد القدیر بدایونی، مولوی عنایت اللہ، سید قاضی عبد الغفار، سید ظہور علی، الیاس برنی، وغیرہ وغیرہ شامل ہے۔ ان میں سے اکثر نام آپ کے لیے اجنبی ہوں گے۔ لیکن تہذیب وتمدن ان کو نہ صرف یاد رکھیں گے بلکہ وہ ان ناموں کو ہمیشہ ادب واحترام سے لیں گے (ص۲)"

ترتیب کے مطابق پہلے ہم تعارف شخصیات کی مثالیں پیش کریں گے جو کہ تابش نے فانی پر بہت کام کیا ہے۔ اس لیے پہلے فانی کا تعارف ملاحظہ ہو:

"ان دنوں جامع عثمانیہ مختلف عمارتوں میں تھی۔ انہیں میں سے ایک کوٹھی مسرت منزل تھی یہاں مہاراجہ کی صدارت میں فانی کے اعزاز میں ایک مشاعرہ ہوا۔ میں نے پہلی بار فانی کو اس مشاعرہ میں دیکھا اور سنا۔ دراز قد چھریرا بدن، سانولا رنگ، کشادہ پیشانی، تیکھے نقوش، پتلی مہری کا پاجامہ، صوفیانہ رنگ کی شیروانی اور ترکی ٹوپی، چہرے پر متانت اور سنجیدگی کے آثار نمایاں، فانی کی شخصیت پر وقار تھی۔"

اس مشاعرہ میں فانی نے جو اشعار پڑھے انہوں نے حافظہ کی مدد سے لکھے ہیں ان میں سے ایک شعر یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

سرور عقل و غم عشق کے دوراہے پر | بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا دیئے تو نے

ایک اور مشاعرہ کا شاہکار شعر بھی نقل کیا ہے ؎

بے ذوق نظر بزم تماشہ نہ رہے گی | منہ پھیر لیا ہم نے تو دنیا نہ رہے گی

"شاہد احمد دہلوی کا تعارف ملاحظہ ہو:

شاہد بھائی ایک خاص مزاج کے آدمی تھے۔ وہ بظاہر کم آمیز تھے۔ مگر بہ باطن سراپا محبت اور خلوص۔ ہر شخص سے ایک فاصلہ قائم کر کے ملتے۔ نہ کسی کی حدوں میں داخل ہوتے اور نہ کسی کو اپنی حدوں میں آنے دیتے لیکن چند لوگوں سے وہ نہایت بے تکلف اور کھل کر ملتے تھے۔ مزاج کی اسی کیفیت کی وجہ سے انہیں کچھ لوگ مغرور سمجھتے تھے حالانکہ ان کے مزاج میں بلا کی فروتنی تھی۔ ان کا لباس ہمیشہ سے ایک نہج کا ہوتا، شفاف بیلدار کرتا اور لٹھے کا

پاجامہ اس پر شیروانی اور ٹوپی اور پاؤں میں معمولی سا پمپ ۔ وہ ہمیشہ سے بیڑی پیتے تھے اور جب بیڑی نہ ملتی تو سستا سگریٹ پسند کرتے ، بڑے آدمیوں سے انہوں نے کبھی دوستی نہیں رکھی ۔ حالانکہ بہت سے بڑے آدمی ان کے ہم سبق اور کسی نہ کسی طرح ان کے ممنون احسان تھے وہ غریبوں سے مل کر زیادہ خوش ہوتے اور انہیں سے میل جول رکھتے"
(صفحات ۳۲ ـ ۳۶)

اب میراجی کا تعارف ملاحظہ ہو:

"میراجی درمیانہ قد کے آدمی تھے ، اکہرا بدن ، کتابی چہرہ ، تیکھے خدوخال ، سیدھی چوڑی پیشانی ، گندمی رنگ چوڑا سینہ ، ابھرواں ستواں ناک ، چمکدار گہری آنکھیں ، پتلے اور پیوست ہونٹ ، دانت خوب صورت اور مضبوط ہاتھ لمبے اور چوڑے ، شانوں تک بال ، مگر ہیئت کذائی یہ کہ ایک ہاتھ میں لوہے کے گولے ، دوسرے میں کاغذوں کا پلندہ ، گرمیوں میں بدن پر موٹا بدرنگا کوٹ ، ٹانگوں میں گرم پتلون ، اور پاؤں میں بھدے انگریزی جوتے ، راشد نے مجھے ان سے ملایا ، نام تو پہلے ہی سنا تھا ، ہیئت کذائی اور خدوخال دیکھ کر دلچسپی بڑھی اور دس پندرہ منٹ میں یوں محسوس ہوا کہ برسوں کی دوستی ہے ، میراجی اپنی محبت اور نفرت میں بڑے کھرے تھے وہ پہلی ہی ملاقات میں اپنی محبت اور نفرت کا اظہار انتہائی بونگے طریقے سے کرتے تھے"۔ (صفحہ ۳۹)

ذرا آگے چل کر میراجی کے بارے میں لکھتے ہیں ۔

میراجی اپنے حلیے کے ساتھ مزاج کے بھی اول جلول تھے ۔ کبھی تین تین فاقے اور کبھی پانچ پانچ روپے کی آئسکریم اکیلے کھا جاتے تھے ۔ کبھی چھ چھ ہفتے نہیں نہاتے اور کبھی دو مرتبہ نہاتے ، شاعری ان کی فطرت میں رچی بسی تھی وہ احساس حسن کی شدت کو شاعری کا نام دیتے (صفحہ ۴۰)

حلقۂ احباب کا تنوع ظاہر کرنے کے لیے اب میراجی کے بعد بالکل مختلف شخصیت ماہر القادری کا تعارف ملاحظہ ہو:

"مولانا ماہر القادری اپنی ذات میں ایک انجمن تھے اور ہر انجمن میں ایک ذات تھے ۔ وہ بیک وقت ایک ادیب ، شاعر بذلہ سنج ، محقق ، مولوی ، دوست غرض سب کچھ تھے ہر خاص وعام کے لیے ان کی شخصیت نہایت پرکشش اور دلچسپ تھی ۔ ان کے پاس بیٹھ کر آدمی اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا تھا ۔ ان کی ذات پہلو دار تھی اور وہ جس انجمن میں ہوتے ان کی ذات مرکز انجمن ہوتی بلکہ یوں کہیے کہ ساری انجمن ان کی ذات میں سمٹ آتی ۔ ان کی جدائی ایک بہت بڑا سانحہ ہے ان کی جدائی سے کتنی آنکھیں اشکبار اور کتنے دل غمگین ہیں ۔ مگر انہیں غمگین دلوں اور اشکبار آنکھوں کو یہ منظر بڑا دلکش معلوم دیتا ہے کہ وہ عاشق رسولؐ دیار رسولؐ میں آسودۂ خاک ہوا ہے وہیں پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا ۔ (ص ۴۵ اور ۴۹)

اپنے دوستوں میں محشر بدایونی کا تعارف ملاحظہ ہو!

"پان اور غزل" ـــــ اصل میں دونوں ایک ہیں اور محشر بدایونی انہیں دونوں سے عبارت ہیں ۔ وہ پان بہت کھاتے ہیں اور خوب غزلیں کہتے ہیں ، پان ہمارا تہذیبی ورثہ ہے اور غزل ہماری تہذیب کی ترجمان اور نمائندہ ۔ وہی غزل گو بڑا شاعر ہے جس کا تہذیبی ورثہ بڑا ہے ۔ ... چلتے ہمیشہ کندھا ڈال کر ہیں ۔ اور یوں محسوس ہوتا ہے

کہ فضا کا بوجھ گویا انہوں نے سنبھال رکھا ہے ان کی چال کسی کڑی کمان کا دور گرتا ہوا تیر ہے۔ اب جسم دبلا ہے مگر دیکھنے کا وہ ہمت کو تھکا دیتے ہیں۔ بیماری میں بھی دفتر جاتے ہیں۔ وہ کار دنیا سے تمام نہ کردہ کے قائل نہیں۔ (صہ ۵۱ اور صہ ۵۳)

اب مناسب ہوگا کہ بعض اساتذہ جن کے بارے میں لوگوں کو زیادہ معلوم نہیں ان کا تعارف بھی پڑھنے کی چیز ہے۔ ملاحظہ ہو:

"بیخود دہلوی میانہ قد، دہرے جسم، سانولے رنگ اور کتابی چہرے کے آدمی تھے۔ چہرہ پر بھرواں کھچڑی داڑھی، سر پر ترکی شیر گول ٹوپی، جسم میں کرتا اور شیروانی اور سیدھا پاجامہ۔ ہاتھ میں ہر وقت ہزار دانے کی تسبیح۔ قلعہ میں گوروں کو اردو پڑھاتے تھے۔ خاص دلی والوں کا لب ولہجہ، وہی چرب زبانی اور وہی طنطنہ۔ بات ہوئی اور وہی ضلع جگت پر اتر آئے۔ مٹیا محل میں رہتے تھے۔ محلہ والے ان سے ڈرتے بھی تھے۔ اور ان کی عزت بھی کرتے تھے۔

سائل دہلوی کا حلیہ تھا دراز قد، سرخ وسفید رنگ، چہرہ پر امارت وشرافت خاندانی کے واضح آثار، سفید بھرواں داڑھی، سر پر مخملی چوگوشیہ ٹوپی، جسم پر انگرکھا، گفتگو میں نرمی اور شائستگی، آواز میں سریلا پن، چال ڈھال مہذب، وضع قطع میں ستھرا پن اور نفاست، گذر بسر خاندانی جائیداد اور لوہارو کے وظیفے پر تھی۔ شہر کے سب لوگ عزت کرتے تھے۔ دلی میں ان کے شاگردوں کی کثیر تعداد تھی۔ وہ پنڈت کوچہ کے قریب لال دروازہ میں رہتے تھے۔

آغا شاعر قزلباش میانہ قد سرخ وسفید دوہرے جسم کے آدمی تھے۔ وضع قطع سے بالکل دلی والے معلوم نہیں ہوتے تھے۔ کسی زمانہ میں نہایت خوب صورت شخصیت کے مالک تھے، سر پر پشاوری کلاہ اور پگڑی، جسم پر ترکش کوٹ، ٹانگوں میں اٹنگی شلوار، پاؤں میں عام طور پر بوٹ، اور ہاتھ میں موٹا سا ڈنڈا، آواز میں نہایت نمگینی، لیکن مشاعرے میں غزل پڑھتے تو شیر کی طرح گرجتے اور تحت اللفظ پڑھتے کہ بڑے بڑے مترنم شعراء کی ہوا اکھڑ جاتی۔ مزاجاً نہایت منکسر اور طبیعت میں فقیرانہ لٹکا۔ آغا شاعر کے یہاں زبان کے علاوہ فکر وخیال کی جادوگری بھی ہوتی ہے اور میری ناچیز رائے میں داغ کی صحیح جانشینی انہی پر جچتی تھی (صہ ۵۶)

آغا حشر کاشمیری آغا شاعر کے شاگرد تھے اور اسی لیے اپنے نام میں آغا کا سابقہ استعمال کرتے تھے۔ اب ایک غیر مسلم شاعر کا تعارف بھی دیکھئے:

"پنڈت امرناتھ ساحر دلی کے کشمیری پنڈتوں کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ اسلامی ہندی تہذیب کا اعلیٰ نمونہ تھے، لمبا قد، چھریرا جسم، سفید نہایت لمبی داڑھی، گندمی رنگ کا کھڑا ناک نقشہ، شعر نہایت کریہہ آواز میں پڑھتے تھے پنڈت جی کے گھر پر ماہانہ مشاعرہ ہوتا تھا۔ اور شہر کے معزز شعرا اس میں شریک ہوتے تھے، پنڈت جی کا ایک شعر سنیے، غالب کی زمین اچھا شعر نکالا ہے ؎

کوئی حرم سے کوئی دیر سے منسوب ہے کوئی
اک رہ گیا ہوں میں کہ تمہارا کہیں جسے

ایک اور غیر مسلم شاعر مہاراج بہادر برق کا بھی ذکر کیا ہے۔ اور بتا دیا کہ وہ مشہور شعر ....
'پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔' انہی کا ہے۔ میر کا نہیں (صہ ۱۴۴)

آخر میں نظم طبا طبائیؒ کا تعارف :۔

نظم طبا طبائی بھاری جسم اور چوڑی ہڈی کے آدمی تھے۔ وہ بہت اونچا سنتے تھے میں نے جب انہیں دیکھا تو وہ ۸۰ سے متجاوز تھے، ایک مشاعرہ ان کی صدارت میں فرحت منزل میں ہوا تھا۔ مجھے شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ میں بھی اس مشاعرے میں سننے والوں میں شریک تھا۔ مولانا نظم طبا طبائی نے اپنا کلام سنانے سے پہلے انیس کی غزلوں کے کچھ شعر سنائے تھے۔ ایک شعر آپ بھی سنیئے

خار کو گل کے قریں دیکھ کے میں یہ سمجھا چیختے چیختے بلبل کی زبان سوکھ گئی۔

نظم طبا طبائی بھی واجد علی شاہ کے دربار کے آدمی تھے بلکہ انہوں نے شہزادوں کو عربی پڑھائی تھی۔ وہ مرزا ہادی رسوا سے عمر میں بڑے تھے۔ یہ مشاعرہ ۱۹۳۰ء میں ہوا تھا۔" (صد ۸۰)

اب ہم تعارف شخصیات کے بعد بعض شخصیتوں کے کردار و خصائل کا ذکر کرتے ہیں۔ چونکہ فانیؔ کی اہمیت زیادہ ہے اس لیے ان کی شخصیت سے متعلق چند چیزیں جو قابل غور ہیں پیش کی جاتی ہیں۔ تابش صاحب فرماتے ہیں۔

وہ دنیا کی ہر چیز کو "حس" کی طرح قبول کرتے تھے۔ ان کی زندگی کی ناکامی کا ایک راز یہ بھی ہے حالانکہ دنیا میں بہت سی چیزیں ایسی بھی ہیں جن کو بغیر محسوس چھوڑ دینا ہی عقلمندی ہے۔ کردار میں خودداری اور شرافت نفس کا جذبہ مکمل تھا ایک واقعہ اس کی روشن دلیل ہے :۔

فانیؔ کی رفیق حیات جس وقت ان سے ہمیشہ کے لیے جدا ہوئیں۔ فانیؔ کے پاس جو کچھ جمع پونجی تھی، وہ ان کے علاج میں خرچ ہو چکی تھی۔ اور اب تجہیز و تکفین کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ ایسے نازک وقت پر فانیؔ کے ایک مخلص دوست نے جو حیدرآباد کے ایک معزز جاگیردار تھے فانیؔ کی مدد کرنی چاہی۔ بجائے اس کے کہ فانیؔ اس مدد کو شکریے کے ساتھ قبول کرلیتے، فانیؔ نے ایک خاص انداز میں کہا کہ آپ ایسے نازک موقع پر مجھ کو خریدنا چاہتے ہیں۔ میں آپ کی اس محبت کا بے حد ممنون ہوں!! اگر آپ کو میری کوئی مدد کرنی ہی منظور ہے تو آپ یہ کرسکتے ہیں کہ "عرفانیت فانی (جو کہ تازہ تازہ شائع ہوئی تھی۔) اس کے چند نسخیں خرید لیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ان کتابوں سے جو روپیہ جمع ہوا اس سے تجہیز و تکفین ہوئی۔ اللہ اللہ یاس شخص کی زندگی کا واقعہ ہے جو ہمیشہ زندگی میں خوددار رہنے کی ایک کامیاب کوشش بعنوان غم ہر نفس کے ساتھ کرتا رہا اور جس نے زندگی کے وہ نشیب و فراز دیکھے تھے جو واقعی دوسروں کو اس سے ممتاز کرگئے۔ ایسے نازک وقت میں اپنے کردار کی انفرادیت قائم رکھنا فانیؔ جیسے لوگوں کا کام تھا (صد ۱۰۱، ۱۰۲)

ایک اور جگہ تابشؔ صاحب نے لکھا ہے۔

"فانی بہت دوست پرست اور خلیق تھے۔ ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی تھی کہ وہ اپنے دوستوں کو ترقی دیں لیکن بدقسمتی سے اس کے باوجود ان کو کوئی دوست میسر نہ آیا ورنہ زندگی کی تلخیاں شاید کم ہوجاتیں۔"

فانیؔ کی خودداری کا ایک اور واقعہ فانیؔ کے الفاظ کی ترجمانی کی شکل میں دلی کے ایک مشاعرے کے ضمن میں ہے۔

"لیکن شرکت مشاعرہ کے لیے نکلا، راستہ میں ایک صاحب سے دریافت کیا کہ یہاں مشاعرہ کہاں ہے؟ انہوں نے جواب

دیا یہاں کوئی مشاعرہ وغیرہ نہیں ہے۔ یہ سن کر مجھے بے حد رنج ہوا اور میں نے کہا اللہ اکبر! یہ وہ دلّی ہے جہاں میرؔ۔ مومنؔ۔ غالبؔ۔ پیدا ہوئے۔ بس اُلٹے پیر واپس آیا۔ اور اسٹیشن چلا گیا۔" ص ۱۷)

ایک آخری مثال فانیؔ کے دور کی ہے تابشؔ صاحب لکھتے ہیں :۔

"ان کی رفیقۂ حیات ان کے لیے زیادہ مہلک ثابت ہوئیں۔ چنانچہ ان کے انتقال کے بعد فرمایا کہ ہم بھی اب زیادہ نہیں جئیں گے چنانچہ اپنی وفات کا مادۂ تاریخ خود ایک قطعہ میں کہا جو یہ ہے۔

اُو از جہاں گذشت کہ آخر عدانہ بود | اُو آں چناں بزیست تو گوئی خدانہ داشت
طغیانِ نازمیں کہ بہ لوحِ مزارِ اُو | ثبت است سالِ رحلتِ فانیؔ "عدانداشت"

میں نے اس کو نوٹ کر لیا فرمایا جھوٹ سچ دیکھنے کے لیے لکھ لیا ہے اس کے بعد ہنسے اور خاموش ہو گئے۔"

میراجی کے بارے میں تابشؔ صاحب لکھتے ہیں۔

"خوب صورت چہرہ، اچھی بات، دلکش نغمہ، دلفریب منظر ان کے نزدیک سب شعر تھے۔ خوب صورت چہرے ان کی تکلیف میں اضافے کا سبب ہوتے، اچھا منظر انہیں غمگین کر دیتا۔ غرض احساس کی یہ شدتیں ان کے لیے سوہان روح تھیں انہوں نے ان سے فرار کی بہت سی راہیں نکال لی تھیں۔ وہ شراب زیادہ پینے لگے تھے۔ ہر وقت نئی نئی اور عجیب باتیں کرتے وہ اپنا دل بہلاتے اور توجہ ہٹاتے۔ مگر ان سب باتوں میں کوئی بناوٹ نہیں ہوتی تھی۔ وہ سچے آدمی تھے اور اسی سچائی کو ہر جگہ دیکھنا چاہتے۔ یہ ان کی زیادتی تھی۔ ان کے ذہن کی صورت عجب عجب روپ دھارتی تھی ایک دفعہ قاری زاہر قاسمی کو ایک کمرے میں بند کر کے انہوں نے سورہ رحمٰن سنی اور پھر روتے روتے اور سر پھوڑتے ان کا جو حال ہوا اس کا اندازہ ان خراشوں اور چوٹوں سے کیا جا سکتا تھا جو چھ سات دن تک ان کے چہرے اور سر پر رہیں۔ یہی حال جے جے ونتی راگ سن کر ہوتا۔ وہ جے جے ونتی سے اس طرح گھبراتے جیسے گلے قصائی سے (ص ۴۰ اور ۴۲)

جوشؔ کے بارے میں تابشؔ صاحب کا تجزیہ بھی پڑھنے کے لائق ہے وہ لکھتے ہیں :

"جوشؔ سچے آدمی تھے ان کی سچائی کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ ان کے کردار کا کوئی بُرا یا بھلا پہلو ایسا نہیں تھا جو ہر آدمی پر روشن نہ ہو۔ اور کردار کے اسی رُخ نے انہیں بعض کی نگاہوں میں ایک دوسرے سے محبوب بنا دیا تھا اور بعض ان کی اس روش سے ان کے جانی دشمن تھے۔ طعن و تشنیع کا کون نشتر ہے جو ان کے دل میں نہ پیوست کیا گیا ہو۔ ایذا رسانی کے تمام سیلابوں کا رخ ان کی طرف موڑا گیا، کفر کے فتوے لگائے گئے۔ انہیں کافر و زندیق کہا گیا اور بعض اوقات ان پر عرصۂ حیات تنگ کرنے کے حربے بھی استعمال کئے گئے۔ حیدر آباد کی ریاستی سازشوں کا بالآخر وہ بھی شکار ہوئے۔ اور نظام دکن کی سالگرہ کے موقع پر شائع ہونے والی ایک بہاریہ نظم کے اس شعر کو ؎

کبھی جوشؔ کے جوش کی مدح فرما | کبھی دلبروں کی ثنا خوانیاں کر

بہانہ بنا کر انہیں ریاست سے نکال دیا گیا۔

جوشؔ کی قد آور شخصیت اس معاشرے میں ایسی ہی ہے جیسے بونوں کی بستی میں گلیلیو۔ ہزار نظام دکن اور ہزار کفر کے

فتوے لگانے والے مل کر بھی ان کی شخصیت کو دھندلا نہیں سکتے جوش زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے (صہ۶۱۔ ۶۳)

بخاری صاحب کے کردار و خصائل کا ذکر تابش صاحب نے ایک مکالمہ شروع کیا ہے:

"تابش میں کیسا آدمی ہوں"؟

بخاری صاحب آپ بہت بُرے اور اچھے آدمی ہیں"۔

"یہ کیا بات ہوئی آدمی اچھا ہوتا ہے یا بُرا۔"

"یہ ٹھیک ہے جب تک آپ آدمی رہتے ہیں اس وقت تک بہت اچھے رہتے ہیں اور جب آدمی کی ایکٹنگ کرتے ہیں تو بہت بُرے، ہو جاتے ہیں"۔

مگر میں بُرے آدمیوں سے آدمی کی ایکٹنگ کرتا ہوں اچھے آدمیوں سے نہیں" (صفہ ۲۳)

تابش سنہ ۱۹۵۰ء کے ایک ہندو پاک مشاعرہ کا ذکر کرتے ہیں جس میں چوٹی کے شعراء موجود تھے۔ حفیظ جالندھری پاؤں پھیلائے بیٹھے تھے: بخاری صاحب نے حفیظ جالندھری سے کہا کہ یہ بزم ادب ہے ادب سے بیٹھیے۔ اور اس طرح انہوں نے میر درد کی تہذیبی روایات کو زندہ کر دیا۔ ہر چند بخاری صاحب نہ میر درد تھے اور نہ حفیظ شہزادے" (صہ۲۵)

کردار کے ضمن میں شاہد احمد کے ایک بھائی مبشر احمد کا بھی ذکر کیا جو حیدرآباد میں نامور پولیس انسپکٹر تھے۔ مبشر صاحب نے ایک بار نظام دکن کی موٹر کار کا چالان کر دیا اور عدالت سے ڈرائیور پر جرمانہ کرا کے چھوڑا شاہد احمد کے ایک پھوپھی زاد بھائی ڈاکٹر اشرف الحق تھے جنھوں نے عورت اور منشیات پر خوب خوب تجربے کئے۔ لیکن کردار میں وضع داری، مروت اور پاسِ احباب بہت زیادہ تھا۔ ایک بار چند احباب ساتھ بیٹھے تھے کہ ان کا بیٹا آیا اور اعلانیہ کہہ دیا کہ بہن کا انتقال ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بیٹے کو ڈانٹا کہ میری بیٹی مری ہے تم نے ان سب کو کیوں بے مزہ کیا۔ اور خود محفل میں بیٹھے رہے جب تک کہ محفل برخاست نہیں ہو گئی اور شرکاء محفل سے اپنے بیٹے کی بدتمیزی کی معذرت کرتے رہے۔

اس ذکر کے بعد تابش صاحب نے وہ شعر دہرایا ؎

اب دیکھنے کو جن کی آنکھیں ترستیاں ہیں   دے صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں۔

اب مقالہ کے آخری حصہ نظریہ فن اور شاعری کی طرف آتے ہیں۔ فانی پر تفصیلی مقالہ ایک اور فاضل مقالہ نگار لکھ رہے ہیں۔ اس لیے فانی کے چند پسندیدہ اشعار جن کا تابش صاحب نے ذکر کیا ہے۔ وہ پیش کئے جائیں گے۔ ان کے کردار اور فضائل کے ضمن میں جو باتیں عرض کی گئی ہیں ان سے فانی کے فن سے متعلق کچھ اشارے واضح ہیں۔ مومن کا ایک شعر جو فانی اکثر پڑھا کرتے تھے وہ یوں تھا۔

ہم بھی خاموش نہیں وفا کرکے   تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

اسی طرح موہانی کا ایک شعر اکثر پڑھا کرتے تھے ؎

بس کھل گئی حقیقت نقاشیٔ خیال   اپنے ہی رنگ بھر دیئے تصویر یار میں (صہ۱۰)

فانی کو یاس یگانہ کا ایک شعر بہت پسند تھا اور اکثر مترنم انداز میں زانوں پر ہاتھ مار مار کر پڑھا کرتے تھے

چتونوں سے ملتا ہے کچھ سراغ باطن کا چال سے تو کافر کی سادگی برستی ہے (ص۶۹)

ماہر القادری کے بارے میں تابش نے لکھا ہے کہ ماہر کو الفاظ کی تحقیق بلکہ "تفتیش" کا بڑا شوق و ذوق تھا اور اس معاملہ میں کسی سے رو رعایت نہ برتتے (ص۴۲)

محشر بدایونی کے نظریۂ شاعری سے متعلق تابش صاحب لکھتے ہیں :

"محشر کی شاعری حسن و محبت کے جادو نہیں جگاتی بلکہ آفاقی اور کائناتی حسن و محبت کی جھلکیاں دکھاتی ہے درایت کے ساتھ ساتھ روایت کا حسن نکھرا نکھرا دکھاتی دیتا ہے اور کیوں نہ ہو روایت تو ماضی اور مستقبل کی ایک درمیانی کڑی ہے روایت کے بغیر ارتقاء ممکن نہیں۔ قومیں اپنی روایت ہی سے پہچانی جاتی ہیں" (ص ۵۳) محشر کے ابتدائی زمانے کا ایک شعر نقل کیا گیا ہے ؎

پژمردگیٔ گُل پہ ہنسی جب کوئی کلی آواز دی خزاں کہ تو بھی نظر میں ہے

فانی اور یاس یگانہ کی خوب دوستی تھی لیکن اختلاف رائے بھی تھا۔ دوستی میں ایک رکاوٹ فانی کی غالب دوستی تھی۔ فانی غالب کے پرستار اور یگانہ غالب کے دشمن۔ غالب سے مرزا صاحب کی نفرت کا سبب یہ تھا کہ وہ غالب کو ہرگز اس شہرت کا مستحق نہیں سمجھتے تھے جو اُسے حاصل تھی۔ فارسی شاعری جس پر غالب کو ناز تھا مرزا صاحب کے نزدیک لوچ تھی اور وہ غالب کو متقدم فارسی شعراء کے کلام کا سارق سمجھتے تھے۔ غالب نے خود بھی تقریباً ۲۹ شعرا کا اپنے کو متبع بتایا ہے۔ غالب کی اردو شاعری کے متعلق مرزا صاحب کا یقین تھا کہ غالب جس رنگِ سخن کے موجد سمجھے جاتے ہیں۔ ان سے پہلے یہی رنگِ سخن ناسخ نے اور ان کے بعد مومن نے ایجاد کیا۔ اور غالب ایک طرح سے ان دونوں کے متبع ہیں۔ ویسے بھی محمد حسین آزاد کی طرح مرزا صاحب کا یہ دعویٰ تھا کہ غالب کو اردو نہیں آتی تھی"۔ (ص ۶۷-۶۶)

تابش صاحب نے داغ اور امیر مینائی وغیرہ کے رنگِ سخن کو چوما چاٹی کی شاعری اور سطحی اور غیر اہم بتایا ہے۔ (ص ۱۲۳) راقم الحروف بصد عبارت تابش صاحب سے اختلاف رکھتا ہے۔ داغ اور ذوق کے سہل ممتنع یا بقول فراق گورکھپوری ٹھیٹھ اردو پر اکتفا کتنے شعراء کو نصیب ہوا۔ اگر لوگ داغ کا مطالعہ کریں تو انہیں نثری شاعری کی رحمت غیر ضروری معلوم ہوگی۔

داغ کا حمدیہ شعر ہے ؎

داغ کو کون دینے والا تھا اس کو جو کچھ دیا دیا تو نے

اس سے زیادہ سادہ زبان اور معنی کے اعتبار سے بھی جامع شعر کہنا آسان نہیں ہے۔ امیر مینائی اور داغ کو ایک صف میں کھڑا کر دینا کچھ کھٹکتا ہے۔ غالباً محسن کاکوروی کے بعد امیر مینائی سے بڑا نعت گو اردو شاعری میں کوئی نہیں ہے۔ پھر یہ کہ امیر مینائی کے اشعار میں ضرب المثل بننے کی صلاحیت بہت زیادہ ہے جو ذوق کی یاد دلاتے ہیں۔ بہرحال تابش صاحب اساتذہ کی صف میں ہیں۔ ان کا فرمانا مستند سمجھا جاسکتا ہے تاہم ایک عام قاری کو اختلاف کا حق ہے امید ہے تابش صاحب اس اختلافی نوٹ کو اس کی صحیح روح میں دیکھیں گے۔

ہم نے ابتدا میں عرض کیا تھا کہ ۲۴ میں سے ۲۲ مضامین شخصیات سے متعلق ہیں ۔ باقی دو مضامین میں ایک ساقی کے کردار سے متعلق ہے ۔ دوسرا مضمون مشاعروں سے متعلق ہے ۔ اس دوسرے مضمون کے آخری حصّہ میں پر اس ....

. ... مقالہ کو ختم کرنا مناسب ہوگا ۔ تابش صاحب فرماتے ہیں :

مشاعرے جب تک شاعری ہے قائم رہیں گے لیکن اب مشاعروں اور دنگلوں میں زیادہ فرق نہیں ۔ نہ وہ لوگ ہیں جن کے دم سے شاعری کا بھرم تھا اور نہ وہ لوگ جن سے تہذیب زندہ تھی ہمارے کتنے ساتھی ہم سے جدا ہو گئے ، ادیب سہارنپوری ، ارم لکھنوی ، ظریف جبلپوری ، حفیظ ہوشیارپوری ، سید محمد جعفر ، ماہر القادری ، سراج الدین ظفر ، اور قمر جلالوی !! مشاعروں کی کہانی بڑی طویل ہے اور طویل رہے گی ۔ میں پہلی بات دہراؤں ، ہزاروں مشاعروں نے ہماری تہذیب اور ادب کو پروان چڑھایا ہے اور مشاعروں ہی میں تہذیب نے شاعری سے اور شاعری نے تہذیب سے بہت سے سبق لیے ہیں ۔ کاش آئندہ بھی ایسا ہو !!! (ص ۱۵۱)

مختصراً ۱۸۷ صفحات کی کتاب " دیدہ بازدید " میں کتنی شخصیتوں کے بارے میں کتنی زیادہ معلومات فراہم کی گئی ہیں ۔ کیسے کیسے تاثرات و مشاہدات پیش کیے گئے ہیں ۔ یہ بہت بھرپور کتاب ہے اور لکھنے والوں کے لیے نمونہ ہے کم ضخامت میں کیا کچھ ممکن نہیں ہے ۔ شخصیتوں سے متعلق دو مقامات پر تابش صاحب نے بجا طور پر یہ شعر نقل کیا ہے ؎

وے صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں   اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

رہے نام اللہ کا ۔

○

جناب تابش میرے دیرینہ کرمفرما ہیں۔ میں نے بیشمار مشاعرے آن کے ساتھ پڑھے ہیں اور انہوں نے ہر مشاعرے میں ایسا کلام پڑھا ہے جس سے سامعین اور شعراء کی معلومات میں اضافہ ہوا اور پھر آن کے خیالات و تصورات سے مختلف پگڈنڈیاں بلندیوں کی طرف نکل گئیں اور راستوں پر تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر دوسروں کے نام آویزاں ہوگئے اور یہ کوئی بڑی بات نہیں چراغ سے چراغ جلتا چلا آرہا ہے۔ ہر نغزگو شاعر اپنے مقلد پیدا کر لیتا ہے اور ہر شاعر ایک خیال سے دوسرا خیال پیدا کرتا چلا آرہا ہے اور یہی آگے چل کر ترقی زبان ہی نہیں فکر و خیال کی بلندی کہلانے لگتی ہے جو شاعر کا معیار متعین کرتی ہے۔

جناب تابش متین اور سنجیدہ شاعری کرتے ہیں ان کے یہاں دل و دماغ بولتے ہیں وہ صرف خوبصورت الفاظ کے تاووں پر نہیں جھولتے اور نہ ٹکسال کے انبار لگاتے ہیں بلکہ ان کے یہاں اس مقام کی شاعری ہوتی ہے جسے خوش ذوق سُن کر حظ اٹھاتے اور کم ذوق لوگ سوچنے لگتے ہیں

میں نے تابش سے ہمیشہ معیاری اشعار سُنے اور خلوت و جلوت میں انہیں شرافت کے معیار سے گرتا نہیں دیکھا۔ ایسے لوگ راہ داں نہیں راہ گر ہوتے ہیں اور ایسے ہی لوگوں کے نقشِ قدم پر چل کر آنے والی نسلوں میں ادب کا ذوق منتقل ہوتا ہے۔

احسان دانش

احمد ہمدانی

تہذیبی روایت کا شاعر

چہکتی بولتی دلی کو دیکھنا ہو تو مسعود الحسن تابش دہلوی سے ملاقات کریجئے۔ دلی جس کے کوچے "اوراقِ مصوّر" اور جس کے باسی منتخب روزگار" تھے۔ تابش صاحب کے لہجے کا ٹھیراؤ اور گفتگو میں لفظوں کا رچاؤ ان کے اپنے گھرانے کا ورثہ ہے جہاں شعر و ادب اور زبان و بیان کے چرچے عام تھے اور جہاں الفاظ کے غلط استعمال یا بھونڈی گفتگو سے دردِ سر کی شکایت غیر متوقع نہ تھی۔ عام تعلقات میں تابش صاحب کی وضع داری اور رکھ رکھاؤ کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ اگر زندگی کی یہ طرز عام ہو جائے تو ہمارا معاشرہ کیسا حسین بن جائے۔ ایسا نہیں ہے کہ تابش صاحب ان حالات سے نہ گزرتے ہوں جہاں ناآسودگیاں اپنے مہیب سائے اس طرح بکھیر دیتی ہیں کہ انسان کا دم گھٹنے لگے لیکن ان کو ان ناآسودگیوں سے گزرنے کا وہ سلیقہ ضرور آتا ہے جو دم گھٹنے کو انسان کا مقدر بننے سے بچائے۔ ان کا یہ سلیقہ شاید ناآسودگیوں کی تجدید (TRANSFORMATION) کے ہنر میں پوشیدہ ہے۔ تجدید کا وہ ہنر جس نے میرؔ کو تمام عمر ناکامیوں سے کام لینا سکھایا۔ ناکامیوں سے کام لینے کا یہ عمل انسان کو زندگی کی کلیت سے وابستہ رکھتا ہے اور جذبات میں ہزار انتشار اور شکست و ریخت کے باوجود اس کے لہجے کو رقت، خودرحمی اور ہزیمت سے بچائے رکھتا ہے۔ ہماری غزل کی بنیادی خصوصیت بھی مصائب کی طوفانی ہواؤں میں زندگی کے چراغ کو روشن رکھنا ہے۔ تابش صاحب نے بھی یہ چراغ روشن رکھنے کی کوشش کی ہے ؎

ترکِ تمنا پر دل تنہا کیا کیا غم آمادہ ہے   پھر بھی یہ ارمان ہے تابش کوئی ہمارا ہو جاتا

تابش صاحب بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں، غزل جس کے کچھ اپنے تقاضے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ انسان کے احساس کا اس کے حالات سے گہرا تعلق ہے اور حالات کوئی جامد چیز نہیں ہیں۔ یہ بدلتے ہی رہتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے عہد کے بدلے ہوئے حالات میں غزل ایک بے وقت کی راگنی ہے۔ یہ ایک سرسری اور سطحی قسم کا اعتراض ہے اور یہ اعتراض صرف ان لوگوں ہی کی طرف سے کیا جاتا ہے جو غزل کو صرف قافیہ اور ردیف وغیرہ کی پابندی تک محدود سمجھتے ہیں۔ حالانکہ غزل کا جوہر قافیہ اور ردیف کی پابندی کے ساتھ کسی خیال یا احساس کا اظہار ہوتا ہے۔ قافیہ و ردیف بدلی ہوئی حسیت (SENSIBILITY) کے اظہار پر کوئی پابندی نہیں لگاتے۔

اس طرح غزل کی ہیئت کے بارے میں بحث کرنے کے بجائے اگر اس کے حسنِ اظہار پر بات کی جائے تو مناسب ہوگا۔ اگر ہم غور سے دیکھیں تو غزل عہد بہ عہد اپنے طرزِ احساس میں بدلتی رہی ہے اور غالبؔ کے عہد تک پہنچتے پہنچتے بالکل ایک نئی حسیت سے ہم کنار ہو جاتی ہے۔ یہ حسیت پرانی قدروں، پرانی اخلاقیات اور پرانے انسانی رشتوں کو شک کی نگاہ سے دیکھنے کے ساتھ ساتھ نئے حالات کو قبول کرنے میں ایک جھجک سی محسوس کرتی ہے۔ شک اور جھجک کے تانے بانے سے بنی ہوئی طرزِ احساس نئی غزل کا جوہر ہے۔ چنانچہ اس معنی میں نئی غزل میرؔ، مصحفیؔ اور آتشؔ وغیرہ کے ان جذبات سے مختلف ہے جو ماورائے شک ہیں اور جنہیں کسی نئی صورتِ حال کو قبول کرنے کا سامنا ہی نہیں ہے۔ چنانچہ غزل اپنی ہیئت میں خواہ کتنی ہی مکمل ہو اپنے جوہر میں یہ کوئی جامد چیز نہیں۔ یہ ہر تبدیلی کو قبول کرتی ہے اور اس طرح اپنی روایت کو آگے بڑھاتی ہے۔ تابش صاحب بھی اپنی غزل میں جس حسیت کا اظہار کرتے ہیں وہ میرؔ، مصحفیؔ اور آتشؔ سے مختلف ہے۔ انہوں نے ان تمام اُستادوں سے فیض اٹھایا ہے لیکن خود کو ان میں گم نہیں ہونے دیا۔ یہ وہ رویہ ہے جس نے انہیں روایت اور جدت کی پیوندکاری کا ہنر سکھایا اور ہمارے خیال میں فنی تخلیق روایت اور جدت کی پیوندکاری اور امتزاج کے بغیر ممکن نہیں۔

زندگی کی طرح تہذیبی سفر بھی مسلسل ہے اور تہذیبی سفر کے اسی تسلسل کا نام روایت ہے۔ جوں جوں زندگی آگے بڑھتی ہے، اس کی

تہذیبی روایت بھی ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ کوئی جدت تسلسل روایت سے الگ رہ کر اور اس سے بالکل کٹ کر وجود میں نہیں آسکتی ہے۔ اس کے برعکس اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ روایت کو زندگی کے تغیرات سے بچائے رکھنے کی کوشش بھی تخلیقی سوتوں کو خشک کر دیتی ہے چنانچہ ان سوتوں کے بہاؤ کو برقرار رکھنے کے لئے تغیرات کی مطابقت میں جدت سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ تابش صاحب شاید اس گُر سے واقف ہیں۔ چنانچہ اپنی شاعری میں روایت سے آنکھیں بھی نہیں چراتے اور لکیر کے فقیر کی طرح جدید احساس و خیال پر واویلا بھی نہیں کرتے مثلاً ان کے یہ اشعار دیکھئے ؎

لب پہ دنیا کی شکایت بھی نہیں ۔ ہو گئے ہیں ہم بھی دنیا دار کیا

حدیں آفاق کی چھو لی ہیں میں نے بہت آپے سے باہر ہو گیا ہوں

دوسرے شعر میں جس معاشرتی مسئلے کو ابھارا گیا ہے وہ آج کل پوری دنیا کے لئے ایک روگ بنا ہوا ہے۔ تابش صاحب کو جب اس روگ کا احساس ہوتا ہے تو وہ اسے ایسے دھیمے طرز کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ ہر سننے والا غور و فکر ٹٹولنے لگتا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ سائنسی انکشافات کے ذریعہ انسان نے بہت بڑی حد تک فطرت پر غلبہ حاصل کر لیا ہے اور فطرت پر اس غلبہ کی وجہ سے اس نے تکنیکی طور پر بھی بہت ترقی کر لی ہے اپنی اس ترقی کے سہارے وہ چاند تک بھی پہنچ گیا ہے۔ لیکن یہ ساری باتیں خارج میں ہو رہی ہیں یعنی داخلی کیفیت اور باطنی رویوں میں خلا نظر آتا ہے۔ اپنی مادی ترقی پر اس قدر نازاں ہے کہ باطنی زندگی کا اُسے خیال ہی نہیں رہا۔ جس قدر تکنیکی ارتقا ہوا ہے اس کو انسان جس استحصالی انداز سے برت رہا ہے اس نے پوری انسانیت کی اکائی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔ تابش صاحب نے یہ بات جس خوبصورتی سے کہی ہے، وہ آپ کے سامنے ہے۔ انہوں نے اپنے شعر میں کوئی پند و نصائح کا دفتر نہیں کھولا۔ بالکل خاموشی سے ایک انسانی صورت حال کو ابھار دیا ہے اور بین السطور میں وہ دکھ سمو دیا ہے جو اس شعر کا محرک ہے۔

ہمارے عہد میں لوگ جس افراتفری کا شکار ہیں اس میں زندگی سے پیار ایک مشکل کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ زندگی کو بے معنی اور جبر محض سمجھتے ہیں۔ اس طرح کی سوچ زندگی کے لئے کس قدر تباہ کن ہے اس کا اندازہ مغربی معاشرے کی افراتفری سے بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ تابش صاحب اپنے صحت مند تصورِ زندگی کے سبب اپنا دامن اس افراتفری سے بچائے رکھتے ہیں۔

کربِ ہستی کو گوارا رکھا ہم نے ہر غم کو تمنا رکھا

ایک خوشبو کی ہمدمی کے لئے ہر نفس تیرے نام سے گزرے

ہو گئی ساری زندگی تعبیر اتنا دیکھا ہے ہم نے خواب ان کا

غم کو تمنا رکھنا انسان کو زندگی میں افراتفری سے محفوظ رکھتا ہے اور اس کے دل میں زندگی کی شمع روشن رکھتا ہے۔ تابش صاحب نے اس شمع کو ہر قیمت پر روشن رکھا ہے ؎

کیسے ممکن ہے بھلا یہ تابش ایک تو ہی اُسے تنہا چاہے

آپ نے دیکھا کہ وہ خود کو سمجھانے اور زندگی کی شمع روشن رکھنے کے لئے کس کرب کے مرحلے سے گزرے ہیں۔ کون ہے جو اس بات کو پسند کرے گا کہ اس کے محبوب کو اس کے سوا کوئی اور بھی چاہے لیکن تابش صاحب جب اس جانکاہ مسئلہ سے دوچار ہوئے تو انہوں نے ایک ایسا عقلی جواز نکالا جس نے ان کے دکھوں کی تمازت کو کم کر دیا اور ساتھ ہی ساتھ شعر کو غمِ جاناں کے محدود دائرے سے نکال کر زندگی میں دُور تک پھیلا دیا۔ اس شعر سے قطع نظر بھی ان کے یہاں دوسرے بہت سے اشعار ہیں جہاں ان کے صحت مند رویہ اور زندگی سے سچے تعلق کا اظہار ہوتا ہے۔ مثلاً ؎

غم زمانہ ہیں کیا کیا، غمِ بتاں کیا کیا کوئی کرے تو کسی سے کرے بیاں کیا کیا

قیام اپنا سر رہ گزر رہی تابشؔ   گزر گئے ہیں نگاہوں سے کارواں کیا کیا

ترک و طلب کی راہوں میں
ہم بھی منزل منزل گیا

کشاکشِ غمِ آزادی و اسیری میں   ہر آشیاں پہ کوئی عالمِ قفس گزرا

دلبری کے ہیں نرالے انداز
دل کے ہمراہ غمِ دل بھی گیا

لیکن جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا کہ ایسا نہیں ہے کہ تابشؔ صاحب دکھوں کے لمحات سے گزرتے ہی نہیں وہ بھی آخر اس دنیا میں رہتے ہیں اور ایک حساس و طباع آدمی کی طرح رہتے ہیں۔ تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ زندگی ان کے لئے پھولوں کا بچھونا بنی رہے۔ انہیں بھی قدم قدم پر خارزاروں سے گزرنا پڑتا ہے ؎

خالی خالی ہے تری راہ گزر   تابشؔ خاک بسر یاد آیا

کشاکشِ غمِ آزادی و اسیری میں
ہر آشیاں پہ کوئی عالمِ قفس گزرا

ڈوبنے والا ڈوب چکا   اب طوفاں کیا ساحل کیا

آپ نے دیکھا کہ تکلیف اور دکھ کے عالم میں بھی ان کا لہجہ سنبھلا رہتا ہے۔ زندگی کے اس طوفان میں سنبھلا رہنا ہی ان کی شخصیت اور شاعری کی نمایاں خصوصیت ہے۔ اس سنبھلے رہنے کی حالت میں وہ احساس کی آنچ کبھی نہیں کھوتے جس کی وجہ سے ان کی تخلیقی صلاحیتیں کہیں رُکنے کا نام نہیں لیتیں ؎

گرمی سے نفس پگھل رہا ہے
مجھ میں وہ الاؤ جل رہا ہے
قدموں کی دھمک ہے گردشِ جاں میں
ہر سانس میں کوئی جل رہا ہے

کبھی دیوار سے گزرے کبھی در سے گزرے   کتنے طوفان حوادث مرے گھر سے گزرے

ایک اشکِ سرِ مژگاں سے نظر کیا گزری   آئینہ خانے مرے دیدۂ تر سے گزرے

کس قدر مرحلۂ شوق و طلب تھا دشوار   جاں سے گزرے کہ تری راہگزر سے گزرے

ان اشعار میں احساس کی شدت کے باوجود کوئی گھٹن کی کیفیت نظر نہیں آتی۔ ایسے لوگ جو ذہن کی حریفانہ کیفیت کو ہی شدتِ احساس سمجھتے ہیں ان کے لئے یہ اشعار ممکن ہے کوئی کشش نہ رکھتے ہوں لیکن خواہشوں کے محلوں میں رہنے والوں کے بجائے زمین پر بسنے والے انسان ان اشعار میں خود کو بولتا ہوا محسوس کریں گے۔

لیجئے چند اور اشعار سنئے :-

ہر چند میسر کوئی راحت بھی نہیں ہے   لیکن ہمیں دنیا سے شکایت بھی نہیں ہے
ناپختگیٔ شوق نے رکھا نہ کہیں کا   بس ایک خلش ہے جو محبت بھی نہیں ہے

تہذیب کی منزل کے کڑے کوس ہیں تابش   رستے میں کوئی کوئے شرافت بھی نہیں ہے

جنوں سے روح نئی کب مرے بدن میں نہیں
وہ تار تار نفس ہے جو پیرہن میں نہیں

دوست دشمن میں بٹ گیا ہوں میں   کتنے رشتوں سے کٹ گیا ہوں میں
خود کو پہچان بھی نہیں سکتا   گرد میں اتنا اَٹ گیا ہوں میں

تو چراغوں کی محتسبا بھی ٹھہرے
کسی صورت یہ ہوا بھی ٹھہرے

اور ذرا دیکھئے کیسا عجیب اور ہولناک شعر کہا ہے ؎

اس طلسمات سے جلدی گزرو
تم نہ ہو گے جو ذرا بھی ٹھہرے

راحت جو ملی ہے تو قدم بھی نہیں اُٹھتے   دیوار ترا سایۂ دیوار ہوا ہے

اب آخر میں تابش صاحب کی ایک اور خصوصیت کی طرف توجہ جاتی ہے اور وہ خصوصیت ہے ان کی طبیعت کا مزہ۔ کہتے ہیں کہ شاعری کا مزہ داغ کے ساتھ رخصت ہوگیا۔ ایک بڑی حد تک یہ بات درست بھی ہو سکتی ہے۔ مگر اس کی وجہ داغ کی شخصیت نہیں۔ بلکہ انسانی رویّہ کی وہ تبدیلی ہے جو صنعتی عہد نے پیدا کی ہے۔ انسان کی بات میں مزہ صرف اسی صورت میں باقی رہ سکتا ہے جب وہ اپنا پیار زندگی اور معاشرہ سے برقرار رکھ سکے۔ لیکن جب وہ معاشرے سے کٹ کر اپنی ذات کے خول میں بند ہو جائے تو اس کے ہاتھ بجز ایک گھٹن اور اضمحلال کے کچھ نہیں آتا۔ تابش صاحب کو شاید اس گھٹن سے سخت بیزاری ہے۔ وہ کھلی فضا میں سانس لینا پسند کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ذات کے خول سے باہر نکل کر اور پورے معاشرے سے اپنا رشتہ برقرار رکھ کر جیتے ہیں۔ وہ زندگی کے ساتھ دکھوں کو بھی قبول کرتے ہیں اور سکھوں کو بھی۔

زندگی کو اس کے تمام تر دکھوں اور سکھوں کے ساتھ قبول کرنا انسانی عقل کا تقاضہ ہے مگر انیسویں صدی کے آخر میں کرکے گور (KIRKEY GOARD) اور دوستووسکی کی تحریروں سے عقل کے خلاف بغاوت کی ایک تحریک نے جنم لیا جس نے رفتہ رفتہ ایک عالمگیر رویّہ کی صورت اختیار کرلی۔ اس عالمگیر رویّہ کے پیش نظر بیسویں صدی کو نامعقولیت یا IRRATIONALITY کی صدی قرار دیا گیا نامعقولیت یا IRRATIONALITY کے دعویداروں کا کہنا ہے کہ اس کائنات میں عقل سے زیادہ IRRATIONALITY کا زور زورہ ہے۔ چنانچہ اس کائنات کی بڑی حقیقت عقل نہیں بلکہ نامعقولیت یعنی IRRATIONALITY ہے۔ کائنات سے قطع نظر یہ لوگ ذہن انسانی کے سلسلہ میں بھی اس بات کے قائل ہیں کہ انسانی ذہن کا بڑا حصہ لاشعور ہے نہ کہ شعور اور کیوں کہ لاشعور کو معقولیت سے کوئی سروکار نہیں، چنانچہ انسان کی بڑی حقیقت بھی نامعقولیت ہی قرار پاتی ہے۔ نامعقولیت کے یہ مدعی عقل سے بے تعلق ہو کر صرف اپنے جذبات و احساسات پر بھروسہ کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جذبات و احساسات عقل سے الگ ہو کر صرف انتشار و بحران ہی پیدا کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جذبات پر استوار جدیدیت کے ترجمان ادیب و شاعر ایک بے کیف انتشار سے دوچار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری مزہ سے خالی ہے۔ تابش صاحب اس طرح کی جدیدیت کے کبھی قائل نہیں رہے۔ چنانچہ ان کی شاعری میں ان کی اپنی تہذیب کا حسن شامل رہتا ہے جو "مزہ" اور "کیف" کا سبب بنتا ہے۔

ڈاکٹر محمودالرحمٰن

تابش دہلوی، شخصیت اور شاعری

"یہ ریڈیو پاکستان ہے۔ اب آپ مسعود تابش سے خبریں سنئے۔"

مخصوص و منفرد انداز کی یہ آواز میں صبح کے وقت عموماً سنا کرتا۔ یہ لہجہ، یہ آہنگ، یہ طرزِ بیان اور آواز کا یہ زیروبم اپنے اندر بڑی جاذبیت رکھتا۔ خبریں سننے کے دوران ایسا محسوس ہوتا جیسے ہر بات دل میں اتری جارہی ہو۔ یوں لگتا جیسے پڑھنے والا اپنی آواز کا جادو جگا رہا ہو۔

مسعود تابش کو، جو ۱۹۴۸ء سے اپنی آواز کا جادو جگا رہے ہیں، برصغیر پاک و ہند کا ہر شخص جانتا ہے۔ اس لئے کہ ہر ایک نے اُن کی زبان سے بڑی بڑی اہم خبریں سنی ہیں۔ عوام کو صبح ہی صبح سیاسی انقلابات، ہنگامی حالات اور بین الاقوامی واقعات سے یہ آشنا کراتے رہے ہیں۔

اور میں مسعود تابش کو اسی حیثیت سے جانتا تھا۔

یہ ۳۰۔ اگست ۱۹۵۱ء کی ایک شام تھی۔ میں کسی تقریب میں شرکت کے لئے سکھر سے کراچی آیا ہوا تھا۔ موقع ملتے ہی اپنے عزیز دوست مظہر خیری سے ملنے جیکب لائن پہنچا۔ وہاں بھی کسی تقریب کا اہتمام دکھائی دیا۔ مظہر بھائی نے بتایا کہ ان کے ہاں مشاعرہ منعقد ہو رہا ہے۔ میں اس میں ضرور شرکت کروں۔ مجھے اپنے بھائی قاضی عبدالودود کی طرح مشاعرے سے ذرا بھی دلچسپی نہیں۔ لیکن مظہر بھائی کے اصرار پر ٹھہر گیا۔ بعد مغرب شعرائے کرام تشریف لائے۔ اب مشاعرہ کا آغاز ہونے والا تھا۔ مظہر خیری اٹھے اور اسٹیج سکریٹری کے لئے تابش دہلوی کا نام پیش کیا۔ کسی نے اس کی تائید بھی کی۔ میں چپ چاپ ایک کونے میں بیٹھا ایک متین و سنجیدہ شخص کو دیکھ رہا تھا جو اپنی نشست سے اٹھا اور درمیان میں آکر بیٹھ گیا۔ معاً اس کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"حضرات! اب مشاعرے کی کارروائی شروع ہوتی ہے۔"

یہ آواز جانی پہچانی سی تھی۔ میں اسے برسوں برس سے سنتا چلا آرہا تھا ـــــ یہ آواز تو مسعود تابش کی تھی۔ مگر میرے سامنے تابش دہلوی اسٹیج سکریٹری کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ میں حیران تھا کہ آواز کی یہ یگانگت کیوں کر ہوسکتی ہے۔ آخر اپنے مرحوم دوست عرشی تیموری سے پوچھ ہی بیٹھا۔ انہوں نے متعجب ہو کر کہا۔

"ایں، تم نہیں جانتے ـــ یہ ایک ہی شخص کے دو روپ ہیں۔"

اور میں نے ۳۰۔ اگست کی اس شام کو مسعود تابش کو تابش دہلوی کے رُوپ میں پہلی مرتبہ دیکھا۔ اس مشاعرہ میں قمر جلالوی، کوکب شادانی، نظر حیدرآبادی، ادیب سہارنپوری، رفیق خاور، وحیدہ نسیم، ماہر القادری، محشر بدایونی، بشیر فاروقی وغیرہ شعراء موجود تھے۔ اور تابش دہلوی نہایت حسن و خوبی کے ساتھ اسٹیج سکریٹری کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ ایک توان کی آواز کی گھمبیرتا، اس پر مجلسی آداب و احترام سے ان کی بھرپور واقفیت! ـــــ یہ ایک حقیقت ہے کہ تابش دہلوی کو علم مجلسی کا بڑا اچھا سلیقہ ہے اور اس سلیقے سے ان کی شخصیت میں بڑا رچاؤ اور نکھار پیدا ہوگیا ہے۔ یہی رچاؤ اور نکھار ان کی بدولت بزم مشاعرہ میں بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔ ادریس صدیقی کے الفاظ میں:

"علم مجلسی کا جتنا بھرپور مظاہرہ کسی بڑے مشاعرے کے اسٹیج سکریٹری کو کرنا پڑتا ہے، اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔

ایک طرف خواتین و حضرات کے ہنگامے اور مطالبے ــــ دوسری طرف شعرائے کرام اور ان کی نازک مزاجیاں، بیک وقت دونوں کے سامنے سرخرو ہونا آسان بات نہیں۔ مجمع پر تو شاید پولیس بھی قابو پا سکتی ہے لیکن شاعروں کو قابو میں رکھنا سکریٹری کی ذمہ داری ہے۔ میں نے کئی بار دیکھا کہ تابش صاحب نے یہ ذمہ داری نہایت حسن وخوبی کے ساتھ پوری کی۔

تابش صاحب سے میں بہت زیادہ نہیں ملا ہوں۔ چند ہی ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ لیکن جب بھی ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا، انہیں اپنا شفیق پایا۔ نہایت پیار سے وہ خیریت دریافت کریں گے، آنے کا سبب معلوم کریں گے اور جب تک ساتھ رہے گا نہایت خندہ پیشانی سے پیش آتے رہیں گے۔ کبھی اُن کے رویے سے یہ مترشح نہیں ہو پایا کہ وہ اس وقت (کراچی کی اصطلاح میں) "BUSY" ہیں اور "LEFT" دینا نہیں چاہتے ــــ تابش صاحب تو سراپا خلوص ونیاز بن کر ملتے ہیں اس ضمن میں ایک اور واقعہ کا اظہار ضروری ہے۔

اس مضمون کے سلسلے میں میں ان سے گھر پر ملنا چاہ رہا تھا تاکہ ان کی نجی زندگی کے متعلق کچھ معلومات حاصل کروں۔ ایک دن شام کا وقت طے پا گیا۔ لیکن اس دن کچھ ایسی مجبوری درپیش ہوئی کہ میں اس دن حاضر نہیں ہو سکتا تھا۔ فون پر معذرت کرنی چاہی۔ تابش صاحب نے مجھے شرمندہ ہونے سے بچا لیا۔

"کل آجائیے گا۔ آج میں بھی کچھ مصروف ہوں۔"

دوسرے دن شام کو میں ان کے در دولت پر حاضر ہوا۔ ایک جانی پہچانی مسکراہٹ نے میرا استقبال کیا۔ ڈرائنگ رُوم میں لے جا کر بٹھا یا گیا۔ گفتگو کا سلسلہ چلتا رہا۔ سوالات کے جوابات ملتے گئے۔ معلومات حاصل ہوتی گئیں۔ درمیان میں چائے کا دَور بھی چلا۔ پان اور سگریٹ سے تواضع بھی ہوئی۔ گویا سارا ماحول میرے لئے خوش گوار بنا ہوا تھا۔ ذرّے ذرّے سے شادمانی عیاں تھی ــــ اچانک اس محلّے کے دو نوجوان اندر آئے اور تابش صاحب سے کسی کا حال سنانے لگے۔ ذکر "قتل" کا تھا۔ میرے کان کھڑے ہوئے۔ تابش صاحب سے استفسار کیا۔ معلوم ہوا کہ رات ان کے پڑوس میں چُھرا گھونپنے کی واردات ہوئی ہے۔ کوئی خاتون بُری طرح زخمی ہو گئیں۔ تابش صاحب کو واقعہ کا علم ہوا۔ فوراً جائے واردات پر پہنچے اور زخمی خاتون کو اسی وقت ہسپتال لے گئے۔ وہاں اُسے بروقت طبّی مدد دی گئی۔ تابش صاحب نے ہی نہیں، سارے محلے والوں نے رات آنکھوں میں کاٹی۔ ہر ایک خوف ودہشت سے سہما رہا۔ واقعہ بذات خود اس قدر درد انگیز تھا کہ تابش صاحب نے کچھ بھی نہیں کھایا اور مسلسل پریشان رہے ــــ میں اسی کرب والم کے عالم میں ان کے پاس پہنچا لیکن ان کے کسی انداز سے بھی اس واقعہ کا پتہ نہ چل سکا۔ وہ حسب معمول مجھ سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے رہے ــــ اب جو سوچتا ہوں تو ان کی اعلےٰ ظرفی، صبر، تحمل اور وضع داری کی داد دینی پڑتی ہے۔ وہ صحیح معنوں میں قرآن حکیم کی اس آیت وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا پر عمل پیرا ہیں۔

تابش صاحب دہلی کے ایک علم دوست خاندان کے چشم وچراغ ہیں۔ ان کی پیدائش ۹۔ نومبر ۱۹۱۱ء کو ہوئی۔ بچپن میں ایک ایسا واقعہ گزرا جس نے ان کے ذہن ودل پر بڑا اثر کیا۔ ان کے والد ان کی والدہ سے بے پناہ محبت رکھتے تھے۔ اس کے باوجود مذہبی اختلاف نے ان دونوں کو علیحدگی پر مجبور کر دیا۔ تابش صاحب کے لئے یہ بہت بڑا سانحہ تھا۔ وہ اپنی والدہ کے ساتھ رہنے لگے۔ اُن کے بے پناہ دکھ درد کو مسعود تابش نے بہت ہی کم سنی میں محسوس کیا۔ اور اس طرح اپنی ابتدائی زندگی میں ہی وہ غم انگیزی سے دوچار ہو گئے۔

تابش دہلوی نے اپنی اوائل عمری کے پندرہ سال سرزمین دکن میں بھی گزارے ہیں۔ ان کی والدہ کے ماموں مولوی عنایت اللہ دہلوی حیدرآباد میں ناظم دارالترجمہ تھے۔ وہ زمانہ اس ریاست کے عروج وارتقا کا تھا۔ وہاں بڑی بڑی شخصیتیں موجود تھیں۔ اس علمی و ادبی ماحول نے تابش صاحب کی شخصیت کو جلا دینے میں بڑا ہی اہم رول ادا کیا ہے۔ خود ان کے نانا مولوی عنایت اللہ اُردو کے بڑے اچھے ادیب اور نامور مترجم تھے۔ ان سے بھی تابش صاحب نے خاصا استفادہ کیا ہے۔ پھر انہوں نے ذاتی محنت اور مسلسل ریاض سے اپنے وقار کو بلند کرنے کی ہمیشہ کوشش کی ہے۔ انہوں نے گریجویشن کر لینے پر ہی اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ مسلسل مطالعہ اور لگاتار غور وفکر سے اپنی

معلومات کو خاصا وسیع کر لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ادب کے کسی بھی موضوع پر بے تکان بول سکتے ہیں۔

تابش صاحب ریڈیو کے نیوز سیکشن سے ہی وابستہ نہیں رہے ہیں۔ ترجمے کے شعبے اور اسکول براڈ کاسٹنگ سے بھی ان کا لگاؤ رہا ہے۔ اگر اول الذکر شعبے کی اہمیت آواز کے زیر و بم پر مبنی ہے تو آخر الذکر دونوں شعبوں میں ادب کی جملہ خصوصیات کی کارفرمائی ہے۔ ان میں الفاظ و انداز بیان کی صحت اور شعر و ادب کی تاریخ و تنقید کا بڑا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ تابش دہلوی ہر شعبے کے فرائض سے بخوبی عہدہ برآ ہوتے رہے ہیں۔

تابش دہلوی کی نجی زندگی بڑی ہی پرسکون ہے۔ ان کے گھر کا ماحول ان کی اپنی ذات کی طرح بے حد صاف ستھرا اور نکھرا ہوا ہے وہ نفاست جو اُن کی رگ رگ میں رچی بسی ہے، ذرہ تابش سے بھی بخوبی ہویدا ہے۔ میں نے بہت کم شاعروں کو اتنی صاف ستھری اور نفیس زندگی گزارتے دیکھا ہے۔ پہلی نظر میں تو گمان ہی نہیں ہوتا کہ تابش دہلوی ایک شاعر ہیں۔ اس لئے کہ اُن کی شیروانی سے لے کر جوتے تک ہر چیز پر باقاعدگی کی چھاپ پڑی رہتی ہے۔ بے ترتیبی کا کہیں گزر بھی نہیں ہوتا۔ زندگی گزارنے کا یہ سلیقہ ان کے چھوٹے سے ڈرائنگ رُوم کے ذرّے ذرّے سے بھی نمایاں ہے۔

تابش صاحب نے دو شادیاں کیں۔ پہلی بیوی عرب سرائے والے سیّدوں کے خاندان سے تھیں۔ ان سے ایک لڑکی ہوئی۔ پانچ سال بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد انہوں نے دوسری شادی کی۔ یہ خاتون دلّی کے نواب طالع یار خاں کی پوتی ہیں۔ یہ وہی طالع یار خاں ہیں جن کا ذکر مرزا غالب نے اپنے خطوط میں کیا ہے۔ تابش صاحب کی یہ اہلیہ غالب کی رشتہ میں بھانجی بھی ہوتی ہیں۔ بلکہ غالب ان کے نانا کے مکان میں رہتے تھے اور ان کا بھی نام مرزا نوشہ تھا۔ ان خاتون سے چار اولادیں ہوئیں۔ تین لڑکیاں اور ایک لڑکا۔ تابش صاحب اپنے اہل و عیال کے ساتھ ناظم آباد کے خوبصورت مکان میں بڑی پرسکون زندگی گزار رہے ہیں۔

ادب اور آرٹ کی تعمیر میں محبت کی رنگ آمیزی بھی شامل ہے تو مجھے یہ کہہ لینے دیجئے کہ تابش دہلوی کی شاعری بھی محبت کی اعلیٰ صداقت پر استوار ہے۔ بچپن کے ایک چھوٹے سے رومانس نے انہیں ابتدائی زندگی ہی میں بے حد مغموم و افسردہ بنا ڈالا۔ اور محبت کی اس درد انگیزی نے اوائل عمری میں ان پر گہرا اثر قائم کیا۔ اسی رومانس نے طالب علمی کے زمانے میں جب کہ ان کی عمر مشکل سے بارہ تیرہ سال کی تھی شعر کہنے کی تحریک پیدا کی۔ محبت کی یہی صداقتیں ہر منزل میں ان کی رہنما ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے کسی استاد کے آگے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا۔ بلکہ کسی صلاح و مشورے کے بغیر اپنے جذبات درد دل اور غم دل کی عکاسی زندگی کے ہر موڑ پر نہایت حسن و خوبی کے ساتھ کرتے رہے۔

دنیائے خرابی میں تنہا ہے ترا تابش — کثرت ہے غم دل کی اے جلوۂ یکتائی
تم کس کی محبت میں گرفتار ہو تابش — یہ شہر نگاراں ہے کوئی نام تو لیجئے
دل و جگر نہ ہوئے چاک آج بھی تابش — نجات دیکھئے کب ہو غم نہاں سے مجھے

اور درج ذیل شعر میں اپنے عشق و محبت کے انجام کے بارے میں خود ہی دریافت کرتے ہیں ؎

تم محبت کے ثنا خواں تو بہت ہو تابش — یہ بتاؤ کہ محبت تمہیں راس آئی بھی

لیکن ایک واضح حقیقت ہے کہ آج تک کسی کو بھی محبت راس نہیں آئی بلکہ اس کی تلخی و ناکامی حیات مستعار کو سراپا مغموم و مضمحل بنا ڈالتی ہے۔ اور جناب تابش بھی اسی حقیقت کی ایک زندہ تصویر ہیں۔

ہر لمحہ ایک موت ہے ماتم ہے ہر نفس — اس زندگی کی ہم پہ ہے تہمت لگی ہوئی

اک کشاکش بھی ہے رنجِ نامرادی کے سوا ‍ ‍ ‍ ‍ ہائے کیا کہئے دلِ مایوس کس مشکل میں ہے
ایک فسانہ ہو تو سنائیں ایک مصیبت ہو تو کہیں ‍ ‍ ‍ ‍ حالِ قفس، روداد نشیمن، قصۂ گل کیا کیا کہئے
آنکھوں میں آنسو، لب پر آہیں، دل کچھ ویراں ویراں سا ‍ ‍ ‍ ‍ ہے یہ تمنا کا آغاز، انجام تمنا کیا کہئے

درج بالا اشعار کے مطالعہ سے یہ خیال قائم کر لینا کہ تابش صرف حُسن و محبت کے شاعر ہیں، غلط ہے۔ ان کی غزلوں میں جہاں غم محبت کا اظہار ہے، وہاں غم روزگار کا ذکر بھی ہے۔

ان کی شاعری پر خارجی عوامل پوری طرح اثر انداز ہوئے ہیں۔ انہوں نے اپنے معاشرے اور اس کے بدلتے ہوئے ادوار کا بغور جائزہ لیا ہے اور ہر تاثر کو اپنے شعر میں سمونے کی کوشش کی ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار سے اس حقیقت کی وضاحت ہو سکتی ہے:

صحن چمن ہے گوشۂ زنداں حلقۂ زنجیر ایک ایک گل ‍ ‍ ‍ ‍ کس نے اسیری کی صورت میں دیکھا خواب آزادی کا
باغ میں جوشِ بہار آخر یہاں تک آگیا ‍ ‍ ‍ ‍ بڑھتے بڑھتے شعلۂ گل آشیاں تک آگیا
اس کے آگے اب امیرِ کارواں کا کام ہے ‍ ‍ ‍ ‍ گرتا پڑتا میں سوادِ کارواں تک آگیا
سوادِ باغ میں اک گل کی تازگی کے لئے ‍ ‍ ‍ ‍ ہزار عہدِ بہاراں خزاں ہوئے ہوں گے
پھر انتشار کسی اتحاد کا ہے سراغ ‍ ‍ ‍ ‍ کر اِدھر و کبھی کارواں ہوئے ہوں گے
خدا کرے اہلِ باغ کو بھی ہمارے ہمراہ راس آئے ‍ ‍ ‍ ‍ نئی نئی عشرتِ رہائی، نیا نیا ذوقِ آشیانہ

تابش دہلوی کے اس خیال کا اظہار ضروری ہے کہ غم جاناں اور غم دوراں دونوں کی آماجگاہ "دل" ہے۔ یہی وہ مرکز ہے جہاں ہر تاثر ڈھلتا ہے، جہاں ہر فکر جنم لیتی ہے، جہاں ہر خیال نمو پذیر ہوتا ہے ــــ دل کی ہر دھڑکن میں غم جاناں اور غم دوراں دونوں کی آواز سنائی دیتی ہے ــــ اور یہی آواز غزل کی جان ہے۔ یہ تصور قائم کر لینا کہ یہ صنف صرف حسن و محبت کا ہی مظہر ہے سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ بقول تابش دہلوی "غزل کے CANVAS کی یہ وسعت کہ اس میں حیاتِ انسانی کے تمام پہلو سما جاتے اور سمو جاتے ہیں دوسری اصنافِ سخن کے لئے باعثِ رشک ہے۔" اور یہ صنفِ غزل دل سے تعلق رکھتی ہے۔

تابش صاحب کے خیال کے مطابق "جب تک انسان کے پاس دل ہے، غزل زندہ رہے گی۔" غزل کی بقا و سالمیت کا اعلان اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے۔

غزل تابش دہلوی کی عزیز ترین شے ہے۔ وہ اس صنفِ سخن کی مخالفت بالکل برداشت نہیں کر سکتے۔ اس پر جب بھی آنچ آئے گی وہ سینہ سپر ہو کر اس کی حفاظت کو اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اب تک وہ نہ جانے کتنی غزلیں لکھ چکے ہیں جو زبان و بیان، لب و لہجہ اور رنگ و آہنگ کے لحاظ سے منفرد و یگانہ ہیں۔ سنہ ۱۹۶۳ء میں اُن کی غزلوں کا مجموعہ "نیمروز" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ایک اور مجموعہ ترتیب پا چکا ہے۔ بایں ہمہ وہ نظم نگاری سے بھی غافل نہیں رہے ہیں۔ مختلف موضوعات پر بے شمار نظمیں لکھ چکے ہیں جو پاک و ہند کے معیاری رسائل میں چھپ چکی ہیں۔ تابش صاحب نے اپنی نظموں کا ایک مجموعہ بھی مرتب کر لیا ہے۔

میں اپنے اس مضمون کو جناب ادریس صدیقی کے چند جملوں کی مدد سے اختتام تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ یہ جملے تابش دہلوی کے مجموعۂ کلام "نیمروز" میں "جائزہ" کے عنوان کے تحت شامل ہیں۔ ادریس صاحب نے ان جملوں میں جو کچھ کہا ہے وہ میرے دل کی بھی آواز ہے۔

"تابش دہلوی سے میں پہلی بار ملا تو ان کی شرافت سے متاثر ہوا۔ دوسری ملاقات میں ان کی ذہانت کا قائل ہونا پڑا اور تیسری ملاقات میں ان کی وضعداری کا اعتراف کرنا پڑا۔"

محمد عثمان رمز

عرفانِ ذات کا شاعر

غزل ایک مکمل صنفِ شاعری ہے۔ اس کا فرما غیر متبدل ہے۔ نہ یہ تبدیل ہوا ہے نہ آئندہ ہوگا۔ غزلوں کے لئے بحور متعین ہیں تکمیل کے قواعد کے طور پہ زحافات کے سمجھ میں نہ آنے والے اُصول بھی موجود ہیں۔ اصل چیز فرما نہیں ہے بلکہ وہ "خام مال" ہے جو اس فرمے میں ڈالا جاتا ہے۔ اس خام مال کا ایک سرا شاعر کی ذات سے وابستہ ہوتا ہے تو دوسرا کائنات سے، ایک غم سے تو دوسرا خوشی سے، ایک فنا سے تو دوسرا بقا سے، ایک روشنی سے تو دوسرا ظلمت سے، ایک مسافر سے تو دوسرا منزل سے، ایک قید سے تو دوسرا رہائی سے ایک بہار سے تو دوسرا خزاں سے ایک گناہ سے تو دوسرا رحمت سے، ایک جلوے سے تو دوسرا حیرت سے۔ انہیں گناتے چلے جائیے پھر بھی یہ گنتی ختم نہیں ہوگی۔ یہ تو چیدہ چیدہ نمونے ہیں۔ ان کی جہتیں (DiMentionS) بھی تو ہیں ایک ایک موضوع کو ایک ایک ہزار جہتوں سے ضرب دیدیں پھر اندازہ لگائیں کہ مضامین کا سلسلہ کہاں تک پہنچتا ہے۔ مضمون نگاری کی یہی جہتیں غزل گو شاعر کو انفرادیت عطا کرتی ہیں۔ ان جہتوں کے ساتھ ساتھ شعور اور وجدان کی ہم آہنگی، طہارتِ فکر، ذخیرۂ الفاظ کا انتخاب، اسلوبِ بیان اور زبان پر دسترس جیسے لوازمات انفرادیت کو دوام عطا کرتے ہیں۔ جن شاعروں نے ان مقتضیات کو پورا کیا ہے وہ زندہ ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

تابش دہلوی انہیں زندہ شاعروں میں سے ایک ہیں۔ وہ زندہ ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ اس دعویٰ کی دلیل خود تابش سے سنیئے:۔

کچھ راز اپنے دل کا کھلتا نہیں سخن میں
کچھ حرفِ مدعا بھی اک زخم ہے دہن میں

چونکہ سخن میں رازِ دل کھل نہیں رہا ہے اس لیئے اسے وہ کھولنے میں مصروف ہیں۔ ان کی یہ مصروفیت جہدِ مسلسل کی نشانی ہے اور جہاں جہدِ مسلسل ہو وہاں ارتقائی عمل کا ہونا اگزیر ہو جاتا ہے اور یہی ارتقائی عمل شاعری کی جان ہے۔ دوسرے مصرعے میں "کچھ حرف مدعا" اور "زخم دہن" کے استعمال نے شعر میں معنویت کے اسرار سے نئی جان ڈال دی ہے۔ یہ "زخم دہن" تابش کی شاعری میں وقت کے ساتھ ساتھ جتنا گہرا ہوتا گیا اس کی شاعری میں اتنی ہی گہرائی اور گیرائی پیدا ہوتی چلی گئی ہے۔

میں تابش کی شاعری کی چار بنیادی خصوصیات کا تذکرہ کروں گا۔ ان میں پہلی خصوصیت کو ہم چاہیں تو ذات کے عرفان کا نام دے سکتے ہیں یا چاہیں تو اسے نفس کی معرفت کہہ لیں اور چاہیں تو انا کی پہچان سے موسوم کریں تابش "ذات" کے بارے میں کس انداز سے سوچتے ہیں۔ ان کی سوچ کا زاویہ دیکھئے کہتے ہیں ؎

نفی ہے ذات کی آگاہیٔ ذات
ہم بھی ہیں اپنی خبر ہونے تک

پہلا مصرعہ چونکا دینے والا ہے عہد جدید کے فلسفی دیکارت نے کہا تھا کہ "میں سوچتا ہوں اس لئے میں ہوں" "CAJITO ERGO SUM" لیکن تابش نے اپنی سوچ کو ایسی مہر لگائی کہ انہوں نے "آگاہیٔ ذات" کو "ذات" کی نفی قرار دے دیا۔ آدمی اگر اپنی "ذات" کا مکمل اور بھرپور عرفان حاصل کرے تو پھر اس کے بعد اس کے پاس بچے گا کیا جس کے لیئے وہ زندگی گزارے۔ تابش کا ایک اور شعر ملاحظہ فرمائیں۔

چھوٹی پڑتی ہے انا کی چادر
پاؤں ڈھکتا ہوں تو سر کھلتا ہے

اس شعر میں تابش نے "انا" کو EGO کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ یہ "ذات" کا بدل بھی ہے۔ اس شعر میں جہاں سہل ممتنع اور محاورے کے برمحل استعمال نے چار چاند لگا دیئے ہیں وہاں اس کی خوبی وہ حقیقت نگاری ہے۔ جس نے تابش کی زندگی کے معاشی اور معاشرتی گوشوں کی بے باک ترجمانی کی ہے۔ یہ شعر اپنے اندر ایک فلسفیانہ طمطراق رکھتا ہے اس کے باوجود عام فہم ہے۔ ایک اور شعر ؎

لوگ تابش مفت میں بن جائیں خدا
عاجزی میں کیوں سر اپنا خم کریں

اس شعر میں تابش نے اپنے تخلص تابش کو بڑی ہنرمندی سے اپنی ذات انا کا مترادف بنا کر پیش کر دیا ہے۔ اس شعر کے تیور بڑے تیکھے ہیں۔ تابش عاجزی کے قائل ہیں لیکن اس عاجزی کے قائل نہیں جو لوگوں کو مفت میں خدا بنا دے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے دل میں بقدر پیمانۂ تخیل ہر وقت خودی کا سرور موجزن رہتا ہے۔

اس عنوان کے تحت ایک اور شعر ؎

عشرتِ تسکیں بھی تابش غیر سے حاصل نہ کر
اپنے اشکوں کے لیئے اپنا ہی داماں کیوں نہ ہو؟!

"عشرتِ تسکیں"، "غیر سے حاصل نہ کر"، "اپنے اشکوں" اور "اپنا ہی داماں" کے ٹکڑے بڑے سلیقے اور قرینے سے سجائے گئے ہیں اس میں "اپنا ہی داماں کیوں نہ ہو" کا ٹکڑا اپنی ذات کے ارتکاز کا آئینہ دار ہے لیکن اس ٹکڑے سے اپنے خول میں سمٹ کر رہ جانے کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔ اس میں انا اور ذات کی غیرت اور حمیت جیسی صفات عالیہ کی شہادت ملتی ہے جانچنے کی غرض سے مضمون کا ایک اور شعر ؎

مرا طریق نیاز مندی الگ ہے سارے جہاں سے تابش
وہاں ہے ذوقِ سجود مجھ کو جہاں جبیں ہے نہ آستانہ

تابش نے اس شعر میں اپنی ذات اور اپنے نفس و انا کو ایک نئی جہت دی ہے۔ وہ جبیں اور آستانے کو نیاز مندی کا وسیلہ تو مانتے ہیں لیکن ضامنیتُ العبادات نہیں۔ وہ عبودیت اور بندگی میں استغراق کے قائل تو ہیں لیکن اس میں کھو جانا پسند نہیں کرتے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ پینینتھی ازم (PANENTHEISM) اور پینتھی ازم (PANTHEISM) کے قائل نہیں ہیں۔ وہ من و تو کی تفریق کو مٹانا پسند نہیں کرتے اس لیے کہ اس سے "ذات" کی نفی ہوتی ہے۔ البتہ وہ وسیلوں کو رکاوٹ سمجھتے ہیں۔

مندرجہ ذیل خوبصورت اشعار موضوع کو بہتر انداز میں سمجھنے کے لیئے مفید ہوں گے۔ تابش کہتے ہیں ؎

اس طرح سنتا ہوں میں ایک ایک کی روداد غم
جس طرح کوئی سنائے میرا افسانہ مجھے

شکستہ پا سہی آزاد رو ہیں ہم پھر بھی
غبار بن کے پس کارواں نہیں گزرے

ہم بقدر ہمت تابش نہیں
ہو گئی دنیا بھی کم آزار کیا

غم میں خوش ہوں تو وہ سمجھتے ہیں
غم مجھے ناگوار ہی نہ رہا

تسکینِ غم سہی وہ تو ہیں دامن کشاں ہنوز
لاؤ اب اشک پوچھ لیں خود آستیں سے ہم

ہے بہت حوصلۂ عبرتِ ہستی تابش
کثرتِ غم میں دعا ہے کہ مری عمر دراز

ان اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ تابش "غم" "بقدر" "ہمت" چاہتے ہیں وہ یہ نہیں چاہتے کہ "دنیا کم آزار" ہو جائے تابش غم میں بھی خوشی محسوس کرتے ہیں لیکن یہ خوشی مخصوص قسم کی خوشی ہے اس سے مملکت میں یہ نتیجہ نکال لینا کہ تابش کو 'غم' ناگوار ہی نہیں صحیح نہیں ہے۔ انہیں غم تو ناگوار ہے مگر عام آدمی سے وہ اس لحاظ سے جدا اور منفرد ہیں کہ وہ غم کا ماتم نہیں کرتے۔ تابش کے کردار کی یہ پختگی انہیں بھیڑ سے جدا کرتی ہے تابش کے ان اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی شخصیت کی روح اگر ان کی "انا" ہے تو اُس انا کا پیرہن انتار نگار رنگ ہے جس میں خود اعتمادی عزیمت، ہمت، حوصلہ اور صبر و استقلال ستاروں کی طرح جگمگا رہے ہیں

تابش کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ "دل" کو انہوں نے اپنی شاعری میں مرکزی مضمون بنادیا ہے اس سلسلہ میں پہلے چند خوبصورت اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

درد پا کر ہم سے بن دل نہیں ہونے پاتے
ہم ترے عشق کے قابل نہیں ہونے پاتے

دیکھا ہجومِ حسن تو ذوقِ جمال کو
ہم نے کہیں نگاہ کہیں دل بنا دیا

دل کے ہوتے شورشِ دنیا و دیں کا کیا ملال
جب سلامت ہے سفینہ کوئی طوفاں کیوں نہ ہو

ضبط میں بھی تو سکوں مشکل نظر آیا مجھے
غم کے ہر پہلو میں اپنا دل نظر آیا مجھے

یہ فراق و وصل و شوق و آرزو کچھ بھی سہی
اک غمِ دل ہی مگر افسانہ در افسانہ ہے

جب تمنائے غمِ حیات نہ تھی
دل میں دل کی سی کوئی بات نہ تھی

زندگی کے اس اندھیرے میں اجالا چاہیے
مرہم دیکھا دل ہی چراغِ خانہ ہے

اس آخری شعر کی پہلی جہت "زندگی کا اندھیرا" ہے دوسری جہت "اجالے کی خواہش" تیسری جہت "مرہم" اور چوتھی جہت "دل ہی چراغِ خانہ" ہے ان جہتوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ تابش کتنے بڑے حقیقت نگار ہیں وہ زندگی کے اندھیروں کو تسلیم کرتے ہیں۔ مگر زندگی گزارنے کے

لیے اجالوں کی امنگ اور آرزو بھی رکھتے ہیں۔ وہ صرصرِ غم کے قائل نہیں لیکن اُسے بڑے شائستہ لہجے میں متنبہ بھی کر رہے ہیں کہ اے صرصرِ غم دیکھنا اک دل ہی چراغ جار ہے۔ اسے بجھا نہ دینا۔ اس لحاظ سے تابش، میر اور فانی دونوں سے الگ نہیں۔ تابش کے اشعار میں جتنیں زیادہ ہوتی ہیں۔ اسی لیے ان میں معنویت بھی زیادہ ہوتی ہے۔ دل کے موضوع پر نقل کردہ دوسرے اشعار کو دیکھیں تو آپ بھی محسوس کریں گے کہ تابش دل کے ذریعہ "ہمہ تن دل" بننا چاہتے ہیں اور اس خواہش کے پیچھے مقصد یہ ہے کہ وہ عشق کے قابل بن جائیں۔ لیکن اس راستے کی رکاوٹ درد ہے۔ اس طرح تابش دل اور دردِ دل کی کشمکش خود پیدا کرتے ہیں لیکن اس طرح کہ دعویٰ اور جوابِ دعویٰ دونوں پر ان کی گرفت مضبوط ہوتی ہے اُن کے کردار کی یہ خوبی اُن کی شاعری کو صرف رس عطا کرتی ہے بلکہ کشمکش بھی۔ تابش نے اپنے ایک شعر میں "ہجومِ حسن" "ذوقِ جمال" "نگاہ" اور دل کا تذکرہ کیا ہے اس شعر میں "نگاہ" کو ایک طرح سے دل کا تابع بنا دیا ہے۔ وہ دل ہی ہے جو حسن اور ہجومِ حسن کی رپورٹنگ کرتا ہے۔ محوّلہ اشعار میں سے ایک شعر کے اندر تابش نے "شورشِ دنیا و دیں" کا ذکر کیا ہے لیکن وہ اس شورشِ دنیا و دیں کو زندگی کے کھیل کا ایک حصہ سمجھتے ہیں۔ وہ اس پر کسی ملال کا اظہار نہیں کرتے۔ بلکہ وہ اپنے دل کے سبب سے کی سلامتی پر اطمینان اور خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ زیرِ تذکرہ چند اشعار سے اس حقیقت کا اندازہ لگا لینا کچھ مشکل نہیں کہ تابش کی شاعری ایک صاحبِ دل کی شاعری ہے۔ اس لحاظ سے وہ ناسخ سے بالکل الگ نظر آتے ہیں اور ان لوگوں سے بھی جدا نظر آتے ہیں جو دماغ کے بل پر شعر کہہ لیتے ہیں۔ تابش الفاظ کی مدد سے صرف شعر کا پیکر ہی نہیں بناتے بلکہ ہر پیکرِ شعر میں اپنا دل بھی رکھ دیتے ہیں

تابش کے کلام کی تیسری خصوصیت ان کی حوصلہ مندی ہے۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں کثرتِ طلب (MAXIMISATION OF WANTS) کا روگ موجود ہو، جہاں بدبودار مادیت کا غلبہ ہو، جہاں ہر طرف سے ھَل من مزید کی صدائیں بلند ہو رہی ہوں، جس کا ہر فرد کوہِ ندا سے آنے والی صدا کے پیچھے بگٹٹ بھاگ رہا ہو، جس معاشرے میں توکل، صبر، رضا اور تسلیم جیسی اعلیٰ قدریں کچلا گئی ہوں وہاں ظاہر ہے طلب، خواہشات، امنگ اور جا و بیجا ضروریات کا دباؤ ہر لحظہ بڑھ ہی رہا ہوگا۔ اُن کے پورا نہ ہونے کی صورت میں مایوسی اور بد دلی کا پیدا ہونا ایک فطری عمل ہوگا، غم کے پہاڑ کا ٹوٹنا کوئی عجوبہ نہ ہوگا۔ اعصاب پر دباؤ کا بڑھ جانا اور دل کی طرف سے خون کے آنسو رونا زندگی کا لاحقہ ہوگا، ایسے میں حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے ہر فرد کو ہمت اور حوصلے کی ضرورت ہوگی، تابش کی شاعری میں ہمت اور حوصلے کے محرکات انہیں فطری راستوں سے داخلِ وجود ہوئے ہیں وہ ان شعراء میں نہیں جو بادشاہِ وقت کے وظیفہ خوار بھی رہے ہیں اور غم کے مقابلے کے لیے ہمت اور حوصلے کا اظہار بھی کر رہے ہوں۔ اب اس گفتگو کے حوالے سے تابش کا یہ شعر دیکھیں پھر خود فیصلہ کریں کہ میں نے کیا کہا ہے یا مجھے کیا کہنا چاہیئے تھا۔

سر اُٹھانے کی بھی مہلت نہ ملے
رہ نہ جائے کوئی اُفتاد اب کے

میں سمجھتا ہوں کہ یہ شعر کہہ کے تابش خود بھی بہت مطمئن ہوئے ہوں گے۔ یہ شعر نہ صرف ان کی حوصلہ مندی کا بھرپور مظہر ہے بلکہ یہ SELF DISCOVERY کی ایک خوبصورت مثال ہے۔

اب حوصلہ مندی، ہمت اور جرأت کے حوالے سے کچھ مزید اچھے اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

بجلیاں گرتی رہیں گی آسماں سے تا کجے
پھر گلستاں میں بنائے آشیاں رکھتا ہوں میں

ہم کہ گر گر کے سنبھل سکتے ہیں
ابھی کچھ اور بھی جھیل سکتے ہیں

کمزور سہی مگر سفینہ
ہر موجِ بلا سے جُٹ گیا ہے
طوفاں کا مسئلہ بھی ہے شرط
گو ہاتھ سے ہاتھ چھُٹ گیا ہے

یہ چند اشعار جن کو حوالے کے طور پر میں نے پیش کیا ہے تابش کے کلام میں پائی جانے والی خصوصیت یعنی جہتوں کی تخلیق کی آئینہ دار ہیں۔ ایک ایک شعر میں کئی کئی جہتیں ہیں کسی سے تعمیر کا جذبہ آشکار ہوتا ہے تو کہیں حالات سے مقابلے کے لئے بھرپور عزم کا اظہار موجود ہے اور کہیں تابش نے سلیقہ اور ہنرمندی کے ساتھ انفرادی جدوجہد کو اجتماعی رنگ دے دیا ہے حوصلے کے حوالے سے ان کا خوبصورت ترین شعر یہ ہے ۔

ہے بہت حوصلہ، عمرت ہستی تابش
کثرتِ غم میں دُعا ہے کہ تری عمر دراز

یہ قانونِ قدرت ہے کہ جہاں حوصلہ، ہمت، خطرپسندی اور رجائیت ہو وہاں قنوطیت، دل شکستگی، پست ہمتی اور سہل پسندی بھی پائی جاتی ہے۔ تابش انسان ہیں اور انسان ہونے کے ناطے اُن کی شاعری میں زیرِ تذکرہ دوسری قسم کی جہتیں (DIMENSIONS) بھی موجود ہیں مگر دو خوبیوں کے ساتھ ۔ پہلی بات تو یہ کہ وہ کم کم ہیں اور دوسری بات یہ کہ وہ جس حد تک ہیں توازن کے ساتھ ہیں تابش مایوسی اور ناامیدی کی حالت میں اتنے نڈھال نہیں ہوئے کہ بے سہارا ہو کر ہی کو بیٹھیں وہ سہارے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں مگر اس کی نوعیت خارجی نہیں بلکہ وہ ایسے موقع پر اپنے "دردِ عاشق" کو پکارتے ہیں۔ انہی کی زبان میں شعر سنیں

اے دردِ عاشقی تری غیرت کو کیا ہوا
جیتے ہیں زندگی کو سہارا سمجھ کے ہم

رہی توازن والی بات تو ملاحظہ فرمایئے۔ کہتے ہیں

قوتِ بازو سلامت سو قفس سو آشیاں
حوصلے پھر بھی کہاں تک کیجئے پرواز کے

عرن و ملال، غم و اندوہ میں تابش کا اصلی رنگ ملاحظہ فرمائیں،

تابش مجھے قبول ہے محرومیٔ حیات
محرومیٔ حیات کا شکوہ کیے بغیر

تابش کی شاعری کی چوتھی خصوصیت طہارتِ فکر ہے۔ میں اس عنوان کے تحت ایک دوسرے ہی زاویے سے اپنی فکر کا حاصل پیش کر رہا ہوں۔ اُردو شاعری میں "کثرتِ جلوہ" اور "وحدتِ جلوہ" کا تذکرہ جا بجا ملتا ہے۔ ولی دکنی سے لے کر میر درد تک اور درد سے لے کر اصغر گونڈوی تک بہت کچھ کہا گیا ہے۔ یہ بڑا قابلِ لحاظ سرمایہ ہے لیکن اس سرمائے میں کتنا حصہ مرفوع ہے اور کتنا مجہول، میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ میں تو صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تابش نے جو کچھ کہا ہے وہ انداز اور جہت کے اعتبار سے مثبت ہے اور بدعقیدگی سے پاک اس میں طہارت اور پاکیزگی ہے جس میں ہیں ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

شعورِ جلوہ ہے دشوار چشمِ تر کے لئے
ہزار آنکھ سے روتا ہوں اک نظر کے لئے

نور سے تابستہ جس کے ہو اک دائمی رودِ طلوع
ایسی سحر کے ہم متمنی ایسی اِک اِک شام سے ہیں

تیری تجلّی عالم عالم
میرا تصوّر کچھ تصویریں

کثرتِ جلوہ میں ہے جلوۂ یکتائی بھی
وہ جو رعنائی بھی ہے پیکرِ رعنائی بھی

یہ بھی ترے جلووں کا اثر ہے محوِ خودی اِک میں ہی نہیں
بزم جہاں کا ذرّہ ذرّہ آئینہ در آغوش ہوا

میں تماشا در تماشا چاہتا ہوں دیکھنا
تو تجلّی در تجلّی دید کے قابل سہی

اُردو شاعری میں کعبہ، کلیسا، بُت خانہ، کفر اور ایمان جیسے ذخیرۂ الفاظ کو ٹری بے تکلّف بلکہ بعض صورتوں میں بے احتیاطی کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے۔ اسی طرح شراب، ساقی، مے خانہ اور پیمانہ جیسے الفاظ بھی کثرت سے استعمال کیے گئے ہیں۔ ویسے تو اُردو شاعری اس قسم کی لفظیات سے بھری پڑی ہے لیکن میر تقی میر، غالب، مومن، فانی، جگر مرادآبادی وہ شعراء ہیں جنھوں نے ان کا خوب خوب استعمال کیا ہے۔ ریاض نے تو شراب کا ایک قطرہ حلق میں اُتارے بغیر لینے مداحوں اور نقادوں سے شہنشاہ خمریات کا خطاب بھی حاصل کر لیا۔ اسی طرح عشق، حسن، جلس، تیر نظر، کان کا ٹیڑھا بالا اور عطار کے لونڈے سے دوا لینے کا پیرایۂ بیاں جب تک میر، جرأت اور داغ سے منسوب نہ کیا جائے بات پوری نہیں ہوتی۔ لیکن تابش اور ان کے ہمعصر شعراء نے اس پٹے ہوئے راستے سے شعوری طور پر اجتناب کیا ہے۔ تابش نے کہیں کہیں ان الفاظ کو استعمال کیا ہے لیکن ایسے مواقع پر ان کا شعور ان کے وجدان پر غالب ہوتا ہے۔ ان کی طہارتِ نفس ان کی دستگیری کرتی ہے اور اس طرح ان کا "عشق" ثمرِ ہوس و تحریص سے پاک ہوتا ہے۔ ان کا تصورِ حسن ان کے حسنِ بیاں کا تابع ہوتا ہے، ان کی شراب کی قسم ہی جداگانہ ہوتی ہے ان کا بت خانہ وہ نہیں ہوتا جس سے لادینیت اور بدعقیدگی کی حوصلہ افزائی ہوتی ہو۔ میں یہ بات بلاخوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ تابش کی شاعری کا دامن رجس سے پاک ہے۔ تابش کی طہارتِ فکر اور ان کے عقیدے کی پختگی ان کے نعتیہ کلام میں تو اپنے عروج پر ہے۔ مگر وہ الگ موضوع ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں۔

آخر میں یہ کہوں گا کہ تابش کے کلام میں شعور اور وجدان کی ہم آہنگی بہت نمایاں ہے۔ وہ مضمون میں صرف ندرت ہی کے قائل نہیں، ہیں بلکہ وہ نئی جہتوں کی تلاش پر پوری قدرت بھی رکھتے ہیں۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے وہ "عشرت تسکیں" "لطفِ عتاب" "عشرتِ غم" "عزت رسوائی" "عشرتِ درد" "تسبیل درد" "عزمِ غم" اور "شکستِ یقین" جیسی تراکیب استعمال کرتے ہیں۔ جس میں مہارت کے ساتھ ساتھ بھرپور اعتماد بھی موجود ہے۔ تابش کی شاعری کا لہجہ بہت دھیما ہے۔ لہجے کا یہ دھیما پن سخن شناس کے دل میں اُترتا جاتا ہے۔ لہجے کے دھیمے پن نے تابش کی شاعری میں ایک خصوصی صفت پیدا کر دی ہے۔ یہ ہے ان کے کلام میں گفتگو کا انداز اور گفتگو بھی سہل ممتنع میں۔

میں نے محدود مطالعہ کے بعد تابش کی شاعری میں جس چیز کی کمی محسوس کی ہے وہ اس لفظیات کی کمی ہے جو پچھلے ۲۵-۳۰ سال میں مختلف مراحل سے گزر کر اب معروف مقام حاصل کر چکی ہے۔ میری مراد اس جدید لفظیات سے ہے جس سے معاشرے کے سیاسی، سماجی اور معاشی گوشے اجاگر ہوتے ہیں۔ یہ لفظیات عام آدمی کی اس بے چینی اور کرب کی ترجمانی کرتی ہے جس میں سیاسی عدم استحکام، توڑ پھوڑ، محاذ آرائی، فسادات، اخلاقی انحطاط، روحانی پراگندگی وغیرہ جیسے محرکات بھرپور انداز میں کارفرما ہیں۔ دیوار، سیلاب، پانی، برسات، کچا مکان، مکان، دھوپ

کشتی، کامدکی ماؤ، آمد حی چراغ، فصیل، شگاف وغیرہ جیسے الفاظ نئی جہتوں اور نئی معنویت کے ساتھ اُردو شاعری میں استعمال ہوتے ہیں۔ میں تابش سے یہی کہہ سکتا ہوں کہ حسرت موہانی "چکی" کی مشقت کو اگر غزل میں نظم کر سکتے ہیں اور جگر مرادآبادی تعمیر نو کے لیے چمن کو برائے چمن اُجاڑ سکتے ہیں تو وہ اپنے کلام میں مضمون اور جہت آفرینی کی خداداد صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں اُردو غزل کو حالات کے حوالوں سے الفاظ کے استعمال کا نیا سلیقہ ضرور دے کر جائیں۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ موجودہ نسل کے شاعر نئے استعاروں کو تو خوب استعمال کرتے ہیں لیکن اُن کے اسلوب اور لہجے میں چیخ پکار اور واویلا زیادہ نمایاں ہے اس لیے کہ وہ دلیل کے ساتھ بات کرنے کی بجائے غصے اور جھنجلاہٹ سے مغلوب ہو کر بات کرتے ہیں اور اس طرح بے حد جذباتی ہو جاتے ہیں۔ میں تابش کی خدمت میں انہی کا شعر پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں، وہ کہتے ہیں

میرا شعر دور ہے تابش
بچئے اس طرزِ عام سے پہلے

تابش اپنی شاعری کو طرزِ عام سے بچانے میں کامیاب رہے ہیں اُن کی طہارتِ فکر اور ان کے کلام میں پائی جانے والی فنی خوبیاں اس کی گواہ ہیں لیکن میں جو بات کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ خواص کے ساتھ ساتھ ان کا روئے سخن عوام کی طرف بھی ہو۔

انہیں چاہیئے کہ وطنِ عزیز کا۔ معاشرہ کا بالخصوص نئی نسل کا ترجمان آثاریں۔ اب وہ نئے حالات کو سامنے رکھ کر نئی معنویت اور نیا اسلوبِ سخن دیں۔ جو حالات کی بھرپور ترجمانی کرتا ہو۔ اُردو کی پرستار نئی نسل کو وہ چاہے کسی بھی خطے کی ہو اس بات کا حق پہنچتا ہے کہ وہ تابش سے اپنا حق طلب کرے اور میں یہ جانتا ہوں کہ تابش کی شخصیت کا ایک اہم وصف یہ ہے کہ "بندہ" اور "بندہ نواز" دونوں کے حق کی ادائیگی کا جاندار احساس رکھتے ہیں۔

میں اپنے مطالعے کی تائید میں میر کا یہ شعر نقل کر کے مضمون ختم کرتا ہوں

شعر میرے ہیں سب خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

وہ جو کسی دانشور اور ماہر نفسیات نے کہا ہے کہ نام اور تخلص کی معنویت کا اثر شاعر اور ادیب کی تخلیقات بھی قبول کرتی ہیں۔ ــــــ تو جناب تابش دہلوی کی شاعری جگمگاتی ہوئی شاعری ہے۔

"تابش شاعر بھی ہیں اور شاعر گر بھی ہیں، بہت سے نوجوان شاعروں نے اُن سے استفادہ کیا ہے جو کوئی تابش کا کلام سرسری طور پر سنے گا وہ شاعر کے فیضِ ہنر و کمال سے محروم رہے گا" تابش کی شاعری تعمق و تفکر کا مطالبہ کرتی ہے، خیال اور اظہارِ خیال میں ان کا اسلوب منفرد ہے، مشاعروں میں واہ واہ اور داد و تحسین حاصل کرنے کے لئے وہ چلتے ہوئے شعر نہیں کہتے۔ اُن کے کلام میں فکر و معنیٰ کی گہرائی پائی جاتی ہے "جلوہ و نظر" کی تکرار اُن کی شاعری میں ہر جگہ ایک نیا روپ رکھتی ہے ! اُن کے کتنے شعر ایک مسئلہ اور کلیہ کی حیثیت رکھتے ہیں جن سے پہلے دماغ اور پھر دل متاثر ہوتا ہے۔

"تابش کی شاعری میں چھیڑ چھاڑ، لمس و تقبیل اور سطحی اشارے کنائے نہیں ہیں : رمزیت اور اشاریت بیشک ہے مگر وہ سنجیدہ ہے، یہی باوقار سنجیدگی اُن کے کلام کی امتیازی خصوصیت ہے، جہاں تک زبان کا تعلق ہے ایک دہلوی شاعر کے کلام میں زبان کا رچاؤ پایا جانا ہی چاہیئے۔

"تابش دہلوی نشست و برخاست، گفتگو، لباس اور رہن سہن میں ایک خاص سج دھج رکھتے ہیں، اُن کی شاعری میں بھی یہی رکھ رکھاؤ ملتا ہے۔ تابش کا یہ شعر :

ساقی تو ہی روکے گا اس گردشِ دوراں کو
آخر ترے ہاتھوں سے پیمانہ گزرتا ہے

اردو زبان کے عظیم شعروں میں شمار ہونا چاہیئے۔

مولانا ماہر القادری

افضل صدّیقی

تابش دہلوی اپنے کلام کے آئینے میں

"تابش دہلوی ہمارے ان شاعروں میں ہیں جنہوں نے اپنی انفرادیت کو طرزِ فکر اور طرزِ ادا کے ذریعے اردو ادب پر ثبت کر دیا ہے۔ روایت اور بغاوت دونوں سے بالاتر جا کر دونوں کو اپنے مزاج کے موافق ملا کر تابش صاحب نے انفرادیت کا وہ درجہ حاصل کر لیا ہے کہ ان کی شاعری سب سے الگ اور اچھوتی اور منفرد شاعرانہ صفات کی حامل نظر آتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تابش صاحب کی غزلیں جس کمال کے ساتھ ان کی انفرادیت کی آئینہ دار ہیں وہ اس دَور کے بہت کم شاعروں کے حصے میں آیا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ ایسی صحبتوں میں اب تک رہے ہیں جن کو ہماری تہذیب کا بہترین نمونہ کہنا چاہیئے۔ اور ان کی شاعری تہذیب یافتہ ادب کی بہترین مثال ہے۔ صحت، متانت، توازن، نفاست اس کی وہ صفات ہیں جو سب سے پہلے ہمیں متاثر کرتی ہیں۔ تابش صاحب مشاعروں کے شاعر نہیں ہیں کیوں کہ ان کی شاعری ایک دم سے بھڑکا دینے والی نہیں ہے۔ وہ پہلے ہمیں دعوتِ فکر و نظر دیتا ہے اور پھر اپنے حُسن کا وہ عالم دکھاتی ہے جسے فکر ایسے لطیف لباس میں ملبوس نظر آتی ہے جس کے رنگ کی ہم آہنگی عام نظر کے بس کی بات نہیں۔" (ڈاکٹر محمد احسن فاروقی مرحوم)

"جناب تابش متین اور سنجیدہ شاعری کرتے ہیں۔ ان کے یہاں دل و دماغ بولتے ہیں۔ وہ صرف خوبصورت الفاظ کے تاروں پر نہیں بجتے اور نہ ٹکسال کے انبار لگاتے ہیں۔ بلکہ ان کے یہاں اس مقام کی شاعری ہوتی ہے جسے خوش ذوق شرفاء سُن کر حظ اٹھاتے اور کم ذوق لوگ سوچنے لگتے ہیں۔ میں نے تابش سے ہمیشہ معیاری اشعار سنے اور خلوت و جلوت میں انہیں شرافت کے معیار سے گرتا نہیں دیکھا۔ ایسے لوگ راہ داں نہیں راہ گر ہوتے ہیں۔ اور ایسے ہی لوگوں کے نقشِ قدم پر چل کر آنے والی نسلوں میں ادب کا ذوق منتقل ہوتا ہے۔" (احسان دانش مرحوم)

"حضرت تابش دہلوی پختہ فکر، پختہ کلام شاعر ہیں۔ جذبات اور فکر کی زبان پر بھی ان کو عبور حاصل ہے۔ اسی لئے ان کے کلام میں تخلیقی اور فنی عناصر کا نہایت خوش گوار امتزاج ہے۔ ان کے کلام میں ضبط اور وقار کے ساتھ دل گداختگی پائی جاتی ہے۔ عشق ان کے ہاں حاضر و ناظر ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں "غیب اور شہود" دونوں ایک دوسرے کی تصدیق اور تفسیر کرتے نظر آتے ہیں۔ حضرت تابش کی آواز اس دَورِ شور آفریں میں ثقہ، سنجیدہ اور فکر خیز ہے۔ ان کے کلام کا ہر لفظ اُن کے مزاج کو سمجھتا ہے اور ہر مصرع ان کی مخصوص شعری موسیقی کو جذب کئے ہوتے ہیں۔ اسی کا نام انفرادیت ہے، اسی کا نام فنی تکمیل اور اسی کا نام اپنی بات اپنی زبان میں کہنا ہے۔ ان کا کلام ریاضتِ نفس اور ریاضتِ فن کا اصلی نمونہ ہے۔" (پروفیسر مجتبیٰ حسین)

"ایک اور چیز تابش کی شاعری کو دوسرے غزل گو شعراء سے ممتاز کرتی ہے اور یہ ہے دہلویت کا پاس۔ تاریخ میں دہلویت نام ہے سلاطین

اُمراء کے تزک و احتشام کا۔ اور ہند ایرانی تہذیب و ثقافت کی مرکزیت کا۔ لیکن شاعری میں دہلویت کہتے ہیں خیال کی پاکیزگی کو، جذبہ کی صداقت کو، بیان کی صفائی کو، اسلوب کی دلکشی کو، روحانی اقدار کے پاس کو، داخلیت کے انعکاس کو، لفظ و معنی کے باہمی ارتباط کو، دردمندی اور انسان دوستی کو۔ یہ ساری چیزیں تاباںؔ کی شاعری میں شعوری یا غیر شعوری طور پر بڑی خوبصورتی سے در آئی ہیں۔ اور اسی کی بدولت ان کی شاعری میں معنی خیزی، اور دلنشینی کی وہ سنجیدہ فضا پیدا ہوئی جس سے ان کے بہت سے ساتھی محروم ہیں۔" (ڈاکٹر فرمان فتح پوری)

"حضرت تاباںؔ دہلوی نے ایک غزل گو کی حیثیت سے اس زمانے میں نام پیدا کیا جب فانیؔ، فراقؔ، یگانہؔ، اصغرؔ، جگرؔ اور حسرتؔ کے سے اساتذۂ فن کی غزلوں سے سارا برصغیر گونج رہا تھا۔ دنیائے شعر و ادب کی اتنی قد آور شخصیات کی موجودگی میں انہی کی محبوب صنفِ سخن میں ناموری حاصل کرنا مشکل کام تھا۔ مگر تاباںؔ دہلوی کی غزل نے یہ کام کر دکھایا۔ اس کا سبب ان کی غزل کی بعض انفرادی خصوصیات ہیں۔ فانیؔ کے بارے میں مشہور ہے وہ غالبؔ سے متاثر تھے اور تاباںؔ کے بارے میں مشہور ہے وہ فانیؔ سے متاثر تھے۔ تاباںؔ نے فانیؔ سے غمِ زندگی کا گداز اور غالبؔ سے اسرارِ کائنات پر فکر و تامل کا حوصلہ حاصل کیا۔ اور اپنی غزل میں درد کی تہذیب اور غم کی شائستگی کے ساتھ ساتھ حیات اور ناخدائے حیات کے مسائل سے فن کی سطح پر نمٹنے کی خوبصورت اور مؤثر مثالیں پیش کیں۔ زبان کے تیور ان سب پر مستزاد تھے۔" (احمد ندیم قاسمی)

"جو لوگ شاعری کا صحیح ذوق رکھتے ہیں انہیں معلوم ہے کہ موجودہ دور کی جذبات پرستی اور خیال پرستی دونوں سے الگ تاباںؔ صاحب کی شاعری میں ایک عنصر موجود ہے جس کی اچھی شاعری کو ہمیشہ ضرورت رہے گی۔ یعنی سوچنے کی قوت جو زبان و بیان پر قدرت کے ساتھ صحیح ذوق کو متاثر کرتی ہے۔ تاباںؔ صاحب کی شاعری میں ایک ایسا ارتکاز اور صحت پائی جاتی ہے جو اس زمانے میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔" (سلیم احمد مرحوم)

حضرت تاباںؔ دہلوی کے کلام کے بارے میں یہ رائے ہے مستند بزرگانِ ادب اور شعر کی صحیح پرکھ رکھنے والے نقادانِ فن کی۔ اور اعتراف و اعلان ہے میرے عجز و بے بضاعتی کا۔ کیوں کہ ان تبصروں میں کوئی اضافہ ممکن نہیں۔ تاباںؔ صاحب کی شاعری کے بارے میں اگر کوئی اور کچھ کہے گا تو لفظوں کے الٹ پھیر کے ساتھ ہی کچھ کہے گا۔ اب یہی دیکھ لیجئے کہ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی مرحوم نے تاباںؔ صاحب کے کلام کے بارے میں جس رائے کا اظہار کیا ہے، اوروں کی رائے بھی قریب قریب وہی ہے۔ البتہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے الگ اور نئی بات کہی ہے اور وہ ہے "دہلویت کا پاس" جس نے تاباںؔ صاحب کو بہت سے غزل گو شعرائے سے ممتاز کر دیا ہے اور "دہلویت" کی جو تعریف انہوں نے کی ہے تاباںؔ صاحب کا کلام اس پر پورا اُترتا ہے۔ یعنی بلاشبہ ان کی شاعری میں خیال کی پاکیزگی، جذبہ کی صداقت، بیان کی صفائی، اسلوب کی دلکشی، روحانی اقدار کا لحاظ، داخلیت کا انعکاس، لفظ و معنی کا ارتباطِ باہمی، دردمندی، انسان دوستی جیسی خصوصیات عجیب حُسن کے ساتھ در آئی ہیں۔ انہی کی بدولت تاباںؔ صاحب کی شاعری میں منفرد فضا نظر آتی ہے۔ یہ خوبیاں شاعری ہی میں نہیں تاباںؔ صاحب کی شخصیت اور زندگی میں بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ شاعری بالخصوص غزل کی شائستگی اگر شاعر کی مکمل آئینہ داری کرتی ہے تو تاباںؔ دہلوی اس کی زندہ و تابندہ مثال نظر آتے ہیں۔

سراپا دیدۂ تر ہو گیا ہوں　　میں قطرے سے سمندر ہو گیا ہوں
حدیں آفاق کی چھوڑی ہیں میں نے　　بہت آگے سے باہر ہو گیا ہوں

ٹوٹ کر عہدِ تمنا کی طرح　　معتبر ہم رہے فردا کی طرح
جا ملیں گے کبھی گلزاروں سے　　پھیلتے پھیلتے صحرا کی طرح

زمیں آسماں ایک کر دینے والو　　زمیں ایک ہے آسماں اور بھی ہیں

لب پہ دنیا کی شکایت بھی نہیں — ہوگئے ہیں ہم بھی دنیا دار کیا

دوستوں کی دوستی سے ہوشیار — تیغ ہے وہ ہاتھ جو گردن میں ہے

بے قراری ہی سے آیا اب قرار آیا مجھے — آخر کار ایک طوفاں پار اُتار آیا مجھے

یہ شاعری تابش صاحب کی پہچان ہے، روایت سے پیوست جدید اسلوبِ اظہار کی شاعری۔ نہ صرف آج کے عہد کی بلکہ غالب کی طرح آنے والے زمانوں میں بھی زندہ رہنے والی شاعری۔ ایک زمانے میں ایسے اشعار پر مشاعرے اُلٹ جاتے تھے۔

کیا چیز تھی کیا چیز تھی ظالم کی نظر بھی — اُف کرکے وہیں بیٹھ گیا دردِ جگر بھی

دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنا دے — ورنہ کہیں تقدیر تماشا نہ بنا دے

ذرا سوچیے کیا یہ شعر ذوقِ سلیم کو اپیل کرتے ہیں، فکر کو مہمیز دیتے ہیں، انفرادی یا اجتماعی غم کی تہذیب کرتے ہیں؟ آج اگر غالب کسی عام بڑے مشاعرے میں اپنے اشعار سنائیں تو کیا تحسین و آفرین کے ڈونگرے برس سکتے ہیں؟

یک الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز — چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنا

واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب — ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

یہ شعر مشاعروں میں سننے سنانے کے لئے نہیں ہوتے، صرف پڑھنے کے لئے ہوتے ہیں۔ پڑھئے، غور کیجئے تو محسوس ہوتا ہے کہ فکر و ذہن کے دریچے کھل رہے ہیں۔ دل کے بند دروازے وا ہوتے چلے جا رہے ہیں اور سینہ کشادہ ہوتا جاتا ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ کہے ہوئے لفظ کی اہمیت نہیں ہوتی، برتے ہوئے لفظ کی ہوتی ہے جو ضبطِ تحریر میں آتا ہے تو اپنا اعتبار بھی قائم کرتا ہے شعر تو بہت بڑی چیز ہوئی۔ شعر مشاعرہ میں سنایا جائے تو وقتی طور پر واہ واہ ہو سکتی ہے۔ کسی شعر پر محفل کی چھتیں اڑ سکتی ہیں مگر جب یہی اشعار کتابی شکل میں ہمارے سامنے آتے ہیں تو وہ کوئی دیرپا تاثر قائم نہیں کرتے بلکہ شاعر کے شعری قد و قامت کی قلعی کھول دیتے ہیں۔ آج کل شعراء کی کتابوں کی تقریبات رونمائی عام ہوگئی ہیں۔ جن میں صاحبِ کتاب کی شاعری اور شخصیت کی توصیف میں زمین آسمان ایک کر دیئے جاتے ہیں۔ مگر کتاب پڑھیے تو ان بیان کردہ خوبیوں کا عکس بھی اس میں نہیں ملتا۔ چند صفحات پڑھنے کے بعد محسوس ہوگا کہ چند الفاظ و تراکیب اور گنتی کی تشبیہات و استعارات کی جگالی کی جا رہی ہے۔ بعض قادر الکلام شعراء ہی اس سے مستثنیٰ ہیں۔ یہ نتیجہ ہے کاتا اور لے دوڑی کا۔ تابش صاحب کی شاعری کو اعتبار پانچ دس برسوں میں حاصل نہیں ہوا بلکہ اس میں برسوں کی ذہنی اور فکری تربیت و تہذیب اور ریاضتِ نفس و فن شامل ہے۔ وہ ۱۹۱۱ء میں دلی میں پیدا ہوئے ۱۹۲۳ء میں یعنی گیارہ بارہ سال کی عمر میں شعر گوئی کا آغاز کیا۔ مگر عرصہ دراز تک اپنے مجموعۂ کلام کی اشاعت سے گریزاں رہے۔ ویسے نوجوانی ہی میں وہ مشاعروں میں بھی پڑھنے لگے تھے۔ اور اعلیٰ معیاری ادبی مجلوں میں بھی ان کا کلام شائع ہونے لگا تھا۔ پاکستان آنے کے بھی بہت بعد یعنی ۱۹۶۳ء میں تابش صاحب کا پہلا شعری مجموعہ "نیم روز" ۵۲ سال کی عمر میں منظرِ عام پر آیا جو اب دستیاب بھی نہیں۔ اس کے ۱۹ سال کے بعد ۱۹۸۲ء میں دوسرے مجموعۂ کلام "چراغِ صحرا" کی اشاعت کی نوبت آئی جس میں حمد و نعت اور ایک سو گیارہ غزلیں شامل ہیں

تیسرے مجموعۂ کلام میں جو "غبارِ انجم" کے نام سے ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا، نظمیں ہی نظمیں ہیں۔ چوتھی کتاب "تقدیس" زیرِ ترتیب ہے جو نعتوں سلام اور مرثیے پر مشتمل ہوگی۔ یہ دونوں کتابیں ہر جگہ دستیاب ہیں۔ ان کی جلد اشاعت اس لئے غالباً ممکن ہوسکی کہ تابش صاحب ریڈیو پاکستان کی ملازمت سے ریٹائر ہو چکے تھے۔ اور اپنی کتابیں مرتب کرنے کے لئے انہیں مہلت اور عافیت مل گئی تھی۔ ان میں سے کسی کتاب میں بھی کسی نوعیت کی تکرار نہیں ملتی۔ بس اسلوبِ اظہار نیا اور یکساں ملتا ہے جس سے تابش صاحب کی شناخت ہوتی ہے اور اس اسلوب میں بھی عجب طرفگی ہے۔ بنیادی طور پر تابش غزل ہی کے شاعر ہیں۔ غزل آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ زیادہ شاعروں نے غزل ہی کو وسیلۂ اظہار بنایا ہے لیکن اپنے عہد کے مکمل رچاؤ کے ساتھ سچی اور فکر انگیز غزل کہنے والے کم ہی ملیں گے۔ بقول تابش :-

"میں خود بھی قدیم و جدید کے سنگم پر کھڑا ہوں۔ اس لئے میری غزلوں میں آپ کو دونوں دھارے بہتے نظر آئیں گے۔ میرے نزدیک جدت کا نام محض کوئی نہیں ہے بلکہ اسلوب کے نئے پن کو میں جدت سمجھتا ہوں۔ کوئی خیال نیا نہیں ہے۔ صرف اسلوبِ اظہار خیال کو نیا پن دیتا ہے اور غزل کی شاعری میں اسلوبِ اظہار کا نیا پن بڑی مشکل سے پیدا اور حاصل ہوتا ہے۔" (چراغِ صحرا)

بلاشبہ تابش کی شاعری اسلوبِ اظہار کی جدت ہی کی بنا پر کھری غزل کی شاعری ہے۔ اس طرزِ فکر کا سلسلہ بلاشبہ غالب اور فانی سے ملتا ہے۔ لیکن دردمندی اور ذاتی کرب کی کائناتی کرب سے ہم آہنگی کا قرینہ میر تقی میر کے سلسلے سے آیا ہے۔ تابش خود بھی اعتراف کرتے ہیں ؎

شعر میرے کیوں نہ پہلو دار ہوں تابش کہ میں ہم وطن ہوں میرزا کا معتقد ہوں میر کا

تابش کی غزل میں غالب، میر اور فانی کا پرتو ضرور ملتا ہے لیکن انہوں نے خود کو مکمل طور سے مغلوب نہیں ہونے دیا ہے بلکہ اکثر مقامات پر اسلوبِ اظہار کے تنوع اور فکر کی پہلو داری کی بدولت لہجہ بھی طرح دار ہو گیا ہے جو تابش کا اپنا اور منفرد لہجہ ہے اور کہیں بھی عصرِ حاضر کے تقاضوں سے پہلو تہی نہیں ملتی۔

ابھی ہیں قرب کے کچھ اور مرحلے باقی — کہ تجھ کو پا کے ہمیں پھر تری تمنا ہے
اہلِ چمن فریب نہ آزادیوں کا کھائیں — تنہا قفس میں مجھ کو گرفتار دیکھ کر
نہ جانے کون کسے کس مقام پر لوٹے — کہ ایک دوسرے کا اعتبار راہ میں ہے
جس دن سے ترے سایۂ دیوار سے اٹھے — اس دن سے نہ سورج تری دیوار سے اٹھا
موسم بدلے پھر بھی ہے آشوبِ وصال و ہجر وہی — عشق پر ایسا وقت پڑے تو کیا ماضی کیا حال کریں
زخم کھائے ہیں بہت عمر بسر ہونے تک — سینکڑوں شمعیں جلائی ہیں سحر ہونے تک
ربط کیا جسم و جاں سے اٹھتا ہے — پردہ اک درمیاں سے اٹھتا ہے

دیکھئے آتش، میر اور غالب کی زمینوں میں کیا الگ سے شعر نکالے ہیں۔

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا کہ تابش صاحب کی شاعری کو سرمایۂ افتخار اور دولتِ اعتبار یوں ہی بیٹھے بٹھائے نہیں مل گئی بلکہ اُن کے ذوقِ شعری کی تربیت و تہذیب میں اس علمی اور ادبی فضا کا بہت بڑا دخل ہے جس میں بچپن ہی سے سانس لیتے رہے۔ گھرانا بھی نامور جیّد عالموں اور فاضلوں کا تھا۔ ددھیال مولوی نظام الدین نظامی کی تھی جو فارسی کے بلند پایہ شاعر تھے۔ اور ننہیال شمس العلماء مفتی ذکاء اللہ کی تھی جو تابش صاحب کے پرنانا تھے۔ ان کے بیٹے اور تابش صاحب کے نانا مولوی عنایت اللہ کے زیرِ سایہ تربیت و تعلیم سے ان کی شخصیت بننی شروع ہوئی جو

دار الترجمہ کے ناظم تھے۔ ۱۹۲۵ء میں مولوی عنایت اللہ صاحب ہی نے تابش صاحب کو پڑھنے کے لئے حیدر آباد بلا کر وہاں کے مشہور اسکول دار العلوم میں داخل کرا دیا تھا۔ یہ وہ اسکول ہے جس میں مہاراجہ کرشن پرشاد جیسے شاعر اور ادیب نواز نے تعلیم پائی۔ اس اسکول میں تابش صاحب نے آٹھویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ اور پھر دلی آکر یہاں کے ہندو ہائی اسکول سے میٹرک پاس کیا۔ تلاش معاش پر مجبور ہوئے تو گردش روزگار انہیں پھر حیدر آباد دکن لے گئی۔ یا شاید وہ عشق کھینچ لایا۔ پہلے پہل جب وہ آٹھویں میں زیر تعلیم تھے تو یہ شعلہ بھڑکا تھا جس نے انہیں پوری طرح گرفت میں لے لیا تھا۔ اس عشق نے انہیں نیم مجنوں بنا دیا۔ آس پاس کا دھیان ہی مٹ گیا۔ بس روتے تھے اور روئے ہی چلے جاتے تھے۔ اس اولین عشق کا اثر آج تک ان کی رگ و پے میں جاری ہے۔ بہرحال سرزمین دکن پر ان کی شاعری نے بلندیاں دیکھیں۔ فانی، ہوش بلگرامی، نظم طباطبائی، مولوی عنایت اللہ، ہادی رُسوا، آزاد انصاری، یاس، یگانہ، علامہ حیرت بدایونی جیسی برگزیدہ اور بلند قامت شخصیتوں کو دیکھا سُنا اور ان کی صحبتیں اٹھائیں۔ ۱۹۳۲ء میں حضرت فانی سے کلام میں اصلاح لینے کا آغاز کیا کہ وہ ان سے متاثر بھی بہت تھے۔ فانی کو غم عزیز تھے۔ اور تابش صاحب کو فانی اور اپنے درد بھی۔

حیدر آباد کا یہ ابتدائی تہذیبی دَور تھا جب انہیں اپنی ذات کا عرفان طا شخصیت کی پہچان ملی۔ اس نکھار میں فانی کا بھی حصہ ہے۔ اسی جگہ انہوں نے ملازمت کر لی تھی مگر یہ زیادہ دیر تک نہ چل سکی۔ بیمار پڑے تو ایسے کہ کوئے یار چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ پھر دلی بلا لئے گئے۔

دلی آکر تہذیبی ارتقا کا دوسرا دور شروع ہوا۔ حیدر آباد کی زندگی کا حال اُن سے سُنا ہے۔ ان کا یہ دور میرے بچپن میں وہاں گزرا تھا۔ دلی میں جب میٹرک کرنے کے بعد میں نے ملازمت اختیار کی تو شعر کہنے لگا تھا۔ اُردو بازار جامع مسجد کے علاقے میں میں نے نواب سائل دہلوی، نواب محمد شفیع، بیخود دہلوی، نہال سیوہاروی، مولانا احمد سعید، مفتی کفایت اللہ، مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا مسیح اللہ، صلاح الدین قریشی، شاہد احمد دہلوی، ظفر قریشی، فضل حق قریشی کو دیکھا۔ نواب شفیع کی حویلی میں ہفتہ واری نشستیں ہوتی تھیں جن میں اکثر مجھے شرکت کا موقع ملا۔ وہیں اساتذہ کو سُنا تابش صاحب سے میری ملاقات اُردو بازار میں ومی اشرف کی کتابوں کی دکان پر ہوئی۔ اسی جگہ یاران سر پل نے شاہد احمد دہلوی کا ساقی جاری کرایا۔ تابش صاحب پیش پیش تھے۔ اس زمانے میں جب پاکستان کی تحریک شروع ہو چکی تھی ہم چند طالب علموں نے اردو مجلس بنا رکھی تھی جس میں ہوش تیموری، ساحر عباسی مرحوم، اصغر علی، ظفر احسن آصف شامل تھے۔ پھر رئیس امروہوی بھی آملے تھے۔ ہم سب کو ذوقِ شاعری ایسی محفلوں میں بھی لے گیا جن میں تابش صاحب کے علاوہ سید محمد جعفری، شعیب حزیں، زبیر رودولوی، ایوب دہلوی، صادق الخیری، وامق جونپوری، پروفیسر وزیر الحسن، مشتاق احمد زاہدی، اختر حسین رائے پوری، ماہر دہلوی، مولانا سید اکبر آبادی جیسے بزرگ شریک ہوتے تھے۔ کبھی کبھار جمیل الدین عالی بھی آجاتے تھے ان محفلوں کا رنگ عجب تھا۔ کوئی مصدر تجویز کر دیا گیا اور طے پا گیا کہ اس مصدر کے فعل حال، ماضی، مستقبل کی ردیف میں غزل کہی جائے گی اور آئندہ ہفتہ پھر کسی کے مکان پر محفل سخن جمتی تھی۔ ہم کم عمر لوگ سیکھنے جاتے تھے، سنانے نہیں کہ اس گستاخی کی جرأت ہی نہ ہوتی تھی۔ اس محفل میں کسی نہ کسی موضوع پر علمی مباحث بھی ہوتے تھے۔ دوران میں تابش صاحب پیش پیش رہتے تھے۔ بحث کا نتیجہ نکلتا نظر نہ آتا تو سید محمد جعفری کو فقرے اور پھبتیاں کسنے کی سوجھتی اور ان کے فی البدیہہ مزاحیہ شعر رنگ محفل بدل ڈالتے۔ چائے اور فواکہات کے دَور چلتے اور وقت کا پتہ ہی نہ چلتا کہ کب دبے پاؤں گزر گیا۔ اکثر دوپہر سے شام اور شام سے رات ہو جاتی۔ یہ ذکر یوں نکل آیا کہ تابش صاحب کے اس دوسرے تہذیبی دَور کی نشان دہی مقصود تھی۔ ان ہی محفلوں میں تابش صاحب کے قریب آنے کا موقع ملا۔ انہیں نہایت باوضع، خوش ذوق اور نفیس طبیعت کا انسان پایا۔ جب کبھی مشورہ سخن در پیش ہوتا تو وہ کبھی بخل سے کام نہ لیتے۔ استادی شاگردی کا چکر انہوں نے کبھی نہ پالا۔ اس وقت وہ آل انڈیا ریڈیو میں اناؤنسر تھے ریڈیو میں انہیں پطرس بخاری ہی لے گئے۔ یہ ان کی واحد اور آخری باضابطہ ملازمت تھی جو قیام پاکستان کے بعد لاہور اور کراچی کے ریڈیو اسٹیشنوں پر بھی جاری رہی اور ریڈیو پاکستان کراچی ہی میں ملازمت سے نہایت قدر و منزلت کے ساتھ ریٹائر ہوئے۔

تیسرا دَور لاہور کا اور چوتھا دَور کراچی سے تعلق رکھتا ہے۔ لاہور پہنچا تو مجھ سے بہت پہلے تابش صاحب لاہور آچکے تھے۔ اور پاکستان براڈکاسٹنگ سروس (پہلے یہی نام تھا) کے لاہور اسٹیشن پر اناؤنسر کی حیثیت سے ملازمت جاری رکھے ہوئے تھے۔ اس دَور انتشار میں کسی کو کسی کی خبر نہیں تھی۔ کئی مہینوں بعد وہ اچانک سرِ راہ مل گئے۔ تپاک اور محبت سے گلے ملے اور اپنے ساتھ گھر لے گئے۔ بھابی اور بچوں سے ملوایا۔ دیر تک گپ شپ ہوتی رہی۔ نیلا گنبد کے پاس ان کی رہائش گاہ تھی۔ پھر وہ تیار ہو کر اپنی ڈیوٹی پر ریڈیو اسٹیشن چلے گئے۔ اور میں اپنے گھر آگیا۔ پھر نسبتاً ہر ہفتہ ملاقات ہوتی رہی۔ حلقۂ اربابِ ذوق کے وہ سکریٹری تھے۔ اس زمانے میں حلقۂ اربابِ ذوق اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے دھواں دھار ہوتے تھے۔ ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کی چشمک بھی تھی۔ اس دَور میں معرکے کی نشستیں اور مشاعرے ہوتے تھے۔ ان میں مذیر نیازی، ڈاکٹر تاثیر، قیوم نظر، یوسف ظفر، تاجور نجیب آبادی، عابد علی عابد، صوفی تبسم، احمد ندیم قاسمی، خلیل الرحمٰن، مختار صدیقی، ناصر کاظمی، مبارک احمد، شہرت بخاری جیسی شخصیتیں شریک ہوتی تھیں۔ اسی حلقۂ اربابِ ذوق کے ایک تنقیدی اجلاس میں میں نے بھی ایک دفعہ اپنی ایک غزل سُولی پر چڑھائی تھی۔ صدارت قیوم نظر کر رہے تھے اور سکریٹری شہرت بخاری تھے۔ اور تابش صاحب کی تجویز ہی پر یہ غزل پیش کی گئی تھی۔ بحث زیادہ نہ ہو سکی۔ شاید نووارد ہونے کی بنا پر مجھے بخش دیا گیا تھا۔ ریڈیو پر اور ان نشستوں میں ادب و شعر کی بڑی شخصیتوں سے میری ملاقاتیں تابش صاحب کے توسط سے ہوتی رہیں۔ یہ وہ محفلیں تھیں جن میں تابش صاحب کو بصد احترام مدعو کیا جاتا تھا۔ دلّی کے بعد ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۹ء تک لاہور میں تابش صاحب ایک قادر الکلام شاعر کی حیثیت سے شہرت و عزت کی بلندیوں پر پہنچ چکے تھے۔

نومبر ۱۹۴۹ء میں تلاشِ معاش میں لاہور سے جب میں کراچی آیا تو ذوالفقار علی بخاری ایک محفل کے اختتام پر مجھے اپنے ساتھ ریڈیو اسٹیشن لے گئے۔ . . . اور ڈائریکٹر کراچی اسٹیشن، اثنین قطب سے کہا کہ اسے بھاگنے مت دینا۔ چند روز میں شمس زبیری، اور اسلم فرخی بھی آگئے۔ شاہد احمد دہلوی، قاری عباس حسین، ارم لکھنوی، احمد فراز سے یہیں ملاقات ہوئی۔ ۱۹۵۱ء میں جب ریڈیو اسٹیشن کوئنز روڈ کی بیرکوں اور چھولداریوں سے بندر روڈ پر منتقل ہوا تو لاہور سے ریڈیو پاکستان کا شعبۂ خبر کراچی منتقل کر دیا گیا۔ اور یوں تابش صاحب بھی کراچی پہنچ گئے۔ اس طرح روزانہ ہی تابش صاحب سے ملاقاتیں ہونے لگیں۔ ریڈیو کی دنیا نرالی تھی۔ جہاں شہر کا ہر بڑا ادیب، شاعر کسی نہ کسی بہانے آہی جاتا تھا۔ بخاری صاحب کمال کے انسان تھے۔ جس کسی میں معمولی سی صلاحیت بھی دیکھتے تھے اُسے ریڈیو میں کھینچ لاتے۔ پھر زمانہ بھی ایسا تھا کہ ہندوستان سے ہجرت کرکے صاحبانِ کمال لاہور اور کراچی پہنچ رہے تھے۔ ارم لکھنوی، آرزو لکھنوی، محشر بدایونی، سیماب اکبر آبادی، استاد بندو خاں، استاد بڑے غلام علی خاں جیسی شخصیتوں کو بخاری صاحب نے سر آنکھوں پر بٹھایا تھا۔ حفیظ ہوشیارپوری، انصار ناصری اور ن۔م۔ راشد پہلے ہی سے ریڈیو میں اعلیٰ افسر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ شاہد احمد دہلوی، مدیر ساقی ایس احمد کے نام سے دلّی ریڈیو سے کلاسیکی گانے سناتے تھے۔ وہ بھی کراچی آکر ریڈیو پاکستان میں شامل ہو گئے تھے۔ شعیب حزیں بہارکوٹی، آگرہ سے رعنا اکبر آبادی، صبا اکبر آبادی، لکھنؤ سے سیّد آلِ رضا، سیّد کاظم رضا، سیّد ہاشم رضا بھی بہت پہلے کراچی پہنچ چکے تھے۔ بخاری صاحب کو شوقِ انجمن آرائی بھی تھا۔ شعر بھی عمدہ کہتے تھے۔ نثر بھی خوب لکھتے تھے۔ اور ماہر براڈکاسٹروں میں آغا اشرف کے بعد وہی حرفِ آخر تھے۔ ریڈیو پر ہفتہ واری مشاعرے نشر ہونے لگے اور بخاری صاحب کے مکان پر محفلیں جمنے لگیں۔ شہر میں کسی مقام پر بھی مشاعرہ ہوتا تو ریڈیو سے وابستہ شاعر بھی مدعو ہوتے۔ بخاری صاحب کی قیادت میں بلکہ اُن کی گاڑی میں ریڈیو کے شعراء کا قافلہ مشاعرہ میں پہنچتا اور مشاعرہ لُوٹ کر انہی کی گاڑی میں رات گئے واپس آتا۔ تابش اور ارم لکھنوی ان کے دائیں بائیں ہوتے۔ بخاری صاحب ہر شاعر کو اس کے گھر پر پہنچاتے۔ یہ وضع انہوں نے آخر تک نبھائی۔ آرزو لکھنوی کا انتقال ہوا تو بخاری صاحب نے لکھنوی شعراء کے مشورے سے ان کی یاد میں "انجمن آرزو" کی بنا ڈالی۔ اس کا پہلا طرحی مشاعرہ بخاری صاحب کے مکان پر ہی ہوا۔ طرح تھی ؎

آرزو کی انجمن میں آرزو باقی نہیں

اس مشاعرے میں ہر شاعر نے طرحی غزل ہی پڑھی تھی اور یہ مشاعرہ رات تین بجے تک چلا تھا۔ اسی انجمن کے زیرِ اہتمام ہر ماہ طرحی مشاعرے ہونے لگے۔ کبھی آلِ رضا صاحب کے مکان پر، کبھی منور عباس (ایڈوکیٹ) کے ہاں، کبھی بخاری صاحب کے گھر پر۔ ان مشاعروں میں پرانے اور نئے شعراء کے حوصلے نکلتے رہے۔ ان محفلوں کا رکھ رکھاؤ اور ادب و آداب آج بھی دل پر نقش ہیں۔ تابش صاحب کی زندگی کا یہ چوتھا تہذیبی اور ادبی دور سب سے زیادہ طویل رہا۔ ان سارے تہذیبی اَدوار کو تابش صاحب ہر لحظہ یاد کرتے ہیں۔ جن سے تابش صاحب کی تہذیب اور شائستگی، محبت اور خلوص کو نکھار ملتا رہا۔ اور شاعری مزید توانائی اور تازگی پاتی رہی۔ تابش صاحب کی کتاب "چراغِ صحرا" پر انتساب پڑھا: "برخوردار سعود کے نام اس امید کے ساتھ کہ وہ میری تہذیبی روایات کو زندہ رکھیں گے۔"

"میری تہذیبی روایات" کا دعویٰ کرنے کا انہیں بجا طور پر حق پہنچتا ہے کہ وہ خود تہذیب، اخلاق، شائستگی، وضع داری اور پاسِ محبت و خلوص کا جیتا جاگتا اعلیٰ نمونہ ہیں۔

نظموں کے مجموعہ "غبارِ انجم" کو تابش صاحب نے اپنی رفیقۂ حیات محترمہ محمودہ بیگم کے نام معنون کیا ہے۔ اور اس عبارت کے ساتھ "جن کی محبت میری شاعری کا سرمایہ ہے" اور یہ حقیقت بھی ہے کہ تابش صاحب کی رفیقۂ حیات قدم قدم ان کا سایہ نہ بنی رہتیں تو شاید وہ شاعری کے اس بلند و معتبر رتبہ پر نہ پہنچ پاتے جہاں آج وہ ہیں۔ اور ڈاکٹر محمد احسن فاروقی (مرحوم) کیسے کہتے کہ تابش صاحب کی شاعری تہذیب یافتہ ادب کی بہترین مثال ہے۔

تابش صاحب کی نظمیں بھی ان کی غزلوں کی طرح دل آویز ہیں اور فکر انگیز بھی۔ "غبارِ انجم" میں مختلف موضوعات پر ساٹھ نظمیں شامل ہیں جس میں پابند بھی ہیں اور آزاد بھی۔ ہیئت اور تنوع کے اعتبار سے ہر نظم اپنی جگہ پُر اثر ہے۔ صفحہ ۱۹ پر "یاد" کے عنوان سے چھپی ہوئی نظم تابش صاحب سے میں نے اس وقت سنی تھی جب انہوں نے غالباً ۱۹۴۹ء میں حلقۂ اربابِ ذوق، لاہور کے تنقیدی اجلاس میں پڑھی تھی۔ ۹ اسعروں کی یہ خوبصورت پابند نظم ہر صاحبِ احساس کے دل کو چھو لیتی ہے۔ غالب کی زمین میں غالب ہی کی یاد میں یہ قصیدہ بھی لکھا ہے۔

تا ثریا ہے رسا جس کا خیال | فکر پر جس کی دَرِ بے دَر کھلا
خوشہ چیں ہم بھی اسی خرمن کے ہیں | ہے اسی کے فیض کا لنگر کھلا

فانی کی موت پر ان کی یہ نظم ملتی ہے۔

حیاتِ بزمِ سخن تیری ذات تھی فانی | یقیں نہ تھا کہ یہ کل کائنات تھی فانی

یہ کہنا تو درست ہے کہ تابش صاحب مشاعروں کے شاعر نہیں لیکن انہوں نے ایسے شعر بھی کہے ہیں جو کسی بھی مشاعرے میں ترنم سے پڑھے جائیں تو اُسے الٹ سکتے ہیں۔ جیسے ؎

صبا ہزار کرے بوئے گل کی آمیزش | نہ دب سکے گی ترے جسمِ ناز کی خوشبو
گرفتہ دل ہیں یہ غنچے بس اس تمنا میں | کسی طرح ترے لہجے میں گفتگو کرتے
سربستہ رازہائے چمن فاش ہو گئے | کھلنے نہ پائے تھے ترے بندِ قبا ابھی
نفس کی زد پہ ہر اک شعلۂ تمنا ہے | ہوا کے سامنے کس کا چراغ جلتا ہے
وہی وصل و ہجر کی لذتیں، وہی فاصلے، وہی قربتیں | کبھی یوں ملے کہ بچھڑ گئے، کبھی ایسے بچھڑے کہ مل گئے
مجھے وصال سے ملتی ہے حسرتِ تازہ | تجھے وصال نئی دلربائی دیتا ہے

ایسے شعروں میں بھی تابش صاحب نے شائستگی، فن اور حسنِ معانی کو ملحوظِ خاطر رکھا ہے۔

ہمارے زمانے میں شاعری کی معروف تعریف یہ ہے کہ وہ جذبات سے پیدا ہوتی ہے اور جذبات ہی کو حرکت میں لاتی ہے۔ تمام موجودہ شاعری اسی تعریف کے تحت آتی ہے اور اسی کے مطابق اُسے شہرت اور مقبولیت حاصل ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ جذباتی شاعری کا زمانہ ہے' اس کے ساتھ لیکن فکری شاعری کا ذکر کیا جاتا ہے تو اُس سے ایسی شاعری مُراد لی جاتی ہے' جس میں بڑے بڑے خیالات نظم کئے گئے ہوں۔ شاعری کے ان تصورات نے ہمارے مذاقِ شعری اور خود شاعری کو کتنا نقصان پہنچایا ہے' اس کا اندازہ لگانا ابھی آسان نہیں رہا۔

تابش صاحب کی شاعری جذباتی شاعری نہیں ہے' ان معنوں میں فکری بھی نہیں کہ وہ بڑے بڑے خیالات پیش کرتے ہوں لیکن جو لوگ شاعری کا صحیح ذوق رکھتے ہیں انہیں معلوم ہے کہ موجودہ دور کی جذبات پرستی اور خیال پرستی دونوں سے الگ تابش صاحب کی شاعری میں ایک ایسا عنصر موجود ہے جس کی اچھی شاعری کو ہمیشہ ضرورت رہے گی۔ یعنی سوچنے کی قوت جو زبان و بیان پر قدرت کے ساتھ صحیح ذوق کو متاثر کر سکتی ہے۔ تابش صاحب کی شاعری میں ایک ایسا ارتکاز اور صحت پائی جاتی ہے جو اس زمانے میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔

سلیم احمد

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

تابش میری نظر میں

کسی آنکھ کو صدا دو کسی زلف کو پکارو ؛ بڑی دھوپ پڑ رہی ہے کوئی سائباں نہیں ہے

مسعود الحسن تابش دہلوی اس دور میں دلّی کے رنگ سخن اور راہ و رسم آشنائی، شناسائی کی تصویر ہیں، ان کا تعلق دہلی کے اس مشہور خاندان سے ہے جس کے ایک فرد مولوی ذکاء اللہ تھے جن کے بارے میں بجا مشہور ہے کہ ان کی تصانیف، تالیفات اور تراجم خود ایک لائبریری ہیں جن میں تاریخ، جدید علوم و فنون، ترجمے، سب کچھ شامل ہیں۔ دلّی والوں کو اپنی دستار و گفتار پر جو فخر تھا وہ صدیوں کی تہذیب کی پرورش سے پیدا ہوا تھا۔ پاکستان میں تابش دہلوی ان چند گنے چنے حضرات میں ہیں جن سے اس تہذیب اور شائستگی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو برصغیر میں مسلمانوں کی تہذیبی روایت کی حیثیت سے معراج کمال کو پہنچی، متانت رکھ رکھاؤ، تہذیب و شائستگی، نرم لہجہ جو ان کی شخصیت کے پہلو ہیں وہ اُن کے کلام میں نظر آتے ہیں۔ ان کی ایک غزل ہے۔

ایک جلوہ بصد انداز نظر دیکھ لیا ؛ تجھ ہی کو دیکھا کئے تجھ کو اگر دیکھ لیا
جیسے سر پھوڑ کے مل جائے گی زنداں سے نجات ؛ کیا جنوں نے کوئی دیوار میں در دیکھ لیا
باز ہے آج تلک دیدۂ حیراں کی طرح ؛ دشتِ وحشت نے کسے خاک بسر دیکھ لیا
جُرمِ نظّارہ کی پاتا ہے سزا دل اب تک ؛ اہلِ دل دیکھ لیا، اہلِ نظر دیکھ لیا!
صورتِ نقشِ قدم دیدۂ مشتاق ہیں ہم ؛ جب کبھی وہ آیا سرِ راہگذر دیکھ لیا
یہی حسرت ہے کہ وہ ایک نظر دیکھ تو لے ؛ اور اس نے کبھی اس سمت اگر دیکھ لیا
کہیں پردہ ہے تجلّی کہیں جلوہ ہے حجاب ؛ یہ تماشا بھی ترا ذوقِ نظر دیکھ لیا
روز اک تازہ غمِ دہر ہے نازل تابش ؛ ایک طوفانِ بلا نے مرا گھر دیکھ لیا

تابش دہلوی کے کلام کے کئی مجموعے شائع ہو چکے 'نیم روز'، چراغ صحرا میں، نعت، منقبت، سلام مرثیہ وغیرہ) اور غبارِ انجم نظموں کا مجموعہ ہے اس میں مختلف موضوعات پر نظمیں شامل ہیں اور غزل میں روایتی رنگ

و آہنگ ہے شاعر اس میں نظم کے رائج اور مقبول اسالیب کے ساتھ ساتھ ہیئت کے نئے تجربوں سے بھی آشنا معلوم ہوتا ہے، ایک پوری غزل اور ایک جدید نظم دیکھئے :۔

مآلِ شوقِ دلِ بے قرار کیا ہوگا — یہ دردِ دل کہ ہوا بار بار کیا ہوگا
تمام زیست عبارت ہے نامرادی سے — اب اور اے دلِ اُمید وار کیا ہوگا
مذاقِ دردِ مسلّم، مزاجِ دل معلوم — سمجھ رہا ہوں کہ غم ناگوار کیا ہوگا
نہ کوئی سعئ نشیمن، نہ کوئی شغلِ جنوں — خزاں سے بڑھ کے فریبِ بہار کیا ہوگا
جب آرزوئے سکوں مرگِ جاوداں ٹھہرے — تو اضطرابِ دلِ بیقرار کیا ہوگا
دوامِ ہجر ہے اے جانِ آرزومندی — اب اس سے بڑھ کے ترا انتظار کیا ہوگا
ابھی حجاب و تجلّی فریب دیتے ہیں — نگاہ و دل کا ابھی اعتبار کیا ہوگا
سکوت، آمدِ طوفاں کی دے رہا ہے خبر — خزاں سے سمجھے کہ عہدِ بہار کیا ہوگا
بہت ہے حسرتِ ہستی کا حوصلہ تابش — اِس ایک رنجِ محبت سے پار کیا ہوگا

(نومبر ۱۹۵۳ء)

نظم کا عنوان ہے ایک جن ایک آدمی (جنگ جُو اقوامِ عالم کے نام)

سنا ہے یہ پریاں، یہ جنّات ہیں قاف کے رہنے والے
وہی قاف
جس کی زمیں ہے زمرّد کی، نیلم کے ہفت آسماں ہیں
جہاں کی فضاؤں میں ہیں لعل و مرجان کے طائر پرافشاں
ہوائیں ترنم فروش اور نغمہ زباں ہیں
بہت دور تک سیم و زر کے پہاڑوں کا اک سلسلہ ہے
بیاباں ہیں کندن کے، پکھراج کی وادیاں ہیں
درختوں میں لگتے ہیں ہر روز زرّین خوشے
مے وانگبیں کے بھی چشمے رواں ہیں
کِھلا کرتے ہیں پھول دن رات۔ شاداب چہروں کی صورت
جہاں سرو و شمشاد کی شکل میں نوجواں ہیں
جہاں شہر در شہر بستے ہیں زریں قبا و سمن بر
بہت خوش جمالوں کی آبادیاں ہیں جہاں

جہاں دشت در دشت نجم و مہ و مہر بکھرے پڑے ہیں
جہاں گہرہائے نایاب سیلِ رواں یم بہ یم ہیں
وہاں موت کوئی تصور نہیں، شعبۂ زندگی کا
حیاتِ ابد۔ راحت جاوداں لمحہ لمحہ۔ مگر
اس طلسم طرب تک پہنچنا کچھ آساں نہیں ہے
بہت دشت و در درمیاں ہیں !!!
یہ سارا علاقہ ہے زیر نگیں ایک سردار جن کا اور اک اک قدم پہ
ہزاروں طلسم و فسوں پاسباں ہیں !!!
مگر ایک طوطے میں اس جن کی جاں ہے مقید
یہ طوطا ہے موتی محل میں اور اس راستے میں
بہت موت کی گھاٹیاں ہیں۔ بہت کوہ و دریا
مگر آدمی نے تدبر کے ہاتھوں اسے مار ڈالا
کہاں ہیں وہ پریاں وہ جن۔ وہ طلسم و فسوں اب کہاں ہیں۔
جنوں سے یہ انسان کتنا بڑا ہے

اس نظم کے پہلے حصہ میں انسانی تاریخ کے اس دور کی کہانی ہے جب مہم جو خطرات کو دعوت دینے والا۔ اُن سے نبرد آزما اور بالآخران پر فتح حاصل کرنے والا کردار ہے۔ جن مہمات کو وہ سر کرتا ہے۔ اس میں صرف انسانوں سے نہیں جنوں اور جادوگروں سے اس کا مقابلہ ہوتا ہے اور انسان غالب آتا ہے۔ یہ ایک خواب ہے لیکن ان کہانیوں اور داستانوں میں جو صدیوں سے دنیا کی مختلف زبانوں میں نثر اور نظم میں انسانی تہذیب کا ایک عظیم سرمایہ اور اس کے عزم اور حوصلہ کا ایک خواب ہے اسے ان سب پر فاتح دکھایا گیا ہے اور

دوسرے بند میں۔
یہ حقیقت کی دنیا ہے جو اُن طلسمات سے بڑا طلسم ہے۔ صرف طلسمات کی نوعیت بدل گئی ہے
اور بظاہر حسین اور پرسکون طلسماتی دنیا میں انسان اپنے آپ کو کس قدر مجبور محسوس کرتا اور لاچار پاتا ہے اور
جنوں پر غالب آنے والا طلسمات شکن انسان بے کس اور مجبور کتنا چھوٹا ہے
مگر اس زمیں پر جہاں زندگی ہے کہ بکھری پڑی ہے
ہزاروں طلسمات، اک اک قدم پر، عیاں ہیں نہاں ہیں
کہیں خرد سالی ہیں تقدیس عمر ابد ہے، کہیں سال خوردہ زماں و مکاں آفرینش نشاں ہیں

کبھی ہر نظر غرب ماہ مبیں شرق مہر منور
کبھی چرخ افکار و عرش تصور یہی قلب وجاں ہیں
خرد کے لئے قطرہ قطرہ ہے نا رفتہ طوفاں
جنوں کے لئے پھول ہے ناشگفتہ گلستاں
کبھی اک گل نغمہ فردوس راحت ہوا ہے
کبھی حرف شیریں میں سولذتیں دو جہاں کی
کبھی دسترس میں ہیں لاکھوں طلسمی جزیرے
کہیں دور۔ رنگیں خیالات کی بستیاں ہیں
کبھی اک تبسم میں ہیں زعفراں زار پیہم شگفتہ
خرابات کی وادیاں اک ترنم سے پیدا
کہیں ایک منظر پہ ہے منحصر حسن جلوہ گری کا
کبھی۔ اک تجلی۔ جہاں در جہاں ہے
غرض سارے آفاق کی وسعتیں گم ہیں اس آدمی میں
بہت بیکراں۔ یہ دل وجاں کی پہنائیاں ہیں۔ بہت بیکراں
یہ جن تو نہیں ہے۔ اسے مار دینا کچھ آساں نہیں ہے
یہاں تک رسائی ہے مشکل۔ دو عالم یہاں درمیاں ہیں!!
جنوں سے یہ انسان کتنا بڑا ہے۔ یہ کمزور انساں

اردو میں نظموں میں ہیئت کے تجربوں میں ہمارے ناقدین نے دور کی کوڑی لانے والے شاعروں کی ابہام زدہ جنسیات آلودہ اور آبرو باختہ نظموں کا مزے لے کر ذکر کیا ہے لیکن اس نظم کا حوالہ جس کی یہ مستحق تھی نہیں دیا۔

چند متفرق اشعار دیکھئے :۔

روز خوشبو تری لاتے ہیں صبا کے جھونکے ‫ ‫ ‫ اہل گلشن مری وحشت کو ہوا دیتے ہیں
ذرّے میں ہیں گم ہزار صحرا ‫ ‫ ‫ قطرے میں محیط لاکھ قلزم
ایک ایک نفس ترا پیامی ‫ ‫ ‫ ایک ایک نگاہ تیری محرم
سلام اہل محبت پہ ہو کہ وہ اب تک ‫ ‫ ‫ فراق و وصل کے صدمے اٹھائے جاتے ہیں

ان اشعار میں اور ان کے علاوہ غزل کی وہ دہلوی روایت جس کو بعض ناقدین نے تصوف کے مضامین سے تعبیر کیا ہے ان کی جھلک بھی موجود ہے۔

۳ ڈی۔ ۹/۹ ناظم آباد
کراچی۔ ۷۴۶۰۰

محترم نعیم میرٹھی صاحب۔ سلام مسنون

شرمندہ ہوں کہ آپ کے گرامی نامے کا جواب خاصی تاخیر سے دے رہا ہوں۔ کچھ عرصے سے میری طبیعت ناساز چلی آرہی ہے۔ اس لئے اپنے کاموں کو معمول کے مطابق انجام نہیں دے پاتا۔

جناب تابش دہلوی کی خدمات کا اعتراف کرنا، دراصل خود اپنی بصارت و بصیرت کا ثبوت مہیا کرنا ہے آپ نے اُن کی شاندار ادبی خدمات کے اعتراف میں ایک تقریب منعقد کرنے اور مجلّہ شائع کرنے کا جو اہتمام کیا ہے، اس کے لئے وہ تمام لوگ آپ کے ممنون ہوں گے جو تابش صاحب سے ذاتی طور پر نیاز مندی کا رشتہ رکھتے ہیں۔ تابش صاحب بڑی پہلودار شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ عہد حاضر کے نہ صرف بہت بڑے غزل گو ہیں بلکہ اردو زبان کے مزاج شناس کی حیثیت سے بھی اُن کا درجہ بہت بلند ہے۔ انھیں زبان و بیان پر جو قدرت حاصل ہے، اس کی اگر کوئی مثال دی جاسکتی ہے، تو وہ انھیں کی ذات سے دی جاسکتی ہے۔ نثر نگاری خصوصاً یادنگاری میں بھی انھیں منفرد مقام حاصل ہے اور میرے لئے تو وہ روشنی کے ایک مینار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ۴۴، ۴۵ برسوں سے مجھے اُن سے نیاز مندی کا شرف حاصل ہے۔ اس وقت سے اب تک میں اُن کے ادبی خوانِ نعمت کی زلّہ ربائی کر رہا ہوں۔ زبان و بیان کے مسئلے پر جب کوئی مشکل پیش آتی ہے، میں انھیں سے رہنمائی حاصل کرتا ہوں اور یوں مجھے لغات کی ورق گردانی کی ضرورت نہیں رہتی۔ ویسے بھی میں تابش صاحب کو اُسی وقت زحمت دیتا ہوں جب لغات سے میرا مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ کتنے ہی الفاظ، محاورات اور ضرب الامثال ہیں جن کا لغات میں اندراج نہیں۔ ان سب کے معانی تک رسائی کے لئے تابش صاحب ہی کام آتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ لغات جہاں ختم ہوتے ہیں، تابش صاحب وہاں سے شروع ہوتے ہیں۔

ہمارا تہذیبی ماضی اب زیادہ تر کتابوں ہی میں ملتا ہے، خدا کا شکر ہے کہ تابش صاحب کی صورت میں یہ اپنے اصلی خدوخال کے ساتھ ہمارے درمیان موجود ہے۔ خدا انھیں تادیر سلامت رکھے کہ وہ دلّی کی تہذیب کے آخری نمائندے ہیں اور یہی تہذیب برصغیر کی اسلامی تہذیب کی صورت گر ہے

میرا ارادہ تھا کہ میں تابش صاحب کے بارے میں ایک مفصل مضمون لکھوں گا مگر میری بیماری کا موجودہ سلسلہ اس کی اجازت نہیں دیتا کہ یہ کام پوری دلجمعی سے کرسکوں۔ انشاءاللہ یہ قرض مستقبل قریب میں ادا کردوں گا۔

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ

۳-۲-۱۹۹۶ء

جناب تابش دہلوی سے میری نیاز مندی بہت قدیم ہے۔ وہ ایک بزرگ شاعر شریف النفس انسان اور ماہر زبان کی حیثیت سے ملک گیر شہرت کے حامل ہیں۔ میں نے ذاتی طور پر ان کے کلام میں دلکشی اثر اور توانائی محسوس کی ہے۔ انہیں زبان پر جو حیرت انگیز قدرت حاصل ہے اس کا تذکرہ میں نے اکثر سنا ہے اور یہ بات بھی میرے علم میں ہے کہ جناب تابش دہلوی زبان کے سلسلے میں ایک مستند عالم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میری دعا ہے کہ خداوند تعالیٰ ان کے ذہن کو اور زیادہ روشنی، ان کے قلم کو زیادہ توانائی اور ان کی عمر میں برکت عطا فرمائے اور وہ پوری تندہی، لگن اور انہماک سے اُردو زبان و ادب کی خدمت انجام دیتے رہیں۔

سید معصوم علی ترمذی
وائس چانسلر
جامعہ کراچی

ڈاکٹر انور سدید

آزادی کے بعد پاکستان میں اردو غزل کے عناصر اربعہ

مجھے احساس ہے کہ حفیظ ہوشیار پوری نے غزل کے ساتھ پوری زندگی بسر کی لیکن وہ غزل کی بھری دنیا میں تنہا ہی رہے میرے خیال میں حفیظ نے غزل کی دنیا میں تنہا رہ کر اپنی انفرادیت کا بہتر تحفظ کیا یہی وجہ ہے وہ مرگِ انبوہ میں گم نہیں ہوئے بلکہ آج بھی منفرد قرار پاتے اور غزل کے عناصر اربعہ میں شمار ہوتے ہیں۔

پاکستان میں اردو غزل کے عناصر اربعہ میں تابش دہلوی کا شمار اس لئے ضروری ہے کہ انہوں نے اپنا بچپن اردو غزل کے قدیم دیاروں میں گزارا۔ عفوانِ شباب میں جدید غزل کے قرینے میں آگئے انہوں نے دہلی، حیدر آباد دکن اور لکھنؤ میں اس دور کے اساتذہ غزل کی علمی اور ادبی صحبتوں سے فیض حاصل کیا۔ غزل کی روایت سے ذہنی ہم آہنگی پیدا کی تو مرزا مظہر جانِ جاناں، میر تقی میر، انعام اللہ خان یقین، اسد اللہ خان غالب، حکیم مومن خان مومن، مرزا یاس یگانہ چنگیزی، جوش ملیح آبادی، علامہ اقبال، امجد حیدر آبادی اور نظم طبا طبائی کے جوہرِ فن سے استفادہ کیا۔ تابش دہلوی کو فانی بدایونی سے شرفِ تلمذ حاصل تھا اور ایک زمانے میں ان کی وجہِ شہرت یہ تھی کہ وہ فانی کے رنگ میں غزل کہتے تھے۔ لیکن جب ان کے ذہن کی خلاقی نے تجریدِ فن کے زاویے ابھارے تو اُن میں تابش دہلوی کی اپنی ذات کی جلوہ گری دیدنی تھی۔ بلاشبہ انہوں نے روایت کی پاسداری کی اور زمانے کا ساتھ دیا لیکن اپنا تشخص اپنی غزل سے قائم کیا اور اب یہ غزل ان کی انفرادیت کی مظہر اور ان کی پہچان ہے۔

تابش دہلوی ۱۹۴۷ء میں اپنے نئے وطن پاکستان آئے تو اس وقت کا معاشرہ قدروں کے انہدام سے دوچار تھا، زندگی نئی حقیقتوں سے متصادم تھی، جذبات، احساسات اور تاثرات کی کایا پلٹ رہی تھی۔ اس دور کی غزل نے معاشرتی جزر و مد کو اپنے بطون میں سمیٹنے کی جو کوشش کی، اس سے نئی غزل نمو پانے لگی۔ یہ غزل ایرانی علائم اور رموز کو آراستہ گرد و پیش سے اکتساب کر رہی تھی۔ تابش دہلوی (پ ۱۹۱۱ء) نے غزل کا پہلا شعر ۱۹۲۳ء میں کہا تھا۔ اس وقت ان کی عمر ۱۲ برس تھی اور وہ مسعود کے نام سے موسوم ہوتے تھے۔ مشاعرے کی طرح

سنی تو ان پر ایک مقطع یوں اترا۔

کہاں کہاں مجھے مسعود لوگ ڈھونڈ آتے بھلا میں اس کی گلی کے سوا کہاں ہوتا

زمانی لحاظ سے تابش دہلوی نے غزل کی تہذیبی روایت کے ساتھ برصغیر ہند میں ۲۴ برس کا عرصہ گزارا۔ پاکستان میں جدید غزل کے ساتھ وہ اپنی زندگی کی نصف صدی گزار چکے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ اس وقت تابش دہلوی واحد شاعر ہیں۔ جن کی غزل میں دو زمانوں کا ایسا امتزاج اور قدیم و جدید کا ایسا ادغام موجود ہے جو فطری انداز میں عمل میں آیا ہے اور جس کی آبیاری لاشعور کے تخلیقی سرچشموں سے ہوئی ہے۔ ان کی تخلیقی زندگی ۷۴ برس پر محیط ہے اور اس کا بیشتر حصہ غزل کی روشنیوں اور سایوں میں بسر ہوا ہے۔ روشنیاں غزل کے توانا پیکر سے ابھرتی تھیں۔ تابش دہلوی کی عطایہ ہے کہ انہوں نے ترقی پسند تحریک کے عروج کے دور میں جب مقصد بکنار نظم کا پرچم بلند کیا جا رہا تھا' غزل کا ساتھ دیا اور اس کے نقش و نگار دہلی' لکھنؤ اور حیدر آباد کی تہذیبی قدروں سے نکھارے۔ ان کی اس خوبی کا اعتراف بھی لازم ہے کہ انہوں نے آزادی کے بعد "نئی لسانی تشکیلات" کے "اشتغالِ فراواں" میں جب "اظہار" پر "ارتکاب" "غالب" کیا تھا تو لفظ کی حرمت کی پاسداری کی اور اپنے مضامینِ نو کے لئے خود اپنی تشبیہیں اور استعارے تراشے جن سے جدید غزل کا داخلی مزاج بھی متاثر ہوا اور اس کی خارجی پیشکش بھی ندرت آفریں ہو گئی۔ ترقی پسند غزل نے شوریدہ فضا کو جنم دیا تھا' اس شوریدہ فضا میں تابش دہلوی نے اپنے باطن میں سلگنے والے الاؤ کو محسوس کیا اور اس کی آنچ اپنی غزل کے داخل میں شامل کر دی۔ ان کی خود کلامی میں ان کے لب خاموش دکھائی دیتے ہیں لیکن الفاظ میں جذبے کا تحرک موجود ہے اور وہ جنگل سے آگے ایک اور جنگل کو اور کائنات سے آگے ایک اور کائنات کو دیکھ لیتے ہیں

گرمی سے نفس پگھل رہا ہے مجھ میں وہ الاؤ جل رہا ہے
ایک اشکِ سرِ مژگاں سے نظر کیا گزری آئینہ خانے مرے دیدۂ تر سے گزرے
دل میں ہلچل مری فریاد سے ہے مجھ میں اٹھی ہے قیامت میری
نادیدہ منظروں کو اگر چاہیں دیکھنا اپنی ہی ذات سے کوئی پردہ اٹھائیے
خوں بار کربِ دید کے منظر ہیں روبرو اب جس طرف بھی چشم تماشا اٹھائیے
بند کر لیتا ہوں آنکھیں تابش باب نظارہ مگر کھلتا ہے

سحر انصاری نے شہادت دی کہ "تابش صاحب کی غزل میں اپنے عہد کے طرزِ سخن سے باخبری کے اشارے بھی ملتے ہیں اور ان کی غزل کا خمیر ایک ایسے اسلوب سے اٹھا ہے جسے ان کی شاعرانہ صلاحیت' لطافت احساس اور شعورِ زبان و بیان نے ایک مدت میں تشکیل دیا ہے۔" ڈاکٹر ابو الخیر کشفی نے تابش دہلوی کی غزل میں زمانے کے تازہ تر رجحانات کی نشاندہی کی تو یہ اعتراف بھی کیا کہ وہ "بیسویں صدی کے اس دور کے شاعر ہیں جس میں گلشن کم

تعمیر کئے گئے اور خرابے زیادہ بسائے گئے۔" احمد ہمدانی کو ان کے اشعار میں احساس کی شدت کے باوجود کسی قسم کی گھٹن کی کیفیت نظر نہ آئی تو انہوں نے لکھا:

"ایسے لوگ جو ذہن کی حریفانہ کیفیت کو ہی شدتِ احساس سمجھتے ہیں ان کے لئے (تابش دہلوی کے) اشعار ممکن ہے کوئی کشش نہ رکھتے ہوں لیکن خواہشوں کے محلوں میں رہنے والوں کے بجائے زمین پر بسنے والے انسان ان (کے) اشعار میں خود کو بولتا ہوا محسوس کریں گے۔"

جدید دور کے تین مختلف نظریات کے نقادوں کی مندرجہ بالا آراء اس حقیقت کو ثابت کرتی ہیں کہ تابش دہلوی کی غزل زمانے کے میزان پر پوری اتر چکی ہے۔ اس میں قدیم کی کلاسیکی مرصع کاری بھی ہے اور جدید ڈکشن میں معاصریت کی جھلکیاں بھی صاف نظر آتی ہیں ان کی غزل زمانے کا آئینہ بھی ہے اور اس میں ان کے باطن کی آواز بھی شامل ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے جن میں مضامین کا تنوع دامن کشِ دل ہے ؎

اپنے دشمن سے ہوں واقف تابش — کسی دیرینہ شناسا کی طرح
ہم نے مانا کہ کڑی دھوپ ہے تابش لیکن — سایہ ہمسائے کی دیوار کا ہے آنگن میں
کچھ تیرہ نژاد اس زمین پر — نکلے ہیں مہ و نجوم اُگانے
تابش سہارا لیجئے نہ امید و بیم کا — تنہا کبھی حجابِ تمنا اٹھایئے
بڑھ گیا اور بھی ربطِ خاطر — اس تعلق سے مآل اچھا ہے

قدامت اور جدیدیت کے سنگم پر تابش دہلوی مجھے ایک ایسے مینارۂ نور کی مثال نظر آتے ہیں جس کی روشنی راستوں کو منور کرتی ہے اور نو واردانِ راہ کو نئی منزلوں کا پتہ دیتی ہے۔ ان کی اس خوبی کی وجہ سے وہ اردو غزل کے عناصر اربعہ میں شامل ہیں۔

روزنامہ جسارت

۱۹ نومبر ۱۹۹۷ء


HABIB BANK'S
CRORE PATI
RUPEE DEPOSIT CERTIFICATES
اب 1 کروڑ روپے
ہر ماہ
حبیب بینک کی جانب سے ایک اور خوشخبری
اب آپ کے کروڑ پتی بننے کے مواقع
تین گنا زیادہ۔
1 کروڑ روپے کا بمپر پرائز - ہر ماہ
5 لاکھ روپے کا گرانڈ پرائز - ہر ماہ
اور دیگر نقد انعامات کی تعداد میں کئی اضافہ
اس کے علاوہ بہترین شرح منافع کے ساتھ
فکسڈ ڈپازٹ کے تمام ثمرات بھی۔
• قرضہ حاصل کرنے کی سہولت
• منافع کی ادائیگی ہر 3 مہینے اور 6 مہینے میں
• میعاد کا انتخاب
(3 مہینے 6 مہینے اور 12 مہینے)
• بہترین شرح منافع
ہر 50 ہزار روپے کا سرٹیفکیٹ انعامات کا حامل ہے۔ آپ جتنے زیادہ سرٹیفکیٹ خریدیں گے اتنے ہی زیادہ انعامات جیتنے کے مواقع ملیں گے۔
67 نقد انعامات
ہر ماہ
100,000 روپے کے 5 پرائزز
50,000 روپے کے 10 پرائزز
10,000 روپے کے 50 پرائزز
گرانڈ پرائز 500,000 روپے
بمپر پرائز 1 کروڑ روپے
گرانڈ پرائز 500,000 روپے ہر ماہ
حبیب بینک کی تمام برانچوں میں دستیاب ہے
حبیب بینک
Delta Dot
Interflow

پروفیسر ڈاکٹر سید وقار احمد رضوی

تابش دہلوی کی شاعری

جناب تابش دہلوی ایک ثاقب النظر، سریع الخاطر اور مہذب الذوق شاعر ہیں وہ قدروں کے نباض اور تجربات کے مبصر ہیں۔ ان کی شاعری میں وجدانی تاثرات کے ساتھ ساتھ سائنسی صداقت، عقل و آگہی اور ادراک و شعور ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا دماغ شئی لطیف سے معمور ہے اس لیے وہ اپنی شاعری میں عقل و آگہی اور ادراک و شعور کا مظاہرہ کرتے ہیں ان کی شاعری ایجابی شاعری ہے۔ شاعر کا ایک فریضہ یہ ہے کہ وہ ادب کی قدر و قیمت کی وضاحت کرے۔ تابش دہلوی اپنی شاعری کے ذریعے انسانی زندگی کی عظمت کا پرچار کرتے ہیں ان کی شاعری میں انسانی دکھ درد، انسانی محبت اور انسانی معاشرے میں فلاح و بہبود کی کارفرمائی سے گہری وابستگی پائی جاتی ہے۔ وہ ایک وسیع المطالعہ، ذی علم اور صاحب بصیرت شاعر ہیں۔ ان میں عصبیت، جنبہ داری اور تعصب نہیں۔ وہ کھلے ذہن کے انسان ہیں۔ دوسروں کی اسکالرشپ کو تسلیم کرتے ہیں۔ وہ کبھی تاریخی جبریت کے شکار نہیں ہوئے۔ ثقافت علمی اور ثقافت ادبی ان کی کتابوں میں پائی جاتی ہیں۔ وہ مختلف النوع جہات کے شاعر ہیں۔ وہ عربی فارسی کے عالم شاعر ہیں۔ طباع اور ذہین ہیں۔ ان کی شاعری میں حسن و عشق کی کیفیات و احساسات ہیں۔ نازک خیالی، حسن ادا اور رموز عشق و حسن کے مضامین ہیں۔ اشعار میں معنی آفرینی ہے وہ زبان دلبری کو تجربہ و ادراک کا ایمائی شعور دیتے ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری میں ابہام و تفہیم سے کام لیا ہے۔ وہ اپنی شاعری کے ذریعے صحیفۂ حیات کی تشریح و توجیہہ پیش کرتے ہیں۔ وہ تیز ادراک، زندہ احساس، وسعت نظر، اور عمیق ذہن کے مالک ہیں۔ ان کی شاعری میں بالغ نظری ہے اور زندگی کا تحلیل و تجزیہ ہے۔

روایات کا انضباتی ذہن۔ رمز و اشارہ کی راہوں سے تجربہ و ادراک کا ایمائی شعور دیتا ہے۔ جس کے نقوش بظاہر مستعلیقی ہوتے ہیں۔ لیکن روح وسعتوں اور عظمتوں کا شاندار احساس لیے ہوتی ہے۔ ارتقاء بالضد کا یہ نظام، زندگی کے حرکی تصور اور عملی التزامات کا پیغامبر ہوتا ہے۔ خان آرزو نے سودا کی شاعری کو حدیث قدسی کہا ہے لیکن اس حدیث قدسی اور زبان دلبری نے تلمیحی ذہن ہی کو فروغ نہیں دیا بلکہ ترک و اختیار اور ہوشمندی کی گنجائشیں بھی پیدا کیں۔ تبیر تخلیقی ذہن کو آگہی اور قوت دیتی ہے اور یہیں سے تخلیق، حقیقت کی مصوری اور فکر، خیال کی بالواسطہ قدروں سے بلاواسطہ روایت کی سرحدوں میں داخل ہو جاتی ہے۔ اور ذہن کی وسیع کائنات میں لاشعور کی تاریک تہیں پھٹ کر، روشنی کی آغوش میں آسودگی حاصل کرتی ہیں۔ کیونکہ جس طرح موسیقی، غیر شعوری طور پر سامعہ کو لذت بخشتی ہے۔ اسی

رح لاشعور، مواد اور ہیئت کی فراہمی میں مدد کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ جب شعراء کا آہنگ RHYME خام رہ جاتا ہے
دسامعہ کی تشنگی، ذوق سلیم پر گراں گزرتی ہے لیکن تابش دہلوی کی شاعری ذوق سلیم پر گراں نہیں گزرتی ہے۔ کیوں کہ
س میں بھرپور شعری آہنگ ہے۔

مسعود الحسن تابش دہلوی خالص غزل کے شاعر ہیں ۔ ان کی غزل منفرد شاعرانہ صفات کی حامل نظر آتا ہے۔ ان کی غزل تہذیب یافتہ ہے۔ صحت، متانت، توازن اور نفاست ان کی غزل کی خصوصیات ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے بعد غزل میں جن شعراء نے تصوف کا کام لیا۔ ان میں تابش دہلوی کا نام آتا ہے۔ وہ دہلی کے مشہور علمی خاندان شمس العلما مولوی ذکاءاللہ کے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے بی اے تک تعلیم حاصل کی۔ اور پھر ابتدا میں آل انڈیا ریڈیو اور ریڈیو پاکستان سے منسلک رہے۔ ان کے پہلے مجموعہ کلام کا نام نیمروز ہے۔ جو ۱۹۶۳ء میں چھپا۔ دوسرے مجموعہ کلام کا نام چراغ صحرا ہے۔ جو ۱۹۸۲ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ تیسرا مجموعہ منظومات غبار انجم ہے جو ۱۹۹۴ء میں طبع ہوا۔ ان کی غزلوں میں تخلیقی اور فنی عناصر ہیں۔ وہ ریاضت نفس اور ریاضت فن کی منزلوں سے گذرے ہیں۔ اس لیے ان کی غزلیں نکھری ہوئی ہیں۔ ان کے ہاں زبان و بیان کی بے اعتدالیاں نظر نہیں آتیں۔ ان کی غزلوں میں خیال کی پاکیزگی، جذبے کی صداقت، بیان کی صفائی، اور متصوفانہ یا روحانی اقدار کی جلوہ سامانی ہے ان کو جدید غزل گو شعراء میں اساتذہ کی صف میں جگہ دی جاسکتی ہے۔ ان کے منتخب اشعار ملاحظہ فرمایئے ؎

روز خوشبو تری لاتے ہیں ہوا کے جھونکے
اہلِ گلشن مری وحشت کو ہوا دیتے ہیں

ذرے میں گم ہزار صحرا　　قطرے میں محیط لاکھ قلزم
ایک ایک نفس ترا پیامی　　ایک ایک نگاہ تیری محرم

سلام اہلِ محبت پہ ہو کہ وہ لب تک
فراق و وصل کے صدمے اٹھائے جاتے ہیں

زخم ہائے نو بہ نو ہیں حاصلِ فصلِ بہار
کتنے تازہ پھول ہم صحنِ چمن سے لائے ہیں

تابش صاحب کا چوتھا مجموعہ نعت، منقبت، سلام اور مرثیہ کا ہے۔ جو تقدیس کے نام سے ۱۹۸۴ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوا۔ تابش صاحب نے سرکار دو عالم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں گلہائے عقیدت پیش کئے ہیں۔ اور بزرگانِ سلف کی منقبت بیان کی ہے بشہید خنجر جفا حضرت امام حسین رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی دردناک شہادت پر رثائی کلمات ادا کئے ہیں۔ یہ مجموعہ یعنی تقدیس ان کے دینی جذبہ و احساسات کی ترجمانی کرتا ہے۔

اس کے بعد ان کا پانچواں مجموعہ دید باز دید کے عنوان سے ۱۹۸۹ء میں چھپا۔ جو ان کے نثری مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب تابش دہلوی نہ صرف غزل اور نظم کے شہسوار ہیں بلکہ نثر کے بھی مرد میدان ہیں۔ یہ کتاب ادب

منشور ہے ۔ اور اس میں انہوں نے اپنی پرانی یادداشتوں کو برجستہ قلمبند کیا ہے ۔ خاص طور سے فانی بدایونی جو ان کے استاد تھے ۔ ان سے ان کی ملاقاتوں کا تذکرہ تاریخی یادگار کی حیثیت رکھتا ہے ۔ ان میں بعض چوٹی کے شعراء کے نام ہیں ۔ جن کا شمار اب ادبی ستونوں میں ہوتا ہے ۔ اور جو زندۂ ادب ہیں ۔ مثلاً جگر مرادآبادی، جوش ملیح آبادی، یاس یگانہ، میراجی، فانی، خواجہ محمد شفیع دہلوی وغیرہ یہ وہ ہستیاں ہیں جو نقش ونگار طاق نسیاں نہیں ہوئیں بلکہ ان کے نام تاریخ ادب میں زندہ پائندہ ہے ۔ ایسے لوگوں میں ادبی اور علمی صحبتوں سے جناب تابش دہلوی کی شاعری کا تانا بانا بنا ۔ لیکن یہ تعجب ہے کہ فانی کی شاگردی کے باوجود ان کے ہاں قنوطیت نہیں ۔ بلکہ رجائیت ہے ۔ شاید اس وجہ سے کہ فانی کے ہاں قنوطیت بھی رجائی فلسفۂ حیات کا جزء ہے وہ غم میں ڈوب کر شعر کہتے ہیں ۔ اور پاتال سے موتی رول کر لاتے ہیں ۔ اسی طرح تابش صاحب بھی ۔ اپنے اشعار میں اسرار رموز حیات بیان کرتے ہیں ۔ وہ غم کو انگیز کرکے ققنس کی طرح خاکستر سے چنگاری پیدا کرتے ہیں ۔ ان کے تمام مجموعہ کلام کے نام بھی کچھ اسی طرح کے ہیں ۔ چنانچہ ان کے پہلے مجموعہ کلام کا نام مہر نیم روز ہے ۔ دوسرے مجموعہ کا نام چراغ شب کے بجائے چراغِ صحرا ہے اسی طرح غبار انجم، ماہ شکستہ کی تراکیب میں صحرا، غبار، شکستہ کے الفاظ ان کی شاعری میں ربودگی کی طرف اشارہ کرتے ہیں ۔ یعنی کوئی امید موہوم ہے جو شاعر کو صحرا میں چراغ جلانے پر اکسا رہی ہے تاکہ چراغ، انجم، اور ماہ کی روشنی سے صحرائے حیات میں اجالا ہو جائے ۔

جناب تابش ایک شاعر ہی نہیں بلکہ تہذیبی انسان ہیں وہ ہماری مشرقی تہذیب کا جیتا جاگتا نمونہ ہیں ۔ تہذیب وشائستگی ان کی رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہے جو کچھ تو ان کے ورثے میں ملی ہے ۔ اور کچھ انہوں نے بزرگوں سے صحبتوں سے حاصل کی ہے شاعری کے لیے جس تہذیب نفس کی ضرورت ہے وہ ان میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہے ان کی شاعری میں ان کی تہذیبی شخصیت کا عکس ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری تہذیب وشائستگی کا مرقع ہے ۔ قرآن مجید نے عام طور پر شعراء کی مذمت کی ہے ۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے " والشعراء یتبعھم الغاون ۃ الم تر انھم فی کل واد یھیمون ۃ وانھم یقولون مالا یفعلون " (الشعرا آیات ؛ ۲۲۴ ـ ۲۲۵ ـ ۲۲۶) لیکن اس کے بعد استثنا بھی ہے اور وہ یہ کہ اگر کوئی صاحب ایمان شاعر ایسا شعر کہتے جو حکمت ودانائی لیے ہوئے ہے ۔ تو وہ قابل مذمت نہیں ۔ اس لیے شعر عفیف کو مستثنیٰ کر دیا گیا ۔ یعنی وہ شاعری جو انسانی سماجی کردار کا معیاری علم پیش کرے اور انفرادی اور اجتماعی انسانی کردار کے صحیح مقاصد کی حقیقی اور سچی قدر وقیمت کا تعین کرنے میں ممد ومعاون ثابت ہو تو وہ شاعری درست ہے جناب تابش کی شاعری، شعر عفیف کی شاعری ہے ۔ کیونکہ ایسی شاعری حق وباطل، نیکی وبدی میں امتیاز کرنے کے طریقوں کی طرف رہنمائی کرتی ہے ۔ اور اچھائی برائی اور خیر و شر میں تمیز کرنا سکھاتی ہے ۔ ان کی شاعری حسن عمل، نیکوکاری اور اعلیٰ اقدار انسانی کی ترجمانی کرتی ہے ۔ وہ ایک اچھا پاکیزہ اور صاف ستھرا ذوق شاعری رکھتے ہیں، ان کی شاعری کا افادی پہلو ہے ۔ تہذیب ایک مثبت عمل ہے جناب تابش مظاہر فطرت کو معیار صداقت مانتے ہوئے ان میں خدا کی نشانیاں تلاش کرتے ہیں ۔ وہ انسان کو عقل، حس اور وجدان

کے امتیازی حدود بتاتے ہیں۔ مادیت اور روحانیت میں مناسبت پیدا کرتے ہیں۔ انسان کا تہذیب و شائستگی سے اور تہذیب و شائستگی کا انسان سے ربط قائم کرتے ہیں۔ یہی ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے یہی وجہ ہے کہ ان کا کوئی شعر تہذیب سے گرا ہوا نہیں ہوتا۔ وہ تہذیب و ثقافت کے دائرے میں رہتے ہوئے شاعری کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں تہذیبی، ثقافتی، معاشی اور معاشرتی پہلو ہیں۔ ان کو سامنے رکھ کر ان کی شاعری کا تجزیہ کرنا چاہیئے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ تابش صاحب نے بچپن میں گلستان بوستان، انوار سہیلی، خالق باری، اور کلام مجید کی تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ ایک باوضع انسان اور رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے۔ ان کی شاعری میں کہیں زبان و بیان، فصاحت و بلاغت تشبیہات و استعارات عروض اور صنائع بدائع میں کوئی جھول نہیں آتا۔ یہ ان کی کامیاب شاعری کی دلیل ہے اب تک ان کے چھ سات دیوان شائع ہو چکے ہیں۔ جو ان کی قادر الکلام ہونے کی غمازی کرتے ہیں۔

اب آپ ان کی غزلیات منتخب اشعار ملاحظہ کیجیئے ؎

میں سنتا ہوں مگر واقف نہیں ہوں تری آواز آتی ہے کہاں سے
قربت بھی مہجوری ہے دوری تو پھر دوری ہے
تنہا چلا ہوں منزلِ مقصود کی طرف تنگ طلب ہے راہ طلب میں کسی کا ساتھ
دریا محیطِ بحر میں دریا نہیں رہا میں بھی تری شناخت میں اپنا نہیں رہا
یہ کیا پلک جھپکتے ہی دنیا بدل گئی اب اعتبار دیدۂ بینا نہیں رہا
دل کا مٹنا ہے سانحہ لیکن ختم اک عہدِ آرزو تو ہوا
کوئی جادہ ہے نہ منزل ہے کوئی سب فریبِ راہی و رہبر، کھلا
فصلِ گل نے ہر گلِ تازہ کے ساتھ اک نیا زخمِ جنوں پیدا کیا
نیکی کا اک زمانہ میں نیکی صلہ نہیں میں خیریت طلب ہوں ہر اک خیر خواہ کا
پہلے دستِ ستمگر ہیں پیدا کوئی تو شاخ بارور ہوگی
چھوٹی پڑتی ہے انا کی چادر پاؤں ڈھکتا ہوں تو سر کھلتا ہے
جلوۂ دوست زمانے کو دکھا بھی نہ سکوں ایسا پردہ ہیں کہ اٹھا بھی نہ سکوں
بجھتے سورج کو حرارت کی ضرورت ہوگی اس لیے خود کو بھی شعلہ بجاں رکھا ہے
نہیں ہوں آبلہ پا میں ہی دشتِ وحشت میں صبا بھی ہے روشِ گل پہ خستہ پا کی طرح
کہسار کو تیشۂ انا ہوں گلشن میں سبک قدم صبا ہوں
ذروں سے تراشتا ہوں خورشید قطروں سے میں موتی رولتا ہوں
کردار میں سربسر ہوں شفاف پیکر میں تمام آئینہ ہوں
اس دعوئ آگہی کے باوصف کھلتا نہیں مجھ پہ یہ کہ کیا ہوں

دلّی والے مستند اور ٹکسالی زبان بولتے ہیں۔ تابش دہلوی نے بھی اردو کے معلّی اختیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور موضوعات اور اسلوب کے اعتبار سے اردو غزل کو فارسی غزل سے ملانے کی سعی کی ہے۔ وہ دراصل میر، درد، خواجہ میر درد اور حسن کے تسلسل کے شاعر ہیں جو کلاسیکل روایت اور شاعری میں مرزا مظہر جانِ جاناں سے شروع ہوئی تھی۔ تابش صاحب نے اس کی پاسداری کی ہے انہوں نے اصلاح شاعری کی طرف بھی توجہ کی ہے ان میں بعض خصوصیات دبستان دہلی کی پائی جاتی ہیں۔ مثلاً جذبات، احساسات، کیفیات، معاملات واقعات اور واردات کے بیان میں وہ دہلی کا تتبع کرتے ہیں۔ جہاں تک شاعرانہ صنائع بدائع کے استعمال کا تعلق ہے تو یہ چیزیں ان کے ہاں بالذات مقصود نظر نہیں آتی۔ اس کی شاید وجہ یہ ہے کہ وہ خارجی متعلقات اور لوازمات حسن کے اظہار سے بظاہر گریز کرتے ہیں۔ البتہ میر تقی میر اور خواجہ میر درد کا تصوف یا ان کے صوفیانہ مضامین ان کی غزلیات میں ملتے ہیں۔ چنانچہ دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری کا تذکرہ اپنے اشعار کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں ایک طرح کی درویشی، قلندری، استغناء، توکل اور صبر و رضا ہے۔ اس پر مستزاد ان کا تہذیبی لب ولہجہ ہے۔ ایک اور خصوصیت ان کی شاعری کی محرومی اور حرماں نصیبی ہے جو غالباً فانی کے اثر سے ان کی غزلوں میں آئی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے تکلیف کی زندگی گزاری ہے۔ ان کا دل چراغ کی مانند سوزش دروں سے جلا ہے۔ وہ حکایت جنوں نہیں سناتے البتہ درد کی سراسیمگی ان کے ہاں ہے ان کے خیال اور بیان دونوں میں سادگی ہے وہ چھوٹی بحروں میں طبع آزمائی کرتے ہیں لیکن بڑی بحروں میں بھی ان کے اشعار ہیں۔ دلّی کی تہذیب کی متانت اور سنجیدگی جو ان کی شخصیت میں ہے وہی ان کی شاعری میں ہے۔ وہ تفریح طبع کے لیے شعر نہیں کہتے۔ اور نہ قافیہ پیمائی کرتے ہیں بلکہ مشاہدہ اور واقعہ نگاری کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ ان کے دل میں قومی حمیت و غیرت ہے اس لیے انہوں نے بعض اچھی نظمیں بھی لکھی ہیں غزل کے علاوہ انہوں نے تکنیک اور موضوع کے بعض نئے تجربے کیے ہیں مثلاً انہوں نے ہائیکو بھی کہا ہے ؎

اب آپ تابش کے ہاں مختلف اساتذہ کے رنگ کے اشعار دیکھئے ؎

میر تقی میر کا رنگ ؎

میری متاع، سوز غم دل نہیں رہا　　　میں روزگار شوق کے قابل نہیں رہا

غالب کا رنگ ؎ سرگشتہ روح قیس ابھی تک ہے دشت میں

ہر چند وہ سوار وہ محمل نہیں رہا

درد کا رنگ ؎ بند آنکھوں سے دیکھ لی دنیا　　　ہم نے کیا کچھ نہ دیکھ کر دیکھا

جگر کا رنگ ؎

یہ مجھ سے کس طرح کی ضد دلِ برباد کرتا ہے　　　میں جس کو بھولنا چاہوں اسی کو یاد کرتا ہے

سودا کا رنگ ؎

قفس میں جس کے بازو شل ہوئے رزق اسیری سے　　　وہی صید زبوں صیاد کو صیاد کرتا ہے

مظہر جانِ جاناں کا رنگ ؎

کیا ہو گیا وقت کو نہ جانے لمحوں میں گذرتے ہیں زمانے

دردؔ کا رنگ ؎

دانستہ فریب ہم نے کھائے آسائشِ جاں کے سو بہانے

غالبؔ کا رنگ

تھپیڑے وقت کے کتنے سبق آموز ہوتے ہیں زمانہ بھی تو کارِ سہیلیٔ استاد کرتا ہے

مظہر جانِ جاناں کا رنگ ؎

نہیں حسنِ طلب یہ برملا کیا کہ تجھ سے مانگئے تیرے سوا کیا

مومنؔ کا رنگ ؎

نہیں لاتی ہے بوئے دوست مجھ تک شکستہ ہو گئے پائے صبا کیا

غالبؔ کا رنگ ؎

تنک آبی میں بھی ہوتا نہیں ہے تہہ کا اندازہ کہ دریا پھر بھی دریا ہے اگر پایاب رہتا ہے۔

دردؔ کا رنگ ؎ مزاجِ زیست کا ایک ایک رخ دکھاتے چلے ہم اپنی ذات سے سارے حجاب اٹھاتے چلے

جگرؔ کا رنگ ؎ قائم تو بہرحال ہے رشتوں کا توازن جو بھول گئے ہم کو وہ آتے ہیں سوا یاد

اصغر گونڈوی کا رنگ ؎

شد جہاں جلوہ گہہِ شاہدِ زیبائے بہار جلوہ ریز است بہ ہر سو قدرِ عنائے بہار

امیر خسرو کا رنگ ؎

فروغِ بزمِ حسنِ آں بتِ جاناں نہ بود اثبت رخ او شمع بود و جاں من پروانہ بود امثبت

یہ ہے تابشؔ دہلوی کی غزلیاتِ شاعری کا تنقیدی تجزیہ جو میں نے پیش کیا ہے خاص طور سے آخری دو غزلیں جو فارسی میں ہیں۔ وہ بہت برجستہ، رواں اور پرکیف ہیں ان میں خالص تغزل کا رنگ ہے۔ اس سے ان کی فارسی سے لگاؤ کا اندازہ ہوتا ہے میرے خیال سے اگر تابشؔ صاحب فارسی میں بھی شاعری کریں تو بہت اچھی شاعری کریں گے۔

ہوش امروہوی

تابش بھائی

تابش دہلوی (جنہیں میں تابش بھائی کہتا ہوں) سے میری ملاقات ۱۹۴۲ء میں امروہہ میں اپنے استاد محترم شعیب حزیں مرحوم کے توسط سے ہوئی تھی وہ امروہہ نظر امروہوی کی شادی کی تقریب میں ایک مشاعرہ میں شرکت کے لیے دہلی سے تشریف لائے تھے۔

تابش بھائی اور شعیب حزیں کی دوستی حیدرآباد دکن سے تھی۔ جب حزیں صاحب عثمانیہ یونیورسٹی کے طالب علم تھے اور ہر معاملا میں خواہ وہ نجی معاملات ہوں یا ادب اور شاعری ایک دوسرے سے بے تکلفی سے گفتگو اور مشورہ کرتے تھے اور یہ خلوص و محبت حزیں صاحب کی وفات تک قائم و دائم رہا۔ حزیں صاحب کی نسبت سے تابش بھائی مجھ سے اور زیادہ قریب رہے اور شفقت فرماتے ہیں۔

آل انڈیا ریڈیو دہلی سے میں نے پہلی بار ۱۹۴۴ء میں پروگرام کیا۔ اور یہ بھی تابش بھائی کے توسل سے۔ یہ بیرونی نشریات میں نعت خوانی کا پروگرام تھا جو ۱۹۴۷ تک جاری رہا۔

شاعری میں میری حوصلہ افزائی تابش بھائی نے ہمیشہ کی اور آج تک کرتے ہیں۔ ۱۹۷۸ء اور ۱۹۹۷ء کے درمیان جب ایک حادثہ کے نتیجہ میں شاعری سے میں نے تقریباً کنارہ کشی اختیار کرلی تھی۔ اس زمانہ میں جب بھی تابش بھائی سے ملاقات ہوتی وہ میری اس خاموشی پر کافی سرزنش کرتے تھے اور مسلسل ترغیب دیتے کہ میاں کیوں اپنی صلاحیتوں کو ضائع کر رہے ہو۔ اللہ نے تمہیں جس صلاحیت سے نوازا ہے اس کی قدر کرو اور آخر کار ۱۹۹۷ء کے اوائل میں پھر ایک اور حادثہ کے نتیجہ میں اس سکوت کو میں نے توڑا اور شاعری کی طرف لوٹا جس کے نتیجہ میں میرا پہلا مجموعہ کلام "بکھر گئی خوشبو" منظر عام پر آیا۔ اس سلسلے میں بھی میں ممنون احسان ہوں۔

تابش بھائی کی شاعری کے متعلق میں کیا کہہ سکتا ہوں وہ تقریباً ۷۷ سال سے اس میدان میں ہیں اور ہر اعتبار سے اس صنف سخن پر مکمل دسترس رکھتے ہیں۔ ان کے تلامذہ کی تعداد میری معلومات کے مطابق پاکستان کے اساتذہ میں سب سے زیادہ ہے فانی مرحوم کے شاگرد ہونے کے باوجود ان کے اشعار میں حزن و یاس

یاس اور مایوسی نہیں جھلکتی۔ ۱۹۴۲ء میں جب میں نے سنا تھا وہ فانی کے ترنم میں ہی غزل پڑھتے تھے اور بہت ہی دلکش انداز میں۔

تابش بھائی ہر لحاظ سے انتہائی با اصول اور نہایت نفاست پسند ہیں خواہ وہ لباس ہو، شاعری ہو یا دوستی۔ کھرے آدمی ہیں بغض و کینہ سے قطعاً پاک، دوستوں کے دوست۔ الحمدللہ ۸۸ سال کی عمر میں بھی نہایت چاق و چوبند، حافظہ انتہائی عمدہ اور سب سے بڑی بات ان کا خلوص اپنے ملنے والوں کے ساتھ رکھتے ہیں میں ان چند خوش نصیب لوگوں میں ہوں جنہیں ان کی شفقت و محبت بدرجہ اتم حاصل ہے۔ اللہ انہیں زندگی دے صحت کے ساتھ تاکہ ہم لوگ ان سے استفادہ حاصل کرتے رہیں۔

O

حضرت تابش دہلوی نے ایک غزل گو کی حیثیت سے اس زمانے میں نام پیدا کیا جب فانی، فراق، یگانہ، اصغر، جگر اور حسرت کے سے اساتذۂ فن کی غزلوں سے سارا برصغیر گونج رہا تھا۔ دنیائے شعر کی اتنی قد آور شخصیات کی موجودگی میں انہی کی محبوب صنف سخن میں ناموری حاصل کرنا مشکل کام تھا مگر تابش دہلوی کی غزل نے یہ کام کر دکھایا۔ اس کا سبب ان کی غزل کی بعض انفرادی خصوصیات ہیں۔ فانی کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ غالب سے متاثر تھے اور تابش کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ فانی سے متاثر ہیں۔ روایت کی تطہیر اور ارتقا کا عمل اسی طرح چلتا ہے اور چراغ سے اسی طرح چراغ جلتے چلے جاتے ہیں۔ تابش نے فانی سے غم زندگی کا گداز اور غالب سے اسرار کائنات پر فکر و تامل کا حوصلہ حاصل کیا اور یوں اپنی غزل میں درد کی تہذیب اور غم کی شائستگی کے ساتھ ساتھ حیات اور ماورائے حیات کے مسائل سے فن کی سطح پر نمٹنے کی خوبصورت اور مؤثر مثالیں پیش کیں۔ زبان کے تیور ان سب پر مستزاد تھے۔ میری دعا ہے کہ حضرت تابش دہلوی آئندہ سالہا سال تک زندہ رہیں، صحتمند رہیں، آسودہ رہیں اور غزل کہتے رہیں کہ ہمارے ہاں ایسی منجھی ہوئی غزلیں کہنے والے اب بہت کم رہ گئے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی

سرور جاوید

تابش۔ ایک تہذیبی علامت

تا سما تا بہ سمک جاتا ہوں　　　مگر اب چلتا ہوں تھک جاتا ہوں
عقل یا عشق ہے میری منزل　　　اس دوراہے پہ بھٹک جاتا ہوں
کوزہ ہوں چاک کا لیکن تابشؔ　　　تیز گردش سے درک جاتا ہوں

تابشؔ دہلوی کے ان اشعار کے پس منظر میں میرے ذہن میں ایک ایسا تخلیقی شاعر ابھرتا ہے جو زندگی سے بھرپور زمانے گزار کر تمام نشیب و فراز کامرانی سے سفر کرتے ہوئے ایک ایسی منزل آگہی پر پہنچ چکا ہے جہاں زندگی کی تمام چھوٹی بڑی حقیقتیں اس پر عیاں ہو گئی ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ کچھ سوالوں کا جواب ممکن نہیں ہے۔ عقل اور عشق کی منزل پر انسان کی قسمت میں محض حیرت ہے اور زندگی کی تیز گردش میں شکست و ریخت اس کا مقدر ہے اور یوں ہے کہ زندگی کا طویل ترین سفر طے کرنے کے بعد ایک فطری تھکن ان کے وجود کا حصہ بن گئی ہے لیکن سما سے سمک تک جانے کا حوصلہ ابھی تک باقی ہے۔

تابشؔ دہلوی کی اس تصویری تعبیر میں صرف ان اشعار اور ایسی ہی اور غزلوں کا حصہ نہیں ہے بلکہ اس کے پس منظر میں گزشتہ تقریباً ۲۷ سال سے زیادہ مدت پر محیط تابشؔ دہلوی کے بارے میں میرا شخصی مطالعہ شامل ہے جس سے میں نہ چاہتے ہوئے بھی گزرا ہوں۔ ان کے شخصی مطالعے اور ان کی شاعری کے باقاعدہ مطالعے میں میرے ارادے کا دخل نہ ہونے کا سبب یہ ہے کہ تابشؔ صاحب سے میری قربت اور ان سے براہ راست شفقت حاصل ہونے کا زمانہ کچھ زیادہ طویل نہیں ہے یہی کوئی دس گیارہ برس کا زمانہ ہے۔ مگر ان کی شخصیت کا مطالعہ میں نے غیر محسوس طریقے اسی وقت شروع کر دیا تھا جب غالباً ۱۹۷۰ء میں ان سے ریڈیو پاکستان کراچی میں ان کے کمرے میں ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ ان سے میری پہلی ملاقات جس کی غرض و غایت محض یہ تھی کہ میں اسکول براڈ کاسٹ کے کسی پروگرام کا متمنی تھا۔ بہت اچھی رہی اور اس لیے اچھی رہی کہ تابشؔ صاحب نے اس وقت مجھے بہ طور شاعر پہچاننے کی بات کی۔ اور فوری طور پر میری مدد پر آمادہ

ہو گئے۔ حالانکہ اس وقت تک میں نے محض چند مشاعروں میں بطور جونیئر شاعر شرکت کی تھی جہاں غالباً تابش دہلوی موجود تھے پہلی ملاقات میں جو اچھا تاثر میں نے تابش دہلوی کی شخصیت سے قبول کیا اس میں آئندہ زمانوں میں کمی اور بیشی ہوتی رہی۔ جس کا بنیادی سبب ان کے بارے میں مخصوص شعراء کی عام رائے تھی۔

۱۹۷۰ء کی ملاقات سے قبل میں نے بلکہ مجھ جیسے بہت سے نوآموز شاعروں نے تابش صاحب کو دور سے دیکھا تھا۔ ۶۰ کی دہائی میں ہم تابش دہلوی کو پاکستان کے بڑے مشاعروں کے ٹھیکیدار کی حیثیت سے جانتے تھے جو شعراء کی فہرست مرتب کرتے تھے اور اس طرح کے مشاعرے میں کسی بڑے سے بڑے شاعر کی شرکت یا عدم شرکت کے بارے میں ان کا فیصلہ آخری ہوتا تھا اور یہ بھی مشہور تھا کہ وہ مشاعرے میں کسی کو سینئر اور کسی کو بھی جونیئر بنا سکتے تھے۔ سنا تھا کہ ان کے ساتھ مشاعرے باز شعراء کا ایک گروپ بھی تھا۔ غرض مشاعروں پر ان کا سکہ چلتا تھا۔

ستم بالائے ستم یہ کہ کچھ مشاعروں میں تابش دہلوی کا یہ رویہ کم و بیش ہمیں نظر بھی آ گیا اور ہمیں جب یہ معلوم ہو گیا کہ تابش دہلوی بڑے بڑوں کو خاطر میں نہیں لاتے تو اس احساس کا پیدا ہونا لازمی تھا۔ کہ نئے شاعروں کے لیے ان کی فہرست میں کوئی گنجائش نہیں۔ اس تمام پس منظر کے ساتھ جب ان سے میری ملاقات ہوئی تو ان کی تھوڑی سی توجہ بھی مجھے بہت بڑا واقعہ معلوم ہوئی۔ تاہم تیسرے اسکول براڈ کاسٹ پروگرام میں جب میری طرف سے تاخیر ہوئی تو تابش صاحب نے سرد لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہہ ڈالا کہ برادر میاں ریڈیو کا نام آسان ہے مگر ENTRY مشکل سے ملتی ہے۔ اس سرد لہجے کی تپش بہت عرصے تک محسوس کرتا رہا اور اس کے بعد میں ریڈیو نہیں گیا۔ تابش صاحب نے بھی کبھی اس بارے میں مجھ سے کوئی فہمائش نہیں کی۔

مجھے تابش دہلوی سے قربت حاصل ہونے میں محشر بدایونی کا بھی حصہ ہے اور شاعر لکھنوی کا بھی ان دونوں حضرات سے مجھے قربت پہلے حاصل ہوئی تھی۔ اور دونوں نے علیحدہ علیحدہ تابش صاحب کی اتنی تعریف و توصیف کی کہ میں تابش صاحب کے بارے میں اپنے گزشتہ نظریات اور تاثرات تبدیل کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ بعد ازاں نعیم میرٹھی اور خمار فاروقی کے ذریعے جو تابش صاحب کے تلامذہ میں شامل ہیں تابش دہلوی سے براہ راست ملاقات ممکن ہو گئی اور مجھے اس خوشگوار حیرت کا سامنا ہوا کہ تابش صاحب نہ صرف یہ کہ مجھے بطور شاعر سراہتے ہیں۔ بلکہ ہر نئے اور نوجوان شاعر کا خیر مقدم کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ شاعری کے معیار پر پورا اترتا ہو۔ تابش دہلوی کے شخصی مطالعے کے غیر ارادی آغاز کی طرح ان کی شاعری کا مطالعہ بھی میں نے یونہی غیر محسوس طریقے سے شروع کر دیا تھا

ان کے اشعار طاقتِ ضبط بڑھے گی تری غمخواری سے ، پرسشِ غم سے مجھے کچھ تو سہارا ہوگا یا ہم ہوش و بے خودی کو سموئے ہوئے سے ہیں ، انجمن میں ہیں بھی تو کھوئے ہوئے سے ہیں اور ـــــ ہے بہت حوصلۂ عبرتِ ہستی تابشؔ ، کثرتِ غم میں دعا ہے کہ مری عمر دراز میرے حافظے میں اس وقت سے محفوظ ہو گئے تھے جب میں اسکول کا طالب علم تھا ۔ مگر بغیر یہ جانے ہوئے کہ یہ اشعار تابشؔ دہلوی کی تخلیق ہیں شاعری کی بات یہیں سے شروع ہوتی ہے اس طرح غیر محسوس طریقے سے قاری کے ذہن کو متاثر کرنے والے اور اس کے حافظے میں محفوظ رہ جانے والے اشعار یہ طے کر دیتے ہیں کہ ان کا خالق محض لفظوں کا بازیگر نہیں بلکہ حقیقتاً شاعر ہے ۔ تاہم پھر یہیں سے تاثراتی تنقید اور نقد و نظر کی وہ راہیں نکلتی ہیں ۔ جہاں تنقید دشمنی کے رویے کے ساتھ شاعر کو محض (CRAFTSMAN) قرار دے کر اسے مطعون کرتی ہے اور جانبدارانہ رویے کے ساتھ بے جا تعریف اور شاعر کو پیمبر کے درجے پر فائز کرنے کی کاوش کا سبب بن جاتی ہے یہ دونوں رویے ایوانِ ادب میں ہمیشہ سے موجود رہے ہیں لیکن اب میڈیا کے دور کی وجہ سے اس میں شدت آگئی ہے تابشؔ دہلوی دونوں رویوں کا شکار ہوئے ان کے تلامذہ نے انہیں بلند ترین مقام پر بٹھانے کی سعی کی اور ان کے مخالفین نے ان کی پہلی کتاب "نیم روز" پر اتنے اعتراضات اٹھائے کہ تابشؔ صاحب کو کتاب واپس لے کر اس پر نظرِ ثانی کرنے پر مجبور ہونا پڑا ۔ یہ سب کچھ ہوا مگر تابشؔ صاحب نے کبھی اپنے آپ کو اپنے اصل قدر و قامت سے کم یا زیادہ نہیں تسلیم کیا ۔

شاعر اور شاعری کے اصل قد و قامت کی بات میں نے اس لیے چھیڑی ہے کہ میں شاعر کو ایک زندہ اور گوشت پوست کا انسان سمجھتا ہوں جو تمام حسی کیفیات کے ساتھ وہ تمام خوبیاں و خامیاں رکھتا ہے جو انسان کا مقدر ہیں تاہم اس کی فکر اور تخیل کسی لمحے وجدانی سطح کو چھو لیتی ہے ۔ جس کے اظہار سے ایسے نغمے جنم لیتے ہیں کہ جو قاری اور سامع کو نئے جہانوں کی سیر کراتے ہیں ۔

تاہم یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ شعری اظہار کے لمحات وجدانی کیفیت کے لمحات ضرور ہیں مگر شاعری کا فن لفظوں کی صناعی بھی چاہتا ہے ۔ یہ دونوں باتیں بظاہر متضاد نظر آتی ہیں یعنی وجدانی کیفیت سے گزرتے ہوئے خرد کی اس منزل کو برقرار رکھنا جہاں صناعی کا خیال بھی ہو اور اسے برتنے کی فرصت بھی مگر شاعری کی منزل پر ان میں تضاد اس طرح مفقود ہو جاتا ہے کہ شاعر الفاظ کی صناعی کا فن ہوش و حواس کی کیفیت میں ایک طالب علم کی طرح سیکھتا ہے اور پھر وجدانی کیفیت کے لمحوں میں شعری اظہار کی منزل پر اسے برتتا ہے جس سے متاثر کرنے والی اور قائم رہنے والی شاعری

تخلیق باقی ہے۔

تابشؔ دہلوی شاعری کے اسی اسکول سے تعلق رکھتے ہیں جو صناعی کو شاعری کا لازمی حصہ قرار دیتا ہے لیکن شاعری کی وجدانی سطح کو افضل تر بھی سمجھتا ہے۔ انھوں نے جس سماجی دروبست کے زمانے میں شعور کی منزلیں طے کیں۔ اور شاعری کے کوچے میں وارد ہوئے۔ وہی زمانہ تھا کہ جب شاعری سماجی اقدار کا حصہ تھی اور شعری ذوق اور شعری اظہار علمی گھرانوں کا طرۂ امتیاز بلکہ علم سے وابستگی کی پہچان تھا اور شعری تربیت گویا تعلیم کا حصہ تھی۔ تابشؔ دہلوی شعری تربیت کی سبق در سبق مشق سے بھی گزرے اور تخلیقی قوت کی آبیاری کے لیے انہیں فانیؔ بدایونی کی صحبت اور سرپرستی بھی میسر آئی۔ اور اس زمانے کے نابغۂ روزگار شعرا و ادبا پر مشتمل حیدر آباد کے ادبی ماحول میں منعقد ہونے والی محفلیں بھی انہیں نصیب ہوئیں۔ جو ۱۹۴۰ء تک جاری رہیں۔ اور اس کے بعد ان کے وجود کا حصہ بن گئیں۔ ان محفلوں کی یادیں ۱۹۴۰ء کے بعد ان کی دلی میں واپسی اور پھر ہجرت کے بعد کراچی تک بلکہ آج تک ان کے ہمراہ ہیں۔ انہیں رفاقتوں کا اثر ہے جنہوں نے انہیں PERFECTIONIST. یعنی شعری اظہار میں تکمیل پسند بنا دیا۔ جب وہ کہتے ہیں کہ شاعری الفاظ کی بازیگری ہے اور صناعی شاعری کا زیور ہے۔ اور جب وہ کہتے ہیں کہ میاں سرور، شعری کاوش میں تسلسل برقرار رکھو کہ یہی اس سفر کا زادِ راہ ہے۔ اور جب وہ کسی شاعر کی غزل پر تبصرہ کرتے ہوئے لطیف انداز میں پھبتی کستے ہیں کہ میاں ایک دو شعر تو خود غزل بھی عطا کرتی ہے تو گویاں وہ اپنے اس نظریئے کی تبلیغ کرتے ہیں کہ شعری اظہار میں پر خلوص کاوش اور اک گونہ بے خودی کے ساتھ شعری اظہار کا تسلسل وہ وجدانی کیفیت کے لمحے عطا کر سکتا ہے جس سے شاعری وجود میں آتی ہے اور یہ کہ کسی عام سطح کے شاعر کو بھی ایسے اشعار کی تخلیق کا موقع مل جاتا ہے جو مقبول ہو سکیں۔ اگر وہ شعری کاوش میں خلوص رکھتا ہو۔ تابشؔ اپنی تحریروں کے آئینے میں اس بات کے داعی نظر آتے ہیں کہ شاعری اپنی منزل پر اسی وقت پہنچتی ہے۔ جب اس میں خیال کی بلندی اور معنی آفرینی کے ساتھ ایسی صناعی موجود ہو۔ کہ وہ قاری کو اپنے حصار میں سمیٹ سکے۔

مجھے نہیں معلوم کہ تابشؔ دہلوی PEREECTION-ISM کی منزل پر کس طرح پہنچے کیوں کہ یہ سارا قصہ میری پیدائش سے پہلے کا ہے۔

مگر یہ تابشؔ دہلوی کے اسی نظریئے کا مرہونِ منت ہے کہ ان کا پہلا شعری مجموعہ "نیم روز" انتہائی تاخیر کے ساتھ ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔ جب انہیں یقین ہو گیا تھا کہ ان کی شاعری فن کی سطح پر ہر عیب

سے پاک ہے۔ یہ بھی پرفیکشن ازم کا اثر تھا کہ انہوں نے اغیار کی رائے کا احترام کرتے ہوئے اس پر نظر ثانی کر ڈالی۔

پرفیکشن ازم سے فکری رویے کی بنا پر تابشؔ دہلوی کے یہاں فنی پختگی کے مظاہر نظر آتے ہیں۔ لفظوں کے استعمال پر دسترس، لفظی اور معنوی دروبست کے ساتھ دل کو چھو لینے والے اشعار اور زندگی کے عام حقائق کی بنت کے ساتھ مرتب ہونے والی شاعری اور زندہ رہنے والی شاعری ان کے کلام کا قابلِ ذکر حصہ ہے۔ لیکن تابشؔ دہلوی کا کلام ایک خاص ذہنی معیار کے قاری کا متقاضی بھی یوں ہے کہ جس طرح شعری تخلیق وجدانی کیفیت میں وجود میں آتی ہے۔ اسی طرح ایک دوسری نوعیت کی وجدانی کیفیت کے سہارے ہی قاری کسی شاعری سے محظوظ اور متاثر ہونے کے عمل سے گزرتا ہے۔

بات یہ ہے کہ اتھلے رومانی جذبات کی شاعری نوجوانوں اور نوآموزوں کو کچھ دنوں کے لیے متاثر کرتی ہے لیکن مکمل اظہاریت کے ساتھ فکر وتخیل کی آمیزش اور لفظوں کی صناعی سے ملو شعری زندگی کے چھوٹے بڑے حقائق کے اظہار کا موثر منظر نامہ ہونے کی وجہ سے ایک خاص تفہیمی معیار کے قاری کی تلاش کرتی ہے اس لیے کہا جاتا ہے کہ کوئی غزل کبھی کبھی کھلتی ہے یعنی جب قاری کی وجدانی کیفیت تخلیق کار کی وجدانی کیفیت سے متصل ہو جاتی ہے تو شاعری میں معنی کی تہہ در تہہ سطحیں کھلتی چلی جاتی ہیں۔ اسی لیے تابشؔ دہلوی کے کلام کا مطالعہ بھی ایک خاص ذہنی معیار ایک خاص وجدانی کیفیت مانگتا ہے۔

تابشؔ دہلوی کی غزل لفظوں اور اصطلاحوں کے استعمال کے آئینے میں روایت سے بھرپور طور پر متصل ہے ان کی شاعری جب دھیمے پن کے ساتھ مطالعے کا حصہ بنتی ہے تو اس میں معنی کے در باز ہوتے چلے جاتے ہیں۔ تابشؔ کی غزل ایوان شاعری سے سرسری طور پر گذرنے والوں کے لیے بے کار ہے مگر ان کے لیے سرمایۂ حیات ہے جو شاعری کو ایک سنجیدہ قدر کی صورت جانتے ہیں اور پڑھتے ہیں۔ نیم روز سے ماہِ شکستہ اور دھوپ چھاؤں تک تابشؔ دہلوی کی غزل ایک پختہ کار شاعر کی روایت کی چاشنی سے بھرپور غزل ہے۔ جس میں فکر کی خوشبو بھی ہے اور جذبے کی حدت بھی۔ ان کے پرفیکشن ازم پر پختہ ایمان کی وجہ سے روایت سے روگردانی کرنے کی بے راہ روی اور صناعی سے منکر ہو کر بے رنگی اختیار کرنے کی روش کہیں نہیں پائی جاتی۔ کچے مصرعے کے خوگر اور روایت کو شجر ممنوعہ جاننے والے نام نہاد شاعر اور قاری تابشؔ کے خلاف ہیں تو ہوا کریں کہ تابشؔ دہلوی کا مخاطب ادب کے سنجیدہ قاری ہیں۔ اور شعری اظہار میں روایت کی پاسداری اور فن کارانہ صناعی کے سبب سے

ستائش کی پرواہ کے بغیر شعری تخلیق ان کا مقصد ہے ۔

تابش کی شاعری نے ان کی طویل العمر شعری سفر کے ہر زمانے میں لوگوں کو متاثر کیا ہے اور آج بھی ان کی شاعری کا یہ فیض جاری ہے ۔ طویل عمر پانے والے تخلیق کار کی حیثیت میں تابش دہلوی نے کئی عہد دیکھے اور گزارے ہیں ۔ ہوتا یوں ہے ایک دور سے دوسرے دور میں داخل ہونے کا عبوری زمانہ شاعر اور قاری میں تھوڑی سی دوری پیدا کر دیتا ہے ۔ تابش دہلوی کے ساتھ ایسا کئی بار ہوا لیکن بہت جلد نئے دور میں ان کا رشتہ قاری سے بحال ہو گیا ۔ کہ روایت سے مملو شاعری ہر زمانے کے قاری سے رابطہ قائم کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے ۔ تاہم ان عبوری زمانوں میں جو مختلف ادوار میں آتے رہے تابش دہلوی کو ان کے مخالفین نے تنقید بلکہ طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا ہے ۔ ایسے مواقع پر تابش کا PEFECTIONISM ان کے کام آیا ——— اور تابش ہر زمانے میں ان شعراء کی فہرست میں شامل رہے ہے ۔ جنہیں بصد شوق پڑھا جاتا ہے اور جن کی شاعری غیر محسوس طریقے سے پڑھنے والے کے شعور کا حصہ بن جاتی ہے ۔

نیم روز سے ماہ شکستہ اور دھوپ چھاؤں تک ان کی غزل اہل دل کے لیے سرمایۂ حیات ہے ۔ ان کی غزلوں سے کچھ اشعار کا انتخاب اس لیے پیش کرنا ضروری ہے کہ ان کی شاعری کے استحسان میں آپ بھی فوری طور پر شریک ہو سکیں ۔

جانے کو کہاں نکل گئے ہم — دل ٹھہرا جہاں ٹھہر گئے ہم
یہ آمد و شد نفس نفس کی — ہر بار جئے کہ مر گئے ہم
پھر کچھ بھی نہ تھا بجز تحیر — اس تک تو نظر نظر گئے ہم
آئے تو ہوائے تازہ لیکن — تنکوں کی طرح بکھر گئے ہم

جب تذکرۂ حسن کا در باز کیا ہے — اک اک نگہ شوق کو آواز کیا ہے
کیوں کر نہ ہو سرمایۂ ہستی میں اضافہ — ہم نے ترے ہر غم کو پس انداز کیا ہے
ارباب جنوں ہی نظر آئے ہیں ہر اک سمت — جب کار گہ عقل کا در باز کیا ہے
اے واسطہ دید تجھے دیکھا ہے ہم نے — ایک ایک نظر کو نظر انداز کیا ہے

جو لائیں حوادث کی تاب کتنے ہیں — ہوائے تند کے رخ پر حباب کتنے ہیں
خوشا آئیں تجھ کو یہ نظارے دیدۂ بیدار — مگر جو لوٹ گئے ہیں وہ خواب کتنے ہیں

سکون نصیب تو ہوگا مگر دلِ بیتاب
اب اور مرحلۂ اضطراب کتنے ہیں

بارِ حیات اٹھایئے تنہا اٹھایئے
یہ بوجھ آپ سے نہیں اٹھتا، اٹھایئے
وحشت میں خاک اڑانی ہی مقصود ہے تو پھر
اک مشتِ خاک کیا سرِ صحرا اٹھایئے

عذاب لوٹے دلوں کو ہر اک نفس گزرا
شکستہ پا تھے، گراں مژدۂ جرس گزرا
کشاکشِ غمِ آزادی و اسیری میں
ہر آشیاں پہ کوئی عالمِ قفس گزرا

مآلِ شوقِ دلِ بے قرار کیا ہوگا
یہ دردِ دل کہ ہوا بار بار کیا ہوگا
تمام زیست عبارت ہے نامرادی سے
اب اور اے دلِ امیدوار کیا ہوگا
بہت ہے عبرتِ ہستی کا حوصلہ تابش
اس ایک رنجِ محبت سے پار کیا ہوگا

خلوتِ حسن سے لے تو بھی اٹھا پردۂ ناز
نام لے کر ترا ہم نے تجھے دی ہے آواز
ایک ہی بات ہے جلوہ کہیں یا نظارہ
دل ہے ہنگامۂ طلب ورنہ حقیقت نہ مجاز

ہے بہت حوصلۂ عبرتِ ہستی تابش
کثرتِ غم میں دعا ہے کہ مری عمر دراز

ایک بھی نقشِ تمنا کا سنور نے نہ دیا
دیدۂ تر نے کوئی رنگ بھی بھرنے نہ دیا
جورشِ غم میں مجھے حاصل نہ سکوں ہے نہ اجل
چڑھتے دریا نے کسی گھاٹ اترنے نہ دیا
جاں سپاری کا صلہ عمرِ ابد خوب ہوئی
تو نے بھی مرگِ محبت مجھے مرنے نہ دیا

(نیم روز ۱۹۹۲ء • چراغِ صحرا ۱۹۸۲ء • غبارِ انجم ۱۹۸۴ء
تقدیس ۱۹۸۴ء • دیدہ بازدید ۱۹۸۹ء • ماہ شکستہ ۱۹۹۳ء
دھوپ چھاؤں ۱۹۹۶ء)

تابش دہلوی کی شاعری میں فنی پختگی کا جو عنصر اول تا آخر نظر آتا ہے وہ ان کے سوچے سمجھے رویے کا مظہر ہے۔ ۱۹۶۳ء میں پہلے مجموعے کی اشاعت کے بعد دوسرے مجموعے چراغِ صحرا کی اشاعت

۲ سال بعد یعنی ۱۹۸۲ء میں ممکن ہوئی تاہم اس وقت تابش صاحب کو غالباً اپنی پختگی کا یقین آچلا تھا اسلئے ۱۹۸۴ء میں "غبار انجم" منصۂ شہود پر آگئی۔ جس کے بعد انہوں نے مذہبی شاعری پر توجہ کے ساتھ نثر پر بھی توجہ کی اور اپنی ذاتی یادداشتوں کی بنیاد پر نثری اظہار کا ایک خوب صورت مجموعہ ترتیب دے دیا یعنی دیدہ باز دید اور پھر انکی تازہ ترین کتاب یعنی شعری مجموعہ دھوپ چھاؤں ۱۹۹۶ء میں شائع ہوگئی

تابش صاحب اس وقت ۸۰ برس کی عمر کو پہنچ گئے ہیں اور ان کا شعری سفر جاری ہے ان پر یہ الزام درست ہے کہ پرانی لغت کے استعمال اور فنی مہارت کے ضرورت سے زیادہ زور دینے کی بنا پر کہیں کہیں ان کا کلام بے رنگ ہوجاتا ہے اور ان کی کچھ غزلوں پر اداسی طاری ہوجاتی ہے مگر یہ بھی درست ہے کہ اسی اداسی کے دوران یکایک ایک شعلہ سا لپکتا ہے۔ فکر اور خیال کا شعلہ جو پوری غزل کو روشن کرتے ہوئے پڑھنے والے کے ذہن کو روشن کردیتا ہے۔ تابش کے کلام میں کہیں کہیں اس اداسی کی کیفیت کو بنیاد بنا کر ان کے مخالفین نے خاصا واویلا مچایا اور اسے بے رنگی قرار دے کر گویا تابش کو ان کے مرتبے سے گرانے کی کاوش کی ہے۔ مگر ایسی تمام کاوشیں بے سود ہیں بلکہ ان سے تابش دہلوی کو مزید تقویت ملی ہے کیوں کہ اس سے ان کی فکر کو مہمیز ملتی ہے اور ان کی شاعری میں تفکر کا عنصر بڑھتا جاتا ہے۔

بات اگر شخصی مطالعے اور میرے ذاتی مطالعے تک محدود ہوتی تو میں ان جملہ ہائے معترضہ کو یہیں ختم کردیتا لیکن اس مضمون کی اشاعت کے بعد بہت سے سوالات اٹھائے جانے کے اندیشے کی وجہ سے مجھے اس ضمن میں مزید یہ عرض کرنا ہے کہ تابش دہلوی کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے ان کی طویل العمر شاعری کو بھی ملحوظ خاطر رکھا جانا چاہیئے۔ شعری سرمائے اور ادبی تخلیقات کا مطالعہ کرتے وقت اس عہد اور اس کے مروجہ رجحانات کا کماحقہ تصور بھی ضروری ہے جس زمانے میں وہ شاعری یا ادبی شہہ پارہ وجود میں آیا تھا کیوں کہ ایک عہد کی مقبول ترین شاعری دوسرے عہد میں آکر اکثر بے رنگی اختیار کرلیتی ہے۔ کسی شعری سرمائے کا تقریباً تیس فیصد حصہ بھی اگر نئے عہد میں قبولیت کی سند حاصل کرتا ہے۔ تو ایسے شاعر اور ادیب کی مستحکم حیثیت قابل تسلیم ہوجاتی ہے تابش کے مخالفین بھی جانتے ہیں کہ تابش کی نیم روز کی شاعری اور ماہِ شکستہ کی شاعری کا پچاس فیصد سے زیادہ حصہ آج بھی قبولیت اور متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہی بات ان کی شاعرانہ حیثیت اور ان کے اصل قدو قامت کے تعین کے لیے کافی ہے۔ نیم روز اور ماہ شکستہ کے منتخب کلام کا محض کچھ حصہ میں نے اپنے مضمون میں شامل کیا ہے جس کا سبب اختصار کی ضرورت ہے

وگرنہ کچھ اور چاہیے وسعت ـــــ مجھے بیان کے لیے ۔

تابش دہلوی نے مسعود تابش کی حیثیت سے اپنے شعری سفر کا آغاز حیدرآباد دکن میں اپنے قیام کے دوران کیا تھا جہاں انہیں فانی بدایونی کی سرپرستی اس طرح میسر آئی کہ وہ فانی کے گرویدہ ہو گئے بلکہ عاشق ہو گئے فانی کی شاعری کے مطالعے میں وہ اتنے غرق ہوئے کہ فانی کی بظاہر حزن پرستی اور درد پسندی میں چھپی ہوئی رجائیت کو تلاش بھی کیا ۔ اور فانی کے شعور و غم کے حوالے سے ان کے فنی استحسان اور ان کی شاعرانہ عظمت کے اعتراف کے لیے کئی مضامین لکھ ڈالے ۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ وہ اپنی شاعری میں فانی کے بجائے غالب کے طرف دار نظر آتے ہیں ۔ غالب کی مشکل پسندی اور طرح داری ان کی شاعری کی طرح ان کے مزاج میں بھی نظر آتی ہے تاہم فانی کی دردمندی کے عنصر نے اس کے پہلو بہ پہلو تابش کی شاعری میں ایک پرتاثیر فضا قائم کر دی ہے ۔

غالب کی شخصیت کا نمایاں اثر اس طرح ہوا کہ تابش تکمیل پسند بھی بن گئے اور غم و آلام سے نہ ہارنے والے کی صفت بھی ان میں پیدا ہو گئی ۔ نہ ستائش کی تمنا اور صلے کی پرواہ بھی ان کے مزاج کی حصہ بن گئی ۔ اور اپنے شعری قد و قامت پر اتنا بھروسہ ہو گیا کہ انہوں نے اپنے آپ کو اس تفکر سے آزاد ہی کر لیا ۔ تاہم یہ فانی کا اثر تھا کہ وہ انتہائی انکسار پسند بن گئے ۔ تابش صاحب سے جب بھی ان کی شاعری کی تعریف میں کچھ کہا جائے تو وہ کہتے ہیں " اماں ہٹاؤ " سرور میاں اپنے بارے میں کوئی غلط فہمی یا خوش فہمی کبھی نہیں رہی ۔ بس شعر لکھتا ہوں اور مشق سخن جاری رکھتا ہوں کیا میں کیا میری شاعری بس یہ تو تم لوگوں کا حسن نظر اور حسن سماعت ہے بھئی شعر تو نئے لوگ لکھ رہے ہیں ۔ تم سمیت ـــــ مگر میاں تم سنجیدہ نہیں ہو ۔ دیکھو بھائی معاشیات کا اصول ہے کہ کھوٹے سکے کھرے سکے کو بازار سے بھگا دیتا ہے ۔ یاد رکھو بازار شاعری میں کھوٹے سکے بہت آ گئے ہیں ۔ اپنی شاعری کو چھپواؤ کتابیں شائع کرو ۔ کھوٹے سکے کے لیے میدان خالی مت چھوڑو ۔

کھوٹے سکے پر اعتراض کی بات کھوٹے سکوں پر بہت شاق گزرتی ہے اس لیے تابش صاحب کے کھوٹے سکے کے تصور کو سمجھے بغیر ان سے اختلاف برائے اختلاف کی روش اختیار کرتے ہوئے ان کی روایت پسندی اور شاعرانہ صامتی کے نظریئے کی بلاوجہ تکذیب شروع کر دی جاتی ہے اور کبھی کبھی مجنونانہ صدا بلند ہو جاتی ہے ۔ کہ کراچی میں تو لوگ تابش کو بھی شاعر سمجھتے ہیں ۔ تابش کے انکار کی یہ سطح تابش کا انکار نہیں ہے بلکہ ایک شعری نظریے کا انکار ہے اور یہ کہنے والے کی ذہنی کم مائیگی کا ثبوت ہے تابش جس شعری نظریئے کے حامل ہیں وہ ایک مستقل اور مستحکم تہذیبی فکر سے تعلق رکھتا ہے جس

کی آبیاری دلی اور دکن کے ادبی ماحول میں مستحکم ثقافتی پس منظر میں ہوئی۔ یہ نظریہ جس میں شاعری تخیل کے ساتھ صناعی کی بھی خواست گار ہے بین الاقوامی ادبی اصولوں کا حصہ ہے بعض اوقات مروجہ اصولوں کو توڑنے کی بات اس لیے کی جاتی ہے کہ نئی روایات کو جنم دیا جا سکے۔ جس کا انت بھی روایت سے رشتہ جوڑنا ہے۔ کم فہم لوگ اپنی علمی کم مائیگی کی وجہ سے آفاقی روایات کو توڑنے کی کاوش میں محض اپنے آپ کو زخمی کر لیتے ہیں۔ اس سے تابشؔ کی روایت پسندی اور روایت پسندی کی روایت کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔

تابشؔ ایک تہذیبی روایت کی پیداوار بھی ہیں۔ اور اس تہذیب کی آخری علامتوں میں سے ایک علامت بھی۔ اچھے شعراء کو سراہنا، اچھے شعراء کی تعریف کرنا اور بری شاعری اور برے شاعر کو ببانگ دہل تسلیم نہ کرنا ان کی طبیعت کا خاصہ ہے۔ تہذیبی روایات کے ایک خوشگوار نشان کی حیثیت میں تابشؔ کی شخصیت میں ایک ایسی جاذبیت نظر آتی ہے جو اس ملک کے بہت سے مشہور اور بہت زیادہ مقبول شعراء کو نصیب نہیں۔ یہ جاذبیت، روایت پسندی اور روایت سے منسلک رہنے کا ثمر ہے۔

یہی تہذیبی ورثہ انہیں اپنے خاندان سے بھی ملا اور فانیؔ و دیگر مشاہیر ادب کی صحبتوں سے بھی ملا ہے۔ فانیؔ کے عشق میں وہ نثر لکھنے پر مجبور ہوئے اور اس طرح ان کے نثری مضامین کے موضوعات پھیل گئے۔ اور نثری مضامین کا ایک قابلِ قدر مجموعہ ترتیب پا گیا جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ تعریف کیے بنا نہیں رہا جا سکتا۔ اس طرح تابشؔ کے فن پر گفتگو کرتے ہوئے ان کی نثر کا حوالہ ضروری ہو جاتا ہے۔ نثر کی تعریف کے علائم، شاعری کی طرح واضح نہیں ہیں اس لیے اچھی نثر کی خوبیوں کو محض نثر کے مطالعے سے ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ تابشؔ کی نثر کے کچھ نمونے ملاحظہ فرمائیں تاکہ آپ میری تائید کر سکیں۔

تابشؔ نے اپنے مضمون "محشر بدایونی ایک جائزہ" میں جو محشر کے اعزاز میں تقریب میں پڑھا گیا مضمون کا اختتام اس طرح کیا۔

> "بحر بیکراں کے لیے سفینہ درکار ہوتا ہے اور یہاں سفینے کے ساتھ ہمت بھی نہیں ہے وقت تھوڑا اور باتیں زیادہ۔ میں پہلی بات دہرانا چاہتا ہوں پان اور غزل اصل میں دونوں ایک ہیں اور محشر بدایونی انہیں دونوں سے عبارت ہیں وہ پان بہت کھاتے ہیں اور خوب غزلیں کہتے ہیں۔ پان ہمارا تہذیبی ورثہ

ہے اور غزل ہماری تہذیب کی ترجمان اور نمائندہ" وہی غزل گو بڑا شاعر ہے جس کا تہذیبی ورثہ بڑا ہے۔"

حیدرآباد کی یادوں پر مشتمل مضمون "جب میں حیدرآباد میں تھا" میں تابش نے لکھا ہے۔

"میں متاثر ہوتا ہوا چھوٹی لائن سے اورنگ آباد سے گزرتا حیدرآباد پہنچا۔ یہ ۱۹۳۵ء کا واقعہ ہے لیکن کل کی بات معلوم ہوتا ہے۔ ماضی ہمیشہ خوب صورت ہوتا ہے اور خوب صورت ماضی ہو تو خوب صورت تر۔ ــــ حیدرآباد کا شہر بڑے بڑے تالابوں اور اونچی نیچی پہاڑیوں سے گھرا ہوا نہایت خوب صورت شہر ہے ریاست حیدرآباد کی زمین بھی اونچی نیچی ہے۔ کہیں میدان کہیں چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں، کہیں سبزہ کہیں زمین بالکل بنجر اور غیر آباد۔ برساتی ندی، نالوں کی اس سرزمین نے تاریخ کے سینکڑوں بہاؤ دیکھے ہیں۔ بودھوں کا تقدس، راجہ نل کا جاہ و جلال، رام اور سیتا کا بن باس، ایرانی اور عرب تاجروں کی آمد، قطب شاہی، بہمنی اور برید شاہی سلطنتوں کا عروج و زوال مغلوں کی تگ و تاز، انگریزوں کی فریب کاریاں، غرض مختلف تہذیبوں کے سینکڑوں دھارے اس سرزمین میں خشک ہو چکے ہیں۔"

"فانی اب ملے پلی کے مکان میں منتقل ہو چکے تھے۔ شام کو ان کے گھر کے سامنے میدان میں دس بارہ کرسیاں بچھا دی جاتیں اور احباب و شعراء کا اچھا خاصا مجمع ہو جاتا۔ یہ محفلیں رات کے دس گیارہ بجے تک جمی رہتیں۔ انہی محفلوں میں غالب کے طرف داروں کے موجودگی میں غالب کے کلام پر اصلاحیں دی گئیں انہیں صحبتوں میں نظیر اکبر آبادی کو عوامی شاعر کہہ کر ایک تحریک کی صورت دی گئی۔ اور انہیں محفلوں میں میر اور غالب کی شاعری میں گلہری اور ریچھ کا بچہ تلاش کرنے کی کوشش کی گئی۔ انہی انجمن آرائیوں میں جوش اور علی اختر کے شعری موازنے کی بنیاد رکھی گئی۔ اور انہیں محفلوں میں تنک کو حسد میں بدلتے ہوئے دیکھا گیا۔ غرض یہ پر لطف محفلیں اب نقش و نگار طاقِ نسیاں ہو چکی ہیں۔"

اردو شاعری میں ساقی کا کردار میں تابش دہلوی رقم طراز ہیں ۔

" ایرانی نژاد ساقی نگارستان ہند میں جلوہ گر ہوا ۔ اساتذہ سخن نے ہاتھوں چھاؤں پروان پڑھایا ۔ دیکھتے دیکھتے چار دانگ ہند پر چھا گیا ۔ محبت کی محفلوں اور حسن کی مجلسوں میں اس کا جلوہ عام ہوا اور ہر طرف اسی کے نام کا سکہ رواں ہونے لگا ۔ عشاق کے جھگڑے ، حسینوں کے پرے ، اغیار کی صحبتیں ، شیخ وصوفی کی خلوتیں بھی اسی کے ذکر سے گونجنے لگیں ۔ لوگوں نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق اسے اپنے دلوں میں جگہ دی ۔ کسی نے عشاق کا ہمدرد اور خیر خواہ سمجھا ، کوئی اس کو ، بزم گلرخاں کا انمول رتن سمجھنے لگا ۔ کسی نے رقیبوں کا محرم راز اور جاسوس جانا کہ خود ساقی میں اس قسم کی تمام صلاحیتیں موجود تھیں ۔ غرض ساقی کی ذات جامع الکمالات مانی گئی ۔ شیخ و زاہد سے بھی دوستی رہنے لگی ۔ البتہ اکا دکا پیران جہاندیدہ نے ذرا شبہ کی نظر دیکھا ۔

مجھ تک کب اس کی بزم میں آتا تھا دور جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں "

تابش دہلوی ۷۸ سال کی عمر میں بھی جواں نظر آتے ہیں ۔ یعنی چال جیسے کڑی کمان کا تیر ہے اور ذہن چاق وچوبند ہے ۔ ان کی شاعری میں اس عمر میں بھی عمودی ترقی نظر آتی ہے اور اب وہ شاعری کی اس سطح پر نظر آتے ہیں ۔ جو قبول عام کی سند رکھتی ہے اور اہل دل اور اہل نظر کے لیے سرمایہ فکر ہے ۔ تابش دہلوی اردو شاعری کی ایک خاص روایت اور ایک خاص فکری اور لفظی دروبست سے وابستہ ہیں ۔ مگر ان کی شاعری قاری سے ہمیشہ رابطے میں رہی ہے ۔ شعروادب سے فکری اور ثقافتی سطح پر تعلق رکھنے والے سنجیدہ قاریوں کے لیے ان کی شاعری بلاغت اور INSPIRATION رکھتی ہے ۔ تاہم غیر تہذیب یافتہ نام نہاد شاعروں اور ادیبوں اور نام نہاد قارئین کے لیے اس میں کوئی جاذبیت نہیں ہے ۔ یہ شعری روایت سے منسلک ہونے کا ثمر ہے کہ وہ نعتیہ ، منقبتی شاعری میں بھی اعلیٰ سطح برقرار رکھتے ہیں ۔

نظم ہستی میں توازن کے لیے ساری دنیا اور تنہا مصطفیٰ
یوں مجھ کو اڑا لے گئیں طیبہ کی ہوائیں پس خاک مدینہ تھی مری خاک سے آگے

تابش دہلوی کا تخلیقی شعور

تابش دہلوی پر گفتگو کا بنیادی حوالہ ان کی شاعری ہے۔ لیکن یہ بھی ایک امر حقیقت ہے کہ پاکستان میں اردو شاعری بالخصوص غزل پر گفتگو کا ایک معتبر حوالہ خود تابش دہلوی ہیں۔

ہر تخلیق اپنے خالق کی شخصیت کا آئینہ بھی ہوتی ہے اور اس کی شخصیت کے تعارف کا قرینہ بھی۔ یہی حال تابش صاحب کی شاعری کا ہے جس کی فنی مسافت تقریباً سات دہائیوں کے زمانی عرصہ پر پھیلی ہوئی ہے لیکن جب ہم ان کے مطبوعہ شعری مجموعوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ستر برس کا یہ زمانی طول ایک ایسے عمیق تخلیقی لمحہ میں تبدیل ہو جاتا ہے جس میں نیمروز کی تمازت بھی ہے اور غبار انجم کی لطافت بھی، چراغ صحرا کی روشنی بھی ہے اور تقدیس کی تجلی بھی، اپنی کیفیات کے اعتبار سے یہ لمحہ بیک وقت دھوپ بھی ہے اور چھاؤں بھی، دھوپ جو روشنی اور حرارت کی علامت ہے اور چھاؤں جو ٹھنڈک اور سکون کی ضمانت۔ اپنی شاعری کی طرح تابش صاحب کی شخصیت بھی انہی کیفیات کی حامل ہے، ان کی شخصیت کی وحدت یک رنگی کا سپاٹ پن نہیں بلکہ نیرنگی کا توازن و اعتدال ہے، یہی توازن و اعتدال ان کی شخصیت کا حسن ہے اور یہی ان کی زندگی کا توازن میر کا شعر ہے ؎

مرے سلیقہ سے میری نبھی محبت میں ؛ تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

فانی کے ہاں میر کا یہ سلیقہ غم کے جبر کو اختیار میں بدلنے کا قرینہ بن گیا ہے۔

غم بھی گذشتنی ہے خوشی بھی گذشتنی ؛ کر غم کو اختیار کہ گذرے تو غم نہ ہو

غم کے جبر کو اختیار میں بدلنا بڑے حوصلہ کا کام ہے، یہ وہ حوصلہ ہے جو انسان پر روحانی ترقی کے دروازے کھول دیتا ہے۔ تابش صاحب کے بقول انہوں نے فانی سے یہ سبق حاصل کیا کہ "درد کو روحانی بنانا ترقی ہے" ہماری دینی اور تہذیبی روایت میں یہ سبق ایک نہایت مقدس اور محترم مقام رکھتا ہے۔" بقول اقبال ؎

غریب و سادہ و رنگین ہے داستانِ حرم ؛ نہایت اس کی حسینؑ ابتداء ہے اسمٰعیلؑ

اسی عظیم روایت کی میراث بقدر ظرف تابش صاحب کے بھی حصّہ میں آئی ہے۔

دولتِ سوز دلکشا پائی ؛ ہم نے ورثہ میں کربلا پائی

ہم کو تہذیبِ غم نصیب ہوئی ☆ ہم نے تعلیم ارتقا پائی
دل بھی روشن ضمیر بھی روشن ☆ آئینہ آئینہ جلا پائی

یہ دولتِ سوز دلکشا' یہ تہذیبِ غم' یہ دل و ضمیر کی روشنی اگر خوش بختی نہیں ہے تو اور خوش بختی کیا ہے اس لئے تاباؔں دہلوی مقطع میں مطلع کے مصرعۂ ثانی پر اس طرح مصرعہ لگاتے ہیں

کتنے خوش بخت ہم بھی ہیں تاباؔں ☆ ہم نے ورثہ میں کربلا پائی

یقیناً تاباؔں صاحب کی یہ خوش نصیبی خود ان کے اپنے لئے قابلِ فخر ہے اور دوسروں کے لئے قابلِ رشک حضرت تاباؔں کو اپنی متاعِ غم پر ناز ہے اور ان کے ناز کا جواز یہ ہے کہ وہ اس متاعِ غم کی قدر و قیمت کا شعور بھی رکھتے ہیں۔

اب دولت دارین ہے قسمت اسی غم کی ☆ جس غم پہ مرے دل نے بہت ناز کیا ہے

شعورِ غم تاباؔں دہلوی کی تہذیبی میراث ہے اور یہی ان کے فن کا اثاثہ' اس مرحلہ پر مختصراً ایک نکتہ کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے' اپنی کتاب دھوپ چھاؤں کا انتساب حضرت فانی بدایونی کے نام کرتے ہوئے جناب تاباؔں اس طرح رقم طراز ہیں۔

مخدوم و محترم حضرت فانی بدایونی کے نام' جنہوں نے مجھے یہ سبق بھی دیا۔

" درد کو روحانی بنانا ترقی ہے

لیکن اپنے نثری مضمون فانی اور ان کا عمومی احساس میں انہوں نے یہ صراحت کی ہے کہ یہ قول ALL PROGRESS IS THE SPIRITUALISATION OF PAIN یعنی درد کو روحانی بنانا ترقی مشہور فلسفہ نطشہ کا قول ہے۔ نطشہ کے فکر و فلسفہ سے آگاہی رکھنے والے اس حقیقت سے ناآشنا نہیں اس کی فکر میں ترقی اور روحانیت کا تصور فکرِ اسلامی کے تصور سے نہ صرف مختلف بلکہ متضاد ہے' نطشہ کے نزدیک انسانیت کی ترقی اور کمال کا ہدف یہ ہے کہ وہ فوق البشر بن جائے۔ فوق البشر (SUPER MAN) بنا کے لئے ضروری ہے کہ وہ زندگی کے آلام و مصائب سے مغلوب ہونے کی بجائے ان پر غالب آجائے اور آلا و مصائب پر غلبہ پانے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ درد کو روحانیت میں بدل دے۔ ظاہر ہے یہ روحانیت الہا مذاہب کی روحانیت سے بالکل مختلف ہے۔ نطشہ اس بات پر اصرار کرتا تھا کہ انسان کے فوق البشر کے لئے ضروری ہے کہ وہ خدا اور مذہب کا انکار کرے' اس کا کہنا تھا کہ کیا لوگوں کو اب تک کی خبر نہیں ہ کہ خدا کی موت واقع ہو چکی ہے (نعوذ باللہ) اسی طرح وہ عیسوی اخلاقیات کو غلامانہ اخلاقیات سے تھا' اس کے نزدیک جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ دراصل نطشہ کے فکر و فلا

میں طاقت کو وہی مرکزی حیثیت حاصل ہے جو نظام شمسی میں سورج کو' مغرب جدید کی تہذیب و ثقافت' میں طاقت پرستی کا رجحان بہت کچھ نطشہ کے خیالات کی صدائے بازگشت ہے۔

فکرِ اسلامی میں روحانیت' ترقی اور انسانِ کامل کا تصور نطشہ کے تصورات سے قطعی مختلف ہے تابش صاحب اس حقیقت سے ہرگز آشنا نہیں ہیں' اس کا ایک بدیہی ثبوت ان کی نثری تخلیقات اور ان کے وہ اشعار ہیں جو باعتبار صنف نعت' سلام' منقبت اور مرثیہ کے ذیل میں کہے گئے ہیں' وہ اس بات کے قائل ہیں کہ انسان کا کمال حصول طاقت نہیں بلکہ حق کی روایت امانت کے ذریعہ قائم ہوئی ہے اس موضوع پر شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے اپنے رسالہ سرالشہادتین میں نہایت بصیرت افروز گفتگو کی ہے۔ تابش صاحب کا درج ذیل شعر اس گفتگو کے فکری خلاصہ کا نہایت حسین شاعرانہ اظہار ہے۔

منسوب جو ہوئی ہے شہادت کے نام سے ؎ قائم ہوئی ہے حق کی وہ حجت امام سے

تابش صاحب کے کلام میں اس فکری بصیرت کے نمونے جا بجا ملتے ہیں۔ میرے خیال میں یہی فکری بصیرت تابش دہلوی کے کلام کو رفعت عطا کرتی ہے اور یہی ان کی انفرادیت کا پیمانہ ہے۔ بقول سلیم احمد' "تابش صاحب کی شاعری میں ایک ایسا عنصر موجود ہے جس کی اچھی شاعری کو ہمیشہ ضرورت رہے گی۔ یعنی سوچنے کی قوت جو زبان و بیان پر قدرت کے ساتھ صحیح ذوق کو متاثر کرتی ہے۔"

یہی سوچنے کی قوت ہے جو تابش دہلوی کو شعراء کے اس قبیلہ سے الگ کرتی ہے جس کو سقراط نے اپنی تنقید کا ہدف بنایا ہے' سقراط کو شعراء سے یہ شکایت تھی کہ وہ اپنے کہے ہوئے اشعار کا مفہوم بیان کرنے سے قاصر اور معذور ہیں' اس عظیم فلسفی کے مطابق شاعری کی تخلیقی صلاحیت کا تعلق ایک طرح کی فطری ذہانت ہے جو عقل سے مختلف ایک چیز ہے' البتہ شعر پر نقد و تبصرہ عقل کا منصب ہے جس کے متعلق سقراط کا یہ کہنا تھا کہ اسے جن شاعروں سے مسابقہ ہو رہا وہ اس صلاحیت سے عاری نظر آئے' شاعری اور شعراء کے متعلق سقراط کا یہ وہ نقطۂ نظر ہے جس سے متاثر ہو کر اس کے لائق شاگرد افلاطون نے شاعری کو ایک بے معنی مشغلہ قرار دیا ہے اور اپنی مثالی جمہوریت (REPUBLIC) میں شعراء کے لئے کوئی جگہ نہیں رکھی۔

افلاطون مثالیت پسند تھا جبکہ عہد جدید افادیت پسندی کا عہد ہے' اس لئے یہ سوال بالکل فطری ہے کہ عہد جدید کے سائنسی کلچر میں شعر و ادب کی جگہ کیا ہے؟ یہ سوال ہمیں شعر و ادب کی ماہیت اور زندگی سے اس کے تعلق پر سوچنے کی دعوت دیتا ہے' تابش صاحب نے بھی اس سوال پر غور کیا ہے اور بہت تفصیل اور گہرائی سے غور کیا ہے' اس حوالے سے ان کے خیالات کا اظہار ان کے نثری مضامین میں جا بجا ملتا ہے ان مضامین کا مطالعہ ... سے متعلق جناب تابش کی فکر سے متعارف کرانے کے ساتھ ساتھ کئی سنجیدہ

مباحث کے دروازے بھی کھولتا ہے، مثلاً مسرت اور غم کی حقیقت اور زندگی سے اس کا تعلق، حسن و قبح یا خیر و شر کا مسئلہ، یہ وہ مسائل ہیں جو فکرِ انسانی میں آفاقی اہمیت کے حامل ہیں، کوئی باشعور فن کار ان مسائل سے صرف نظر کر کے اپنے فن کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتا۔ یہ امر نہایت اطمینان بخش اور مسرت آفریں ہے کہ جناب تابش دہلوی نے ان مسائل پر نہایت سنجیدگی سے غور کیا ہے اس ضمن میں فانی بدایونی سے متعلق ان کے مضامین خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔

اپنے تازہ ترین مجموعہ "دھوپ چھاؤں" کے تقدمہ میں وہ رقم طراز ہیں۔

"دھوپ چھاؤں" اجتماع ضدین، یا مثبت اور منفی پہلو کائنات کی تکوین میں ہر جگہ نظر آتے ہیں اور زندگی انہی مثبت اور منفی پہلوؤں کی رعنائیوں اور قباحتوں سے اپنے رویئے متعین کرتی ہے اور پھر انہی رویوں سے انسان اپنی تشفی کے سامان حاصل کرتا ہے اور جب یہ رویئے گڈمڈ ہو جاتے ہیں تو انسان انسان نہیں رہتا بلکہ درندہ بن جاتا ہے اور نہ صرف نسلِ انسانی کی تباہی کا سبب بنتا ہے بلکہ کائنات کے حسن کی بربادی کا باعث بھی ہوتا ہے"۔

عہد حاضر کا المیہ ہی یہ ہے کہ اس میں یہ رویئے خطرناک حد تک گڈمڈ ہو گئے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان خود اپنی انسانیت کے خلاف برسرپیکار ہے، وہ ایک پھاڑ کھانے والا بھیڑیا اور غرانے والا درندہ بن گیا ہے، خونریزی، فساد، دہشت گردی وہ مسائل ہیں جن کی جڑیں انہیں رویوں میں پیوست ہیں، اس کے ساتھ ہی انسان نے فطرت کے حسن کو غارت کر کے ماحولیاتی آلودگی کا وہ سنگین مسئلہ پیدا کر دیا ہے جو بجائے خود کرۂ ارض اور اس پر موجود زندگی کی تباہی کی علامت ہے۔ ان مسائل سے نمٹنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ہم اپنی سوچ کے زاویئے نہ بدلیں بالفاظِ دیگر حیات و کائنات کے حوالے سے اپنے رویوں کو تبدیل نہ کریں۔

تابش صاحب کی شاعری انہی رویوں کی تبدیلی کی دعوت دیتی ہے اور یہ دعوت نہایت فنکارانہ طریقہ پر دی گئی ہے۔ عہد حاضر کے تہذیبی تناظر میں یہ دعوت بے انتہا اہمیت کی حامل ہے۔ بقول ڈاکٹر شریعتی ——

"فن امانت ہے تخلیقی صلاحیت ہے، یہ انسان کی انسانیت کی تعمیر کا وظیفہ انجام دیتا ہے اور ان معنوں میں فن کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ — شاعری جزو لیست از پیغمبری —

اور پیغمبری کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد فن کی مقدس ذمہ داری اور بھی بڑھ جاتی ہے

بلاشبہ تابش دہلوی اس مقدس ذمہ داری کا شعور رکھتے ہیں اور انہوں نے اس ذمہ داری کو پورا کرنے کی جو کوشش کی ہے وہ لائق تحسین و ستائش ہے۔

تابش دہلوی ۔ ایک فرد ایک ادارہ

تابش صاحب پر قلم اٹھانا سورج کو چراغ دکھانے سے کم نہیں ۔ وہ ہمارے بزرگ ترین اہلِ سخن میں ایک نہایت ممتاز مقام ہی نہیں رکھتے اُردو کی ادبی و تہذیبی روایت میں تسلسل کی ایک ایسی دوگونہ علامت بھی ہیں جس کے قرار واقعی تذکرہ اور اعتراف کے بغیر کم و بیش پچھلی چھ دہائیوں پر مشتمل ہمارا علمی و سماجی منظر نامہ مکمل نہیں سبب ہے کہ میں موصوف کو "تقسیم سے پہلے کی دِلّی اور بعد کے کراچی کی قدرِ مشترک کہا کرتا ہوں جن حضرات نے ۴۷ء تک کی دِلّی اور بعد کے برسوں میں کراچی کی ادبی و شعری اور مجلسی و تہذیبی زندگی کا ذرا قریب سے مشاہدہ کیا ہے وہ اس امر میں مجھ سے شاید ہی اختلاف کریں کہ یوں تو تقسیم کے بعد ہندوستان بھر کے علمی و ادبی اور تہذیبی و مجلسی مراکز سے اس شہر میں سمٹ آنے والے ممتاز اور نمایاں حضرات کی ایک خاصی بڑی تعداد ہمیں نظر آتی ہے مگر اِن میں سے شاید ہی کسی کی ذاتِ گرامی اپنے وطنِ مالوف اور اپنے ماضی و حال کے حوالے سے جناب تابش کی طرح ادبی و تہذیبی تسلسل کی علامت بن کر ابھری ہو۔

اس علامت اس دوگونہ علامت کا دوسرا پہلو' دوسرا زاویہ یہ ہے کہ ہم انہیں بلاخوف تردید کراچی میں اردو کا " دہلوی مکتبۂ فکر و سخن" بھی کہہ سکتے ہیں ۔ زبان و بیان کا منجھا ہوا رکھ رکھاؤ حرفِ مطلب کی ادائیگی میں معنی آفرینی اور کم سے کم الفاظ میں وسیع تر ابلاغی ترسیل کی وہ خصوصیات جو دہلی اسکول کا طرۂ امتیاز کہی جاسکتی ہیں تابش صاحب کے افکار و اظہار دونوں میں مجسم ہو کر رہ گئی ہیں۔ اسی کے ساتھ حیدر آباد میں ان کی مدتِ قیام نے انہیں ہندوستان کے اطراف و اکناف سے وہاں جمع ہو جانے والے اہلِ کمال و اربابِ سخن کو بھی قریب سے دیکھنے اور ان کا تقابلی مُطالعہ کرنے کا موقع فراہم کیا۔ اس سے بلاشبہ ان کے نظری اور فکری اُفق کو جلا ملی ہوگی۔ چنانچہ فانی مرحوم سے اُن کی گہری وابستگی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ خود انہوں نے اس کا اعتراف برملا طور پر اور جذباتی سے انداز میں ایک سے زیادہ بار کیا ہے ۔ تاہم مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ اُن کی فکر اور کلام دونوں میں فانی کے اثرات نے میرے محدود مطالعے کی حد تک ان کی اپنی شخصیت کو کسی غیر معمولی حد تک متاثر نہیں کیا ہے ۔ مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اپنے جداگانہ افکار و اظہار کے حوالے سے انہوں نے فانی کا کوئی اثر سرے سے قبول ہی نہ کیا ہو۔ اس کے برعکس اِن دونوں حضرات کے اندازِ فکر میں ایک حیران کن مماثلت کا سا تعلق

لتا ہے جو کہیں ہلکا اور کہیں قدرے گہرا ہے۔ اس مماثلت نے ’مماثلت کے اس نقش نے دہلی اسکول کی بہترین
دبی و شعری روایات کے ساتھ مل کر جناب تابش کے ”وژن“ کو ایک نئی جہت ایک نئی وسعت عطا
ی ہے جس کا بھرپور اظہار موصوف کی غزلوں میں جابجا اس طرح سامنے آتا ہے کہ ہم انہیں بے ساختہ طور پر اس
ہد کا سب سے بڑا غزل گو ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

مگر یہ مقام انہیں یونہی نہیں حاصل ہو گیا ہے۔ اس کے پس پشت نصف صدی سے زائد عرصہ پر
یط اُن کا وہ ریاض بھی ہے جس نے ان کی غزل کی تکنیکی ساخت اور اس کے شعری اور فنی محاسن کو الفاظ و
عانی کے دروبست اور ان کی فکری ہم آہنگی سے اس طرح پیوند کیا ہے کہ وہ عمومیت کی سطح سے کہیں بلند تر اور
سنجیدہ غزل گوئی کا معیار بن کر رہ گئے ہیں۔ وہ اپنی غزل کا تانا بانا فکر و شعور کی جس آمیزش سے اٹھاتے ہیں اس
یں اُن کے قاری کی حسی کیفیت کو تہہ در تہہ معنویت کے خوشگوار تجربہ کی آسودگی بھی ملتی ہے اور اردو غزل کے
وش آئند امکانات پر اس کا اعتماد بھی فروغ پاتا ہے اور یہ کوئی معمولی وصف، معمولی بات نہیں بالخصوص اس
پس منظر میں کہ گزشتہ بیس بائیس برسوں میں کسی حد تک کراچی اور بڑی حد تک لاہور کے دبستانوں میں غزل
اور غزل گوئی کو محض ذخیرۂ الفاظ کے بل پر جس طرح تختۂ مشق بنالیا گیا ہے، اُس نے اردو ادب کی اس
نہایت توانا صنفِ سخن کے اکثر محاسن کی نفی کر کے رکھ دی ہے میں نے ذخیرۂ الفاظ والی بات بلا سبب
نہیں کی ہے۔ غور کیجئے تو ”لفظوں کو برتنے کا سلیقہ“ شعر گوئی کی بنیادی شرط ہے مگر جب اسے بنیادی وصف
بنالیا جاتا ہے تو وہیں سے غزل کی سطحیت کے در آنے کی راہیں بھی کھل جاتی ہیں۔

تابش صاحب کا سارا کلام لفظیات کے برمحل انتخاب اور الفاظ کو برتنے کے نہایت اعلیٰ پایہ سلیقہ
کی شہادت دیتا ہے۔ مگر ان کے یہاں یہی سب کچھ نہیں ہے۔ اس کے ساتھ جذبات و محسوسات اور کیفیات
کو برتنے کا سلیقہ بھی وہ اعلیٰ پایہ کی شاعری کی اساس تصور کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کے کلام کو قرار واقعی طور سے
سمجھنے اور سراہنے کے لیے اُن کے قاری کا اس تفہیمی پہلو سے بھی آشنا ہونا ضروری ہے اس زاویہ سے دیکھا جائے تو
تابش صاحب پر ابھی تفصیلی تنقید اور تحقیق کی ضرورت ہے۔ کاش ہمارے علمی و ادبی اداروں بالخصوص یونیورسٹیوں
کو اس کی توفیق ہو اور موصوف کی زندگی میں ہی اس ضمن میں کوئی آغاز کیا جاسکے۔

ایک صاحب فکر و نظر اور بلند پایہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ تابش صاحب ایک بے حد سادہ کار تنقید نگار
بھی ہیں شاید انہیں سکہ بند اور تسلیم شدہ نقادانِ ادب و فن کی صف میں تو شمار نہ کیا جاسکے مگر ان کے

مضامین اور یادداشتوں کا مجموعہ" دید و باز دید" تنقیدی خاکہ نگاری میں اُن کے گہرے شعور کی عکاسی ضرور کرتا ہے۔ اس طرح گذشتہ ساٹھ سال کی ادبی و مجلسی زندگی کے بعض ایسے مخصوص افراد، حالات و واقعات اور گوشوں کی نقاب کشائی ہو جاتی ہے جن سے آئندہ کے لئے ادبی تنقید و تحقیق کی راہیں بھی کھل سکتی ہیں۔
دراصل یادداشتوں، مضامین، خاکوں، سوانحی خاکوں اور سفرناموں کا کسی بھی عہد کی عصری کیفیات کے اظہار میں بڑا کردار بڑا دخل ہوتا ہے۔ ان سے ہمیں ایک مخصوص دور میں عوام و خواص کی فکری نہج، ان کی روزمرّہ کی زندگی کی ترجیحات و مصروفیات اور معاشرہ میں جاری و ساری اُن زیرِ سطح اور بالائے سطح تبدیلیوں اور زیر و بم کا علم و اندازہ ہوتا ہے۔ جو اس مخصوص دور کو اپنے پیش رو اور اس سے ممیّز بھی کرتا ہے اور آئندہ کے رجحانات کی نشاندہی بھی۔ اس پہلو سے دیکھئے تو تابش صاحب کی" دید و باز دید" نے ایک ایسا بیرومیٹر فراہم کر دیا ہے جس کی مدد سے ہماری آئندہ نسلیں اس پورے عہد میں جھانک سکیں گی جو اگرچہ تو فی الحال 'حال' ہے لیکن امتدادِ زمانہ سے آج نو کل اسے ماضی بن جانا ہے
اور اب آخر میں ــــ تابش صاحب پر گفتگو اور اظہارِ خیال مجھ جیسوں کا منصب نہیں۔ یہ تو ان کے ہم مرتبہ و ہم پایہ حضرات کا ہی کام ہے بلکہ حق بھی اور فرض بھی۔ تاہم ادب کے ایک ادنیٰ قاری کے ناطے میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ بہت کم ہیں وہ خوش نصیب جو اپنی زندگی ہی میں ایک فرد کے مقام سے اٹھ کر ایک ادارہ بن جائیں۔ تابش صاحب کے افکار و اظہار اور ان کے کردار نے ایک مثالی اکائی میں ڈھل کر بلاشبہ انہیں اس مقام پر فائز کر دیا ہے کہ وہ اردو شعر و ادب کے حوالے سے بجا طور پر بیسویں صدی کے نفوسِ قدسیہ میں شمار کئے جائیں گے۔

محترم تابش دہلوی سکہ بند ادیبوں کی صف میں ممتاز حیثیت کے مالک ہیں جس طرح اُن کی شخصیت باوقار ہے۔ اُسی طرح اُن کا تخلیق کردہ ادب بھی معتبر ہے۔ وہ دہلی کے رہنے والے ہیں اور اپنے پورے وجود میں اِس کی نمائندگی کرتے ہیں۔ انہیں زبان وبیان پر حاکمانہ قدرت حاصل ہے۔ ان کا کلام غلطیوں سے پاک ہے۔

تابش صاحب شاعری میں "معنی آفرینی" کے دلدادہ ہیں! اور بہت سوچ سمجھ کر اس وادیٔ پرخار سے گذرتے ہیں۔ وہ شعر کے باطنی حسن کے ساتھ ساتھ ظاہری نمود کو بھی اہمیت دیتے ہیں۔ جہاں تک میں نے اُن کے افکار کا مطالعہ کیا ہے مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ وہ دہلی اور لکھنؤ دونوں مکتبۂ فکر کی مثبت نمائندگی کرتے ہیں۔

تابش صاحب شاعر تو غزل کے ہیں۔ لیکن دیگر اصنافِ سخن پر بھی حاوی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے نعت، منقبت، رباعی، نظم اور ایک مرثیہ بھی کہا ہے۔ ان کا کمال فن یہ ہے کہ انہوں نے ہر جگہ اپنی انفرادیت برقرار رکھی ہے۔

مولانا منتخب الحق

حضرت تابش دہلوی اور ان کا طرزِ اصلاح

اللہ سبحانہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں کچھ کو خداداد صلاحیت اور ذہانت سے سرفراز فرمایا ہے۔ مگر خداداد ذہانت کے باوجود کسی بھی فن میں نقطۂ عروج و کمال تک پہنچنے کے لئے رہنمائی اور دستگیری سے انکار و انحراف کی گنجائش نہیں نکلتی۔ اس عہد جدید میں جہاں موبائل فون، فیکس اور کمپیوٹر جیسی محیر العقول ٹیکنالوجی ذہنِ انسانی کو ایک لمحہ سکون و قرار سے نہیں بیٹھنے دیتی ہو اور انسان ہر لمحہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں ارض و سما اور وسیع و عریض کائنات کی تحقیق و جستجو میں سرگرداں رہتا ہو اس کی تحقیق بغیر کسی رہنما اور استاد کے منزل مراد سے محروم رہ جاتی ہے۔ سائنسی علوم اور تیکنیک میں تو استاد و رہنما کی ضرورت ہوتی ہی ہے مگر علم و ادب کا شعبہ بھی ایک ایسا شعبہ ہے جہاں حروف شناسی اور قلم گیری کا تصور بغیر استاد و معلم رہنما اور راہبر کے محال و ناممکن ہے۔ یہ ضروری نہیں ہر کس و ناکس کو علم لدنی تفویض کیا جائے ہر چند کہ شعراء اپنے آپ کو وہبی قلم کار تصور کرتے ہیں اور مضامین شعر غیب سے نازل ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں مگر اس اعتراف سے بھی گریز نہیں کرتے کہ وہ "تلامیذ الرحمٰن" ہیں اگر اس جملے کے حقیقی معانی و مطالب پر غور کیا جائے تو یہ بات روز روشن کی مانند ظاہر ہو جائے گی کہ شعراء اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کا تلمیذ متصور کرتے ہیں جس سے استاد و شاگردی کے نظریئے کو تقویت پہنچتی ہے۔ بس یہ بات بغیر کسی بحث و تمحیص کے پایۂ تحقیق کو پہنچی ہے کہ ہر علم و فن کے حصول کے لئے عموماً اور کسی خاص شعبۂ میں مہارت تامہ حاصل کرنے یا نقطۂ عروج پر پہنچنے کے لئے خصوصاً خداداد ذہانت و فراست کے باوصف، صاحب الرائے کا مشورہ اور رہنمائی کا فن کار فن پارے کو مقبولیت عوام اور شہرتِ دوام عطا کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ خواہ وہ علمائے دین اور فقہ و تفسیر کے امام ہوں۔ سائنس داں ہوں یا علوم و معارف کے درخشندہ ستارے ہوں۔ انجینئر۔ وکلاء۔ ڈاکٹر۔ طبیب۔ موسیقار۔ شہسوار غرضیکہ ہر شعبۂ حیات میں استاد کی اہمیت و ضرورت کا اعتراف و اقرار کرنا ہی پڑتا ہے۔ سقراط و افلاطون و ارسطو جیسے مفکرین کا سلسلۃ الذہب۔ ائمہ اربعہ کے مذاہب۔ صوفیہ کے چاروں سلسلے سبھی استاد و تلمیذ کے رشتۂ روحانی میں منسلک ہیں۔ شمس تبریز و مولانا جلال الدین رومی، امام اعظم اور امام محمد نظام الدین اولیاء اور خسرو اس کی زندہ اور جیتی جاگتی مثالیں ہیں۔ اسی طرح شعر و ادب میں مصحفی و انشاء، ذوق اور غالب

داغ و امیر، آتش و ناسخ کے تلامذہ کے سلسلے جن سے اردو شاعری کی دنیا جگمگا رہی ہے مثالاً پیش کئے جا سکتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ موجود عہد احسان ناشناس لوگوں سے بھرا پڑا ہے اور ہر شخص بذات خود استاد بنا پھر رہا ہے۔ حالانکہ ان میں سے اکثر مبادیات شاعری سے ہی نابلد اور اردو شاعری کی ابجد ہوز سے بھی ناواقف ہیں۔ مجھے علم ہے کہ حضرت تابش دہلوی نے کیسے کیسے خود ساختہ اُستادان شعر و غزل کو مشورے دیئے ہیں اور انکے اشعار کو اپنی اصلاح سے اس لائق بنادیا ہے کہ اہل علم کی داد و تحسین کے مستحق ٹھہرتے ہیں حضرت تابش دہلوی نے اپنی فاضلانہ بصیرت سے ایسے کئی شعراء کو ایسا لائق و فائق بنادیا ہے جو آج مسند صدارت پر جلوہ افروز ہو کر شعر و شاعری پر فلسفیانہ گفتگو کرتے۔ حاکمانہ طرز اختیار کرتے اور اپنی دانشوری اور دیدہ وری کا سکہ بٹھاتے ہیں میں نے اُن کے یہاں بڑے بڑے ذی علم اور قادر الکلام شعراء کو آتے اور آپ سے مشورہ کرتے دیکھا اور سنا بھی ہے۔ مگر استاد کے امتثالِ امر کے باعث ان تمام حضرات کا نام لینا یا ریکارڈ پر لانا مناسب نہیں سمجھتا میں یہاں صرف ان شعراء یا شاعرات کا ذکر بسبیلِ تذکرہ کر رہا ہوں جنھوں نے خود اپنے قلم سے اپنے استاد کا نام حضرت تابش دہلوی رقم کیا یا ان سے اصلاح سخن کا کھلے لفظوں میں اعتراف کیا ہے۔ مثلاً نظر جعفری۔ خمار فاروقی۔ نعیم میرٹھی۔ رضیہ سبحان قریشی۔ نگار فاروقی۔ پروفیسر عثمان رمز وغیرہ

میری تحویل میں ان حضرات کے کلام پر استاد کی اصلاح موجود نہیں اس لئے اس مضمون میں فی الوقت میں صرف اپنے کلام پر استاد کی اصلاح کے چند نمونے پیش کر رہا ہوں۔

حضرت تابش دہلوی سے میری پہلی ملاقات ۱۹۵۶ء میں حضرت حسنین زیبا دہلوی کے مکان پر ہوئی تھی حسنین زیبا دہلوی نے میرے دادا حضرت وحید الہ آبادی استاد اکبر الہ آبادی کے کلام کا انتخاب بابائے اردو مولوی عبدالحق کی ایما پر کیا تھا جسے انجمن ترقی اردو ہند نے ۱۹۲۵ء میں شائع کرایا تھا۔ اسی حوالے اور نسبت سے وہ مجھ سے واقف تھے۔ آپ کے دولت کدے کی اسی ادبی محفل میں میں نے حضرت تابش دہلوی سے درخواست کی کہ میں الہ آباد کا رہنے والا ہوں اور شعر و سخن سے شغف رکھتا ہوں اور اپنے کلام کو قابلِ اصلاح تصور کرتا ہوں حضرت تابش دہلوی نے بڑے نرم لہجے میں اتوار کی صبح دس بجے اپنے مکان واقع جہانگیر روڈ آنے کی دعوت دی اس زمانے میں آج کل کی طرح اتوار کو ہفتہ وار تعطیل ہوا کرتی تھی میں اتوار کو دس بجے دن میں حضرت تابش دہلوی کے مکان پر پابندی سے حاضری دینے لگا۔ حضرت تابش دہلوی کی شاعری۔ متانت۔ سنجیدگی اور رکھ رکھاؤ سے بہت متاثر ہوا ان کی سرپرستی اور رہنمائی میں میں نے علم و ادب کے بڑے دقیق و نازک نکتے سیکھے اور برتنے کا گر حاصل کیا۔ ۱۹۷۸ء تک میں کراچی میں ہی مقیم رہا۔ آپ کی سرپرستی میں میں

نے ۱۹۵۶ئ سے ۱۹۷۸ئ تک کے عرصے میں فضل احمد کریم فضلی کے دولت کدے پر ماہانہ مشاعرے ڈاکٹر انعام الحق، یاور عباس، اور دوسری علمی و ادبی انجمنوں میں جانے کی سعادت حاصل کی حضرت تابش دہلوی ہی کی وساطت سے میں نے خلق مجسم استادی ڈاکٹر اسلم فرخی کی نیازمندی کا شرف پایا۔ جن کی محبتوں اور عنایات کے بوجھ تلے میں دبا ہوا ہوں یہاں میں حضرت تابش دہلوی سے اپنے دیرینہ اور گہرے مراسم کا اظہار ضروری نہیں سمجھتا بلکہ میرا مقصد اس مختصر سی تحریر سے یہ ہے کہ میں حضرت تابش دہلوی کے طرز اصلاح کے چند نمونے پیش کروں اور ان کی اس سلسلے میں کڑی گرفت کا تذکرہ صفحہ قرطاس پر لاکر آئندہ آنے والوں کے لئے وہ راہ بنا جاؤں جس سے ادب کا طالب علم کچھ حاصل کرسکے۔

حضرت تابش دہلوی کی اصلاح اشعار کا معیار سخت ہی نہیں بلکہ بہت سخت ہے۔ آپ کے اسی سخت اور شدید انداز گرفت سے سہل پسند طبائع کے اکثر شعراء اکتا کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں سستی شہرت اور کانا دوڑی کی نسل سے تعلق رکھنے والے اتنی کڑی گرفت کے متحمل نہ ہوکر آپ کے دائرہ اصلاح سے نکل جانے میں ہی عافیت سمجھتے ہیں۔ مناسب الفاظ اور ان کے موزوں استعمال پر حضرت تابش کی بڑی گہری توجہ ہوتی ہے۔ ہر موزوں خیال کو وہ شعر کہنا بہتر نہیں تصور کرتے آپ کی کوشش ہوتی ہے کہ شعر میں کوئی تو ایسی بات ہو جس سے شاعر کا اپنا اسلوب متعین ہوسکے اور شعر خود پکار اٹھے کہ میں کس شاعر کی تخلیق ہوں۔ اس سلسلہ میں وہ اکثر اوقات حضرت فانی اور حضرت اصغر کا ذکر کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اچھا شاعر ہونا آسان ہے مگر بڑا شاعر آسان کام نہیں ہے اس کے لئے خون جگر جلانا پڑتا ہے۔ راتیں کالی کرنی پڑتی ہیں اور نیندیں حرام ہوتی ہیں۔ ایک ایک لفظ اور اس کا مناسب استعمال اس طرح سے کیا جائے کہ اگر وہ لفظ وہاں سے ہٹا لیا جائے اور اس کی بجائے دوسرا لفظ وہاں نظم کیا جائے تو شعر کا حسن غارت ہوجائے۔ میں جب بھی ان سے گذارش کرتا ہوں کہ اپنی مشکل پسندی سے ماورا کبھی مشاعرے کے مزاج کا خیال رکھ کر بھی غزل کہا کیجئے تو ان کا ایک ہی جواب ہوتا ہے "میں مشاعرے کا شاعر نہیں ہوں میں تو اس بات سے خوش ہوتا ہوں کہ خواہ ایک ہی آدمی میرے شعر کی تفہیم کرسکے مگر وہ شعر کے نکات اور نازک معاملات سے واقفیت رکھتا ہو۔ اس میں شعر فہمی کی اعلیٰ حس ہو۔ اگر وہ میرے شعر اور اس کے رموز و علائم سے واقف ہوگیا تو میں سمجھتا ہوں کہ میری محنت وصول ہوگئی۔ یہی درس وہ اپنے شاگردوں کو بھی دیتے رہتے ہیں اور کبھی کبھی تمام کی تمام غزل یہ کہہ کر واپس کردیتے ہیں کہ ایک شعر بھی کام کا نہیں ہے کبھی کبھی بادل ناخواستہ کچھ اصلاح کرکے غزل واپس کردیتے البتہ اس پہ یہ ضرور رقم کردیتے ہیں کہ غزل نہایت کمزور ہے۔ پھر سے کہئے۔

میں نے بارہا یہ عرض کیا کہ آپ ہم سے اس معیار کی غزل کی توقع نہ کریں جس معیار کی غزلیں آپ کہتے ہیں۔ مگر ان کا جواب یہی ہوتا ہے کہ میں آپ کی خوشنودی اور دلجوئی کے لئے آپ کے اشعار پر غلط مشورہ

نہیں دوں گا۔ آپ مجھ سے مشورہ کرتے ہیں تو آپ کو ان اصولوں کو برتنا پڑے گا جو میں بتاتا ہوں۔ اکثر اوقات محنت۔ محنت لکھ کر غزل بعد از تصحیح واپس کرتے ہیں جب میں اپنے کسی شعر پر استاد کے صحیح کے دو نشانات دیکھتا ہوں تو یہ ضرور سمجھتا ہوں کہ اس میں استاد نے اچھی شاعری کی ضرور کوئی رمق ملاحظہ فرمائی ہے جبھی دو نشانات لگاتے ہیں ورنہ "غزل کمزور ہے" "سڑیل شعر ہے" "اسے غزل کون کہے گا" "خدارا ایسے اشعار کہنے سے گریز کیجیے اور اپنی شاعری کو خراب نہ کیجیے" "شعر کہہ کر کبھی اس کو سوچا بھی" "ہر موزوں جملہ شعر نہیں ہوتا" "اس غزل کو دوبارہ کہو" جیسے کلمات رقم کر کے غزل واپس کر دیتے۔ "غور و فکر کیجیے" "مطالعہ" "محنت" "مشق" جیسے الفاظ ان کی اصلاح شدہ غزلوں پر ضرور نمایاں ہوں گے۔

آخر میں حضرت تابش دہلوی کی اصلاح اور اپنے اشعار نقل کر کے میں یہ ثابت کروں گا کہ اصلاح سے شعر کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔

واصل — اک لمحہ تصور کا رکھتا ہے وہ رعنائی ؎ جیسے ہو مری ان سے مدت کی شناسائی

حضرت تابش — جیسے ہو مری ان سے برسوں کی شناسائی

واصل — اک نظر جس نے تجھ کو دیکھا ہے ؎ عمر بھر ہم نے اس کو چاہا ہے

حضرت تابش — ہم نے اس کو بھی دل سے چاہا ہے

واصل — ہم نے اکثر تری محفل میں یہی دیکھا ہے ؎ آگ لگ جاتی ہے پروانے کو پروانے سے

حضرت تابش — آگ لگ جاتی ہے پروانے میں پروانے سے

واصل — فن کی تذلیل ہوئی باہنروں کے ہوتے ؎ نغمگی ختم ہوئی نغمہ گروں کے ہوتے

حضرت تابش — نغمہ بے ربط ہوا نغمہ گروں کے ہوتے

واصل — آواز بازگشت نہ ہو ڈوبنے کی یہ ؎ کچھ قہقہے سے جو لب ساحل سے آئے ہیں

حضرت تابش — غرقاب ہونے کی نہ ہو آواز بازگشت ؎ کچھ نالے درد تک لب ساحل سے آئے ہیں

واصل — ہم اس سے عشق کا کس طرح تذکرہ کرتے ؎ جلال خسروی اس حسن بے پناہ میں تھا

حضرت تابش — "بے پناہ" بمعنیٰ زیادہ کے تمام اشتہاد ہے اور یہ اختراع جگر صاحب نے پھیلائی ہے ان کا مصرع ہے : رحمت کو بے پناہ کیئے جا رہا ہوں میں

واصل — ہم گوش بر آواز ہیں لے جان تمنا ؎ ہاں ہاں وہی الفاظ جو ارشاد ہوئے ہیں

واصل — ہم قول و قسم یوں تو بھلانے کو بھلا دیں ؎ آنکھوں سے مگر ان کی جو ارشاد ہوئے ہیں

حضرت تابش : ارشاد کی جمع نادرست ہے۔ اس لئے دونوں شعر قلمزد کر دیئے گئے۔ لیکن پہلا شعر رکھا جا سکتا ہے

کیونکہ ارشاد کا تعلق الفاظ سے مگر شعر اچھا نہیں۔

واصل — بدل گئے ہیں مرے خدوخال جب اتنے ؛ خبر نہیں کہ وہ کتنا بدل گیا ہوگا

حضرت تابش — بدل گئے ہیں مرے خط وخال جب اتنے ؛ خبر نہیں کہ وہ کتنا بدل گیا ہوگا

"خدوخال" غلط ہے۔ خط وخال درست ہے۔ خد کے معنی ہیں رخسار

واصل — خس وخاشاک کی مانند پڑا رہنے دو ؛ خود بکھر جاؤں گا ہیں تو نہ ہوا دے مجھ کو

حضرت تابش — خود بکھر جاؤں گا تو یوں نہ اڑا دے مجھ کو

حضرت تابش فرماتے ہیں سیدھے سادھے لفظ زیادہ تاثیر پیدا کرتے ہیں جہاں خیال ارفع ہوں وہاں دقیق الفاظ لانا مجبوری ہوتی ہے اور کوشش کیا کرو کہ تمہارے مضامین میں بھی اپنے مضامین ہوں اس سے شاعری میں ندرت پیدا ہوتی ہے اور لوگ عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

استاد کے ایک خط کی فوٹو نقل روانہ کر رہا ہوں۔ اسے بھی قارئین ملاحظہ فرمالیں کہ حضرت تابش کی گرفت اور مزاج شعری کس نہج کا ہے جس سے وہ سرمو گریز نہیں کرسکتے اور اتنی گہری تنقید ہضم کرنا سب کے بس کا کام بھی نہیں ہے۔ یہاں میں استاد پر کوئی تنقید نہیں کر رہا بلکہ میرا مقصد یہ ہے کہ اپنے شاگردوں سے کتنی محبت ہے کہ وہ ان کی ذرا سی لغزش پر بھی کس طرح آڑے ہاتھوں لیتے ہیں

۹ مارچ ۱۹۹۴ء

برادرم واصل صاحب! عید مبارک

میں قطر کے مشاعرہ میں گیا اور پانچ روز قطر میں رہا، مشاعرہ بہت اچھا تھا، ہندوستان سے علی سردار جعفری اور دوسرے شعراء شریک ہوئے۔

موجودہ غزل اصلاح کے بغیر واپس کر رہا ہوں، شعروں میں کچھ خامیاں ہیں جن کی نشاندہی کر دی گئی ہے۔

۱۔ وہ جوشِ آرزو وہ غمِ دل نہیں رہا ؛ کیا میں نگاہِ یار کے قابل نہیں رہا

نگاہِ یار کے قابل رہنے کے لئے جوشِ آرزو کے نہ رہنے سے کیا تعلق ہے، پھر غمِ دل کا نہ رہنا تو آرام اور سکون کا باعث ہے شکایت کیسی؟

۲۔ کیوں کند ہوگئی ہے مری ہر صلاحیت ؛ کیا اب کوئی بھی مدمقابل نہیں رہا

آپ کی کون کون سی صلاحیتیں تھیں جن کا وجود کسی کو مدمقابل رکھنے کے لئے ضروری تھا اور اب جن کے نہ ہونے سے مدمقابل کوئی نہیں

۳۔ اب ڈوبنے میں لطف نہ تسکین اضطراب ؛ ممدیدہ جب کوئی سرِ ساحل نہیں رہا
جب تک آپ کا محبوب ساحل پر کھڑا روتا رہا آپ کو ڈوبنے میں لطف آتا رہا اور آپ کا اضطراب تسکین پاتا رہا، کیا یہ صورت عملی طور پر ممکن ہے؟؟؟

۴۔ پھر بھی تلاش کرتی ہے مجھ کو ہر اک نگاہ ؛ ہرچند اب میں رونقِ محفل نہیں رہا
آپ کو ہر نگاہ تلاش کرتی ہے (محفل کے باہر بھی) پھر ویسے بھی آپ رونقِ محفل کس طرح تھے۔؟ کیا شعبدے دکھا رہے تھے؟

۵۔ اربابِ عشق کی تپشِ دل کو کیا ہوا ؛ وہ زور و شورِ کوچۂ قاتل نہیں رہا
تپشِ دل آگ تو شاید لگا سکتی ہے کسی کوچہ کے "زور و شور" کا سبب نہیں بن سکتی! پھر تپشِ دل کوچۂ قاتل ہی کے لئے کیوں مخصوص ہے۔

۶۔ کیسے نہ اس کے لطف کا اقرار کیجئے ؛ کیا وہ غمِ حیات میں شامل نہیں رہا
محبوب کے غمِ حیات میں شامل رہنے کی کوئی دلیل؟؟

۷۔ اللہ رے التفات، تغافل شعار کا ؛ ہر اک سے کہہ رہے ہیں کہ واصل نہیں رہا
شتر گربہ، پہلے مصرع میں صیغہ واحد دوسرے میں صیغہ جمع کا!!
ہر اک سے کہہ رہا ہے کہ واصل نہیں رہا

دعاگو تابش دہلوی

آخر میں میں یہ ضرور لکھوں گا کہ ان کی رہنمائی اور سرپرستی جنہیں نصیب ہوگئی وہ خوش قسمت ہیں کہ ان کو الفاظ کے صحیح استعمال اور ان کے معنی و مطالب کے تمام رموز سے واقفیت ہوگی اور وہ اپنے کلام کو سقم سے بچا کر شعر کہنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔

تابش دہلوی

شعرائے کراچی کے طبقۂ متقدمین سے تعلق رکھتے ہیں ہم سب سے سینئر ہیں. شرفائے دہلی کی وضعداری کا نمونہ ، حلم واخلاق کے پیکر اور غزل کی کلاسکی روایت کے ایسے جید و مستند نمائندے کہ اس اعتبار سے ان کا شمار نوادر عہد میں کرنا چاہیئے. میرا یہ منصب نہیں کہ حضرت تابش مدفیوضہ کی غزل کے بارے میں اظہار خیال کروں صرف اتنا عرض کروں گا کہ حضرت کے مجموعۂ غزل نیمروز کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر زبان پر قدرت کامل. اسالیب بیان کی طرفگی اور تازگی کا ادراک نازک ترین جذبات اور پرشکوہ تخیل کے آمیزے اور امتزاج کا حکیمانہ شعور حاصل ہو تو کس معیار و مزاج کی غزل وجود میں آسکتی ہے. تقدیس، جناب تابش کا مجموعۂ نعت ہے، سبحان اللہ

محورِ ہستی فقط ذاتِ رسولؐ
دین و دنیا مصطفٰےؐ تا مصطفٰےؐ

تابش صاحب کے مزاج و مذاق میں غزل رچ بس گئی ہے چنانچہ اشعار نعت کا لہجہ بھی غزل آمیز ہے جس سے لطف کلام دوبالا ہوگیا ہے یہ چند سطور حضرت تابش کے حضور حرفِ عقیدت کی حیثیت رکھتی ہیں ورنہ اس بحر بیکراں کو عبور کرنے کے لئے سفینہ چاہیئے.

رئیس امروہوی
جنگ : ۳ اپریل ۱۹۸۷ء

تابش دہلوی کیلئے اعزازات

۱۔ نیشنل سوسائٹی آف پاکستانی امریکن نارتھ امریکہ ایوارڈ ۱۹۸۷ء

۲۔ حلقۂ فن وادب شمالی امریکہ ایوارڈ ۱۹۸۷ء

۳۔ کُل پاکستان نعت اکادمی ایوارڈ ۱۹۹۱ء

۴۔ انجمن ترقی اُردو پاکستان ایوارڈ ۱۹۹۲ء

۵۔ دہلی اینگلو عربک کالج اینڈ اسکولز اولڈ بوائز ایسوسی ایشن ایوارڈ ۹۲ء

۶۔ ساکنان شہر قائد سیّد سلیمان ندوی ایوارڈ ۱۹۹۳ء

۷۔ ہمدرد (وقف) پاکستان ایوارڈ ۱۹۹۴ء

۸۔ برسٹل میٹرس اسکوئپ پاکستان ایوارڈ ۱۹۹۴ء

۹۔ رائٹرز ویلفیئر فاؤنڈیشن پاکستان گولڈ میڈل ۱۹۹۴ء

۱۰۔ کراچی یونیورسٹی ایوارڈ ۱۹۹۸ء

۱۱۔ دبستان نارتھ کراچی ایوارڈ ۱۹۹۸ء

۱۲۔ مہران کالج برائے خواتین کراچی ایوارڈ ۱۹۹۸ء

۱۳۔ حکومت پاکستان (صدارتی ایوارڈ) تمغہ امتیاز ۱۹۹۸ء

شاھدہ حسن

تابش دہلوی - ایک تاثر

برق رفتاری سے بدلتے ہوئے اس عہد میں "جنریشن گیپ" اب جزوی طور پر پاکستانی معاشرے کا بھی مسئلہ بنتا جا رہا ہے۔ وہ زمانے گئے جب آہستہ روی کا شعار تھا۔ پرانی ہوتی نسل، جنم لینے والی نئی نسل کا ہاتھ تھام کر اور ایک ایک قدم اپنے ہمراہ اٹھوا کر چلنا سکھاتی تھی۔ ذہنی تربیت کے لئے علمی خزینوں سے لے کر مخصوص صحبتوں تک کا انتخاب انتہائی اہتمام سے کیا جاتا تھا۔ آج ایسی ساری تربیت گاہیں عنقا ہو چکی ہیں اور ایسی شخصیات اور ہستیاں بھی، جو اگرچہ ٹیلیویژن اور کمپیوٹر کی چمکتی ہوئی اسکرینوں کی طرح زنگارنگ اور انکشافات سے بھرپور تو نہ تھیں مگر اپنی ذات اور اس کی جملہ خصوصیات میں ایسی تہذیبی انجمنوں کے مانند تھیں جن کے بخشے ہوئے اعتماد سے مالامال ہونے والے، ٹوٹنے اور بکھرنے کی ان اذیتوں سے اتنی جلد دوچار نہیں ہوتے جیسے آج ہو جاتے ہیں۔

میں نے چونکہ ہمیشہ اپنے خاندانی بزرگوں سے اک نوع کی نسبتِ خاص محسوس کی ہے اور ان کے بخشے ہوئے اعتماد سے آج بھی فیض یاب ہوں تو جب ایک ایک کر کے سب اچانک رخصت ہونے لگے تو یوں لگا جیسے مجھ پر ساری درس گاہیں اچانک بند کی جا رہی ہیں۔ میسّر کتابوں میں ان سارے سوالوں کے جواب بھلا کہاں جو ہمارے ناآسودہ دل و دماغ ہر لمحہ پوچھتے رہتے ہیں۔ ایسے میں اس تشنگی کو بجھانے والی کچھ وہی ہستیاں ہو سکتی تھیں جیسی خوبیٔ قسمت سے مجھے میسّر تھیں۔ بہت وقت اسی محرومی کے احساس کے ساتھ گزر گیا، یہاں تک کہ ایک روز اچانک حضرت تابش دہلوی سے ایک شعری محفل کے اختتام پر ملاقات ہوئی۔ بہت اپنائیت سے مخاطب ہوئے۔ فرمانے لگے "بی بی آپ ماشاءاللہ بہت اچھے شعر کہتی ہیں۔ میں بہت پسند کرتا ہوں آپ کا کلام، یوں ہی لکھتی رہیئے۔"

ظاہر ہے حضرت تابش دہلوی اپنے ادبی مقام کے اعتبار سے جس مرتبے پر فائز ہیں ان کے یہ الفاظ میرے لئے کسی اعزاز سے کم نہ تھے۔ مجھے بڑی طمانیت ہوئی۔ ابھی چند روز ہی گذرے ہوں گے کہ ایک اور شعری نشست کے اختتام پر وہ پھر تشریف لائے۔ "بی بی! آپ نے اپنی غزل کے ایک شعر میں "ہما" کو مونث نظم کر دیا ہے" یہ مذکر ہے۔ اسے درست کر لیجئے گا۔ مجھے روشنی ملنے لگی۔ میں

ابتدا میں صحتِ بیان اور الفاظ کے درست استعمال کے حوالے سے اپنے آپ کو اتنا ذمہ دار نہیں پاتی تھی۔ مگر جب سے تابش صاحب نے غلط استعمال پر ٹوکنا شروع کیا ہے میں الفاظ کے دروبست ان کے صحیح تلفظ اور درست ادائیگی کے سلسلے میں محتاط ہو گئی ہوں۔ ان کی ذات ایک عرصے سے میرے لئے اک ایسے روشن وجود کے مانند ہے جس نے مجھے اک عجیب نوع کا اعتماد بخشا ہے۔ میرا پہلا شعری مجموعہ شائع ہونے لگا تو میں نے تابش صاحب کو فون کیا۔ "تابش صاحب غزلیں تو میں نے صاف کر لی ہیں۔ مگر چھپنے سے پہلے آپ ایک نظر دیکھ لیجئے" انھوں نے کوئی تامل نہ کیا۔ میں مسودہ انہیں دے آئی دو دن بعد ان کا ٹیلیفون آگیا "بی بی! میں نے مسودہ دیکھ لیا ہے۔ آپ آ کر لے جائیے۔" میں پہنچی تو انہوں نے مسودہ لوٹاتے ہوئے کہا "آپ ماشاء اللہ بہت اچھا کہتی ہیں۔ میں تو ہمیشہ کہتا ہوں اور بڑی عزت کرتا ہوں آپ کی۔ نہیں بھئی بہت برے حالات ہیں آج کل۔ آپ بہت اچھا کرتی ہیں کہ کم آمیز ہیں اور رکھ رکھاؤ سے رہتی ہیں۔ ہاں مگر جو لوگ اسے چھاپ رہے ہیں ان سے اپنے معاملات ابتدا ہی میں طے کر لیجئے گا ایسا نہ ہو آپ کو نقصان پہنچے۔" وہ گفتگو کرتے رہے اور میں ان کی شفقتوں کو مسرت بھری حیرانیوں سے دیکھتی رہی ۔۔۔ وہ دن ہے اور آج کا دن تابش صاحب میرے لئے اک ایسے چھتنار پیڑ کے مانند ہیں جس کے سائے میں میں جب چاہوں خیمہ زن ہو سکتی ہوں ۔۔۔ شاید ان کا اور میرا رشتہ "اشتہارات" کی لین دین کے معیارات سے جانچنے سے ماورا ہے۔ کیونکہ مجھے یاد ہے کہ انہوں نے اپنی تمام تر عنایات کے اظہار کے طور پر جو تحفہ مجھے دیا ہے وہ ایک نادر لغت ہے۔ تابش صاحب اپنے ہم عمر احباب سے ملیں یا نئی نسل کے کسی لکھنے والے سے، کسی نو آموز شاگرد سے یا چھوٹے چھوٹے بچوں سے رکھ رکھاؤ اور وقار و متانت کے باوجود اک والہانہ پن کی شدت ان کے برتاؤ میں مسلسل نظر آتی رہتی ہے۔ میں جب بھی ان سے ملتی ہوں وہ کوئی نہ کوئی نصیحت ضرور کرتے ہیں۔ کبھی صحت کے معاملے میں، کبھی بچوں کی تربیت کے سلسلے میں، کبھی سماجی رویوں کے حوالے سے تنبیہہ بھی کرتے ہیں اور تعریف و توصیف بھی ۔۔۔ یہ تعلقِ خاطر بہت دنوں سے مسلسل قائم ہے مگر میں ہمیشہ مؤدبانہ ہی ملتی رہی ہوں۔ کبھی کوئی بے تکلفی نہیں۔ اسی لئے مجھے تابش صاحب کی شخصیت کے دیگر پہلوؤں سے کچھ ایسی واقفیت نہیں تھی۔ مگر گذشتہ سال اسلام آباد ٹیلیویژن کی ایک ریکارڈنگ کے بعد عالی جی، تابش صاحب اور میں واپس کراچی آ رہے تھے۔ اسلام آباد ائرپورٹ پر موسم کی خرابی کے باعث جہاز سات آٹھ گھنٹے کی تاخیر سے کراچی روانہ ہوا۔ سب بری طرح تھک چکے تھے۔ اس سفر میں امجد اسلام امجد بھی ہمارے ساتھ کراچی آ رہے تھے۔ جہاز میں داخل ہوئے تو اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھنے کے بعد سب آپس میں گفتگو کرنے لگے۔ امجد اپنی بذلہ سنجی اور شگفتہ مزاجی کے باوصف تابش صاحب سے ہر چند بے تکلف تو ہو چکے تھے مگر احتیاط

سے بھی کام لے رہے تھے۔ امجد ایک کے بعد ایک لطیفہ سناتے اور عالی جی، تابش صاحب اور میں دیر تک محظوظ ہوتے رہتے۔ کچھ دیر بعد عالی جی کسی مطالعہ میں مصروف ہو گئے۔ میں اپنی نشست پر سر لٹکا کر آرام کرنے لگی۔ مگر میں نے دیکھا، تابش صاحب کے لب ولہجہ سے مہ وسال کی ساری گرد کہیں اڑ چکی تھی اور وہ اور امجد بے تکلف دوستوں کی طرح مسلسل ایک دوسرے کو دلچسپ یادداشتیں اور ادبی لطائف سنانے میں مصروف تھے ــــ دیر تک ان دونوں کی بے ساختہ ہنسی کی آوازیں میرے کانوں میں آتی رہیں۔

تابش صاحب کو اپنے تخلیقی سفر کو جاری رکھے ہوئے کم وبیش ستر سال ہو چکے ہیں۔ مگر وہ آج بھی ان تخلیقی توانائیوں کے حوالے سے اپنے اس شعر کی تفسیر ہیں ؎

ابھی رکا نہیں تخلیق آرزو کا عمل
تمام جسم میں کرب نمو تو اب بھی ہے

انھوں نے نظمیں بھی کہی ہیں اور معرّیٰ شاعری بھی کی ہے شخصیات کے خاکے بھی لکھے ہیں اور تنقیدی مضامین بھی ــــ مگر شیدائی وہ سدا سے غزل ہی کے ہیں۔ ان کا پہلا مجموعۂ غزلیات "نیم روز" ہے جس کی اشاعت اوّل ۱۹۶۳ء کی ہے پھر دوسرا مجموعۂ غزلیات "چراغِ صحرا" ۱۹۸۳ء میں تقریباً دو دہائیوں کے فرق سے شائع ہوا۔ ۱۹۹۳ء میں ماہِ شکستہ کے نام سے ایک اور مجموعۂ غزلیات شائع ہوا۔ ۱۹۹۶ء میں شائع ہونے والے شعری مجموعہ "دھوپ چھاؤں" میں بھی ان کی غزلیات شامل ہیں۔ اس دوران ان کی منظومات نعتیہ اور منقبتی کلام اور مرثیوں کے علاوہ ان کے نثری مضامین کے مجموعے شائع ہوتے رہے ہیں۔ مگر میں نے اس مضمون کو قلم بند کرتے ہوئے ارادی طور پر ان کی غزلیات تک خود کو محدود رکھا کیونکہ ایک مختصر مضمون میں ان کی شخصیات اور شاعری کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لینا ممکن نہیں۔

تابش صاحب کی غزلیں اس حقیقت کی غماز ہیں کہ وہ نہ صرف ایک صاحبِ مطالعہ شاعر ہیں بلکہ عمیق مشاہدہ اور گہرے احساس کے باوصف، اساتذہ کے کلام کی معنویت کو خاص اپنے انداز میں سمجھنے کی صلاحیت بھی انہیں ودیعت ہوئی ہے اسی لئے انہوں نے استفادہ بھی کچھ اس طور کیا ہے کہ ان کے اپنے شعری اظہار میں تازگیٔ احساس اور انفرادیت برقرار رہی ہے۔ ان کی غزلوں پر کلاسیکی غزل کے مروّجہ اسالیب کے اثرات واضح نظر آتے ہیں بطورِ خاص میرؔ، غالبؔ اور فانیؔ کے ــــ وہ اقبالؔ اور جوشؔ سے بھی متاثر رہے مگر جو خوبی ان کا شعری اعتبار قائم کرتی ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے کسی اور کی فکر اور احساس کو اپنے اوپر طاری کر کے جذبوں کو قلم بند نہیں کیا ہے بلکہ اپنے غموں اور دکھوں کو اپنے اندر جذب کر کے صرف ان لذتوں کو بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے جو ان کے اپنے دائرۂ احساس میں شامل ہو گئی ہیں ؎

پیدا یہ فرقِ جادہ و منزل ہوا نہ تھا
کن مرحلوں میں ہیں قدمِ اولیں سے ہم

اب تو ملے تو پائیں ہم اُن کا سراغ بھی ؛ جو خود بھی کھو گئے ہیں تجھے بھی نہ پا سکے

ان تمام ناآسودگیوں کے باوجود تابش دہلوی اک باشعور اور حقیقت پسند انسان کی حیثیت سے اس زندگی کے تقاضوں کو نبھاتے نظر آتے ہیں ان کی سوچ و فکر نے وقت کی اڑائی ہوئی گرد کو تھکن کی چادر بنا کر نہیں اوڑھا ہے اور نہ ان کے ظاہری وجود پر کسی زبوں حالی کا غلبہ ممکن ہو سکا ہے بلکہ ایسا لگتا ہے جیسے ہر نئے دکھ اور نئی چوٹ کے ساتھ، وہ زندگی کے اس سفر میں پہلے سے زیادہ با اعتماد ہو کر قدم اٹھانے لگتے ہیں ۔

میں اسی دور میں کیا زندہ ہر اک دور میں ہوں
کب سے یہ گردشِ ایام مری تاک میں ہے
راکھ کا ڈھیر سہی میں مگر اے خرمنِ شوق
اک ناجستہ شرار بھی مری خاک میں ہے

اگرچہ کبھی کبھی زندگی کے تھکا دینے والے لمحوں میں تابش دہلوی یوں بھی مخاطب ہوئے ہیں ۔

آئی تو ہوائے تازہ لیکن ؛ تنکوں کی طرح بکھر گئے ہم

یا اندھیروں کو تادیر نہ ڈھلتے دیکھا تو کہہ اٹھے ۔

روشنی کے لئے بس ایک دیا سو ہم نے ؛ کبھی دیوار پہ رکھا کبھی در پر رکھا

یا بے یقینی کے لمحات میں یہ سوچ ستانے لگی ؛

دو ہی موسم خزاں بہار کے ہیں ؛ دیکھئے ختم ہو یہ سال کہاں

مگر پھر زندگی اور اس کے لامتناہی حسن پر ان کے بھرپور یقین نے ان کے لب و لہجے کو ایک نئے اعتماد سے بحال کر دیا :

کب ٹھہرنا ہے رہِ شوق میں کب چلنا ہے
ہم مسافر ہیں ہم آدابِ سفر جانتے ہیں

میں سمجھتی ہوں تابش دہلوی نہ صرف خود آدابِ سفر جانتے ہیں بلکہ ان کے شاعرانہ کینوس پر بنی ہوئی زندگی کی یہ سچی تصویریں ہمیں اور آپ کو بھی اس سفرِ حیات کے بہت سے رموز سے آشنا کر رہی ہیں۔

یہ ذائقہ مرے لہجے میں کچھ یونہی تو نہیں
غمِ حیات نے اپنا مزہ دیا ہے مجھے

غمِ حیات کا بخشا ہوا یہی ذائقہ ہے جو انہیں خود بھی بہت عزیز ہے۔ وہ درد کی ان لذتوں سے دستبردار ہونے کو دراصل زندگی اور زندگانی کے لطف سے دستبردار ہونے کے مترادف قرار دیتے ہیں۔ غمِ دل کی سلسلہ در سلسلہ یہی داستان ان کے شعری اظہار کا حصہ ہے ۔

یہ فراق و وصل و شوق و آرزو کچھ بھی سہی
اک غمِ دل ہی مگر افسانہ در افسانہ ہے

تاباں دہلوی نے ایک جگہ اپنی شاعری کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے "میری شاعری دورِ حاضر کی تمام تحریکوں سے متاثر ہوئی اور میں نے ارادی طور پر اپنی شاعری کو روایت اور جدت سے ہم آہنگ رکھا ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ جدت میں دوسروں کی نقل نہ کروں بلکہ اپنے استعارے اور اپنی تشبیہات استعمال کروں۔"

تاباں دہلوی کی شاعری میں روایت اور جدت کی اسی ہم آہنگی نے ان کے کلام کو ابلاغ کی اس سطح پر رکھا ہے کہ بڑے بڑے شعری اجتماعات میں جب وہ اپنا کلام عطا کرتے ہیں تو نہ صرف اپنے ہم عمروں سے داد وصول کرتے ہیں بلکہ نئی نسل کے سننے والے بھی اس سے پوری طرح لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اُن کی شاعرانہ صلاحیتوں کے اظہار میں اس ساری "ذہنی تربیت" کے اثرات اپنی جگہ جو بحیثیت حضرت فانی کے ایک شاگرد خاص کے ان کو میسر آئی مگر ایک بات واقعی اہم ہے کہ ان اثرات کو ان کی شعری شخصیت نے کچھ اس طرح قبول کیا ہے کہ دیگر اثرات سے ہم آہنگ ہو کر بالکل مختلف جہات سامنے آئی ہیں۔

ان کی شاعری اور شخصیت میں کوئی تضاد نہیں بلکہ میں سمجھتی ہوں کہ اگر کسی نے ان سے بالمشافہ ملاقات نہ بھی کی ہو تو ان کے شعروں کے آئینے میں جو چہرہ منعکس ہو رہا ہے اس کے سارے خط و خال، ان کے اصلی چہرے سے حیرت انگیز طور پر مماثل نظر آئیں گے۔ ایک وضع دار، سنجیدہ خو، صاحبِ نظر شخصیت، جس کے رکھ رکھاؤ اور وضع داریوں میں اک پوری تہذیب اپنی جھلک دکھاتی ہے اور جس کے لہجے کا ٹھہراؤ اور جس کی بردبار گفتگو میں لفظوں کے چناؤ کے ساتھ ساتھ آواز کے زیر و بم سے بھی شخصی اعتماد کا بھرپور تاثر قائم ہوتا ہے ۔ یہ شخصیت جب اپنے شب و روز کو لکھتی ہے تو اس کا لکھا ہوا ذاتی تجربہ، صرف ایک فرد کی داستانِ حیات تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس شاعرانہ اظہار میں اک پورے عہد کی اجتماعی زندگی کی تصویریں نظر آتی ہیں۔

ان کے اوّلین مجموعۂ کلام "نیم روز" میں جس نوع کی ذاتی وارداتوں کا بیان ہے وہ غزل کی روایات

کے جانے پہچانے اور برتے ہوئے موضوعات ہیں مگر تابش دہلوی نے ان موضوعات کو اس طرح اختیار کیا ہے کہ اپنے محسوسات اور اپنی دلی کیفیات کو رقم کرتے ہوئے وہ اپنے اظہار کو ایسے نئے زاویوں سے مربوط کر دیتے ہیں کہ ان کا شعری اسلوب خود بخود نمایاں ہو جاتا ہے۔ ؎

؎ اتنے تارے خیال نے توڑے
آسماں کھو گئے زمینوں میں

؎ رہا اک اک قدم پر پاسِ آدابِ طلب ورنہ
وہاں ہم تھے جہاں پانا ترا مشکل نہیں ہوتا

؎ کاش دل ہی ذرا ٹھہر جاتا
گردشوں میں اگر زمانہ تھا

؎ کب ہے دامن گیر ہونے کا جنوں بھی رائیگاں
ہاتھ میں دامن اب اپنا ہی سہی، دامن تو ہے

؎ رشک کے قابل تھی شاید میری سحر آسودگی
بارہا ڈوبا ہوا ساحل نظر آیا مجھے

؎ تیرے دیوانوں کو آگے نہیں جانے دیتے
تیری دیوار کے سائے بھی تو دیوار ہوئے

؎ جوشِ وحشت میں قدم اور اٹھائیں تو کہاں
وسعتیں رہ گئیں یک گام بیابانوں کی

؎ زمانہ رہ گزرِ سیلِ تند ہے تابش
یہاں نہ ہم نہ ہمارا غبار ٹھہرے گا

اس معیارِ کلام کو مشاعرے کی داد و تحسین کے پیمانوں سے نہیں ناپا جا سکتا۔ ان میں فکر و معانی کی گہرائی ہے۔ رمزیت اور اشاریت ہے اور زبان کا ایسا رچاؤ جو خاص صنفِ غزل سے منسوب ہے۔

تابش دہلوی ایک عجلت پسند قلم کار نہیں۔ ان کی غزلیات کا دوسرا مجموعہ "چراغِ صحرا" جب دو دہائیوں کے فرق کے بعد سامنے آیا تو اندازہ ہوا کہ "نیم روز" کے رنگِ تغزل پر مزید کس قدر نکھار آچکا ہے۔ یہ نکھار محض مشقِ سخن کا مرہونِ منت نہ تھا۔ اس کے پس منظر میں تخلیقی انہماک کی وہ طویل ساعتیں تھیں جن کے اختتام پر رُتوں کی تازہ کار ماں نئے رنگ بکھیرتی ہیں۔ "نیم روز" سے لے کر "دھوپ چھاؤں" تک یہ

رنگ پھیلے ہوتے ہیں۔

ے وہ بھی پڑتا ہے بر سرِ منزل
جو قدم بے ارادہ رکھتے ہیں

ے مانا شکستِ قیمتِ دِل ہے نگاہِ لطف
ہم اور بھی گراں ہیں خریدار دیکھ کر

ے ابھی ہیں قرب کے کچھ اور مرحلے باقی
کہ تجھ کو پا کے ہمیں پھر تری تمنا ہے

ے ہم اکیلے ہی نہیں آئے ہیں تیری بزم سے
آج تو تجھ کو بھی تیری انجمن سے لائے ہیں

ے عمر بھر کو متاعِ جاں ٹھہری
وہ خلش پھر جو عمر بھر نہ ہوئی

ے جانفزاء نیم نظر بھی، نگۂ لطف بھی ہے
کون سے تیر کو پیوستِ رگِ جاں کر لیں

ے ترا وصال تو کس کو نصیب ہے لیکن
ترے فراق کا عالم بھی کس نے دیکھا ہے

ے اپنی ویرانیٔ خاطر معلوم
خلوتِ غم بھی ہے آباد اب کے

تابش دہلوی کو ورق در ورق پڑھتے چلے جائیے۔ نہ کسی حرف میں ابتذال ملے گا نہ کسی خیال میں سطحیت ــ نہ کیفیتوں میں خود رحمی، نہ احساس میں پژمردگی ــ بس کسی دل میں اک آگ کے مسلسل سلگتے رہنے کا احساس ہوگا جس کے مدھم مدھم شعلے وجود کو راکھ نہیں کرتے بلکہ دل و دماغ میں اُجلی اُجلی روشنی پھیلائے رہتے ہیں ــ

ے سیلِ گریہ کر گیا شاداب گلزارِ امید
دل سے جو نالہ اٹھا سروِ چراغاں ہوگیا

ان اوراق میں تغزل کے حسن کے ساتھ ساتھ زندگی کا بھی بھرپور حُسن موجود ہے۔ تابش صاحب

زندگی کے اسی حسن کے بیان کے شاعر ہیں۔ اسی لئے ان کے یہاں غم کا ہمہ رنگ احساس مسرتوں کی نمود سے اس طرح وابستہ نظر آتا ہے کہ غم اور خوشی ایک ہی کیفیت کے دو نام لگتے ہیں۔ ان کے نزدیک احساسِ غم ایک قوت ہے اور جو لوگ اپنے غموں سے مسرتیں کشید کرنے کا ہنر جانتے ہیں وہ زندگی کو سدا اپنی دسترس میں پاتے ہیں۔ زندگی کی اسی تفہیم کو تابش دہلوی "زندگی کا حسن" قرار دیتے ہیں :۔

غم کا اظہار تبسم سے کیا
رُخ پہ جب کوئی نہ آنسو ٹھہرا

اپنی شادابیٔ غم کا مجھے اندازہ ہے
روح کا زخم پرانا ہے مگر تازہ ہے

اندوہِ جاں ہو یا غمِ جاناں کوئی تو ہو
کوئی حریفِ شوق تو ہو، ہاں کوئی تو ہو

اک نشترِ الم ہی سہی جاں نوازِ شوق
جب تو نہ ہو قریبِ رگِ جاں، کوئی تو ہو

تابش دہلوی کے کلام میں اگرچہ خارج کے مظاہر کم ہیں مگر اس کے باوجود وہ دنیا اور کارِ دنیا سے دل برداشتہ، ایک ایسے غم پسند انسان کے طور پر ہم سے نہیں ملتے جو اپنی خلوتوں اور تنہائیوں میں اپنے اندر پلنے والے دکھوں کو کسی مرض کی طرح جھیل رہا ہو ان کے سارے دکھ سکھ، انسانی روابط کے نتیجے ہی میں جنم لیتے ہیں ان کا مکالمہ اگرچہ بیشتر اپنے آپ ہی سے جاری رہتا ہے مگر اس مکالمے کے دائرے میں ان کی اپنی ذات کے ساتھ ساتھ کائنات اور فرد کے تعلق سے سارے سماجی رشتے اور فطرتِ انسانی کے دیگر مظاہر بھی شامل ہیں۔ اس شعری اظہار میں ان کے سارے خوابوں کے عکس موجود ہیں۔ ان میں کچھ خواب ایسے ہیں جو تعبیر نہ ہو کر بھی اپنی انتہاؤں میں آسودۂ تعبیر محسوس ہوتے ہیں۔

ہو گئی ساری زندگی تعبیر
اتنا دیکھا ہے ہم نے خواب ان کا

اور کچھ خواب ایسے ہیں جو اک کبھی نہ ختم ہونے والے انتظار میں ڈھل چکے ہیں۔ اور تابش دہلوی انکی کسک کو ہر لمحہ اپنے دل میں محسوس کرتے ہیں۔

اسیر ہم نہیں لیکن بنامِ آزادی
وہی کشاکشِ طوقِ و گلو تو اب بھی ہے

سید جاوید حسن

تابش صاحب

تابش صاحب اور میں

چند ہفتے قبل کی بات ہے میرے بزرگ و محترم دوست اور معروف شاعر جناب نعیم میرٹھی میرے دفتر تشریف لائے، آداب و سلام کے بعد فرمانے لگے "اکتب ..... یعنی لکھو" میں پریشان ہوا "نعیم بھائی! کیا لکھوں؟ ..... "پھر وہی لفظ دہرایا "اکتب ....." میں بدستور مثالِ آئینہ حیراں، تیسری بار بغیر بھینچے فرمانے لگے "بھئی تابش صاحب پر کچھ لکھو ..... میں اُن سے اجازت لے آیا ہوں .... ایک مجلّہ نکال رہا ہوں ..." میں گویا ہوا "نعیم بھائی! تابش صاحب کی اجازت سر آنکھوں پر بلاشبہ تابش صاحب کی شخصیت "قابلِ لکھت" ہے، مگر ..... میں لکھا ہوا پڑھ تو سکتا ہوں .... پڑھ کر لکھ نہیں سکتا" کہنے لگے "قیل و قال نہ کیجئے ..... آپ نے حال ہی میں ایک مضمون لکھا ہے جو میں نے پڑھا ہے ..... میں فلاں تاریخ کو مضمون کا منتظر رہوں گا .... اور بس" نتیجتاً یہ مضمون حاضر ہے۔ اگر اشاعت ہوگئی تو آپ سب پڑھیں گے ورنہ میں پڑھوں گا اور نعیم بھائی، چنانچہ بات کچھ یوں شروع کرتے ہیں :۔

"ماشاءاللہ بہت اچھا پڑھا آپ نے" "آواز بہت ریڈیائی ہے" ایک نہایت کلچرڈ اور کھنک دار آواز میرے کانوں میں آئی۔ مڑ کر دیکھا تابش صاحب بُراق کپڑے اور سیاہ ٹوپی میں میرے برابر کھڑے تھے۔ یہ جملے انہوں نے ایک مرثیے کی مجلس کے اختتام پر کہے جہاں میں علامہ جمیل مظہری کا تصنیف کردہ مرثیہ پڑھ کر ابھی منبر سے اُترا ہی تھا ... اور واقعہ ہے کم و بیش دو عشرے قبل کا۔ "جی جی، آداب .... شکریہ .... کوئی غلطی تو سرزد نہیں ہوئی ..." میں لکنت آمیز لہجے میں بولا "نہیں میاں، قطعی نہیں ... بہت صحت کے ساتھ پڑھا آپ نے" لیجئے صاحب دل کو ڈھارس ہوئی۔ سانسوں میں اعتدال آیا کیونکہ جناب مسعود الحسن تابش صاحب آغازِ مجلس سے زیرِ منبر تشریف فرما تھے اور حسبِ روایت انہماک سے سن رہے تھے، یہ زمانہ میرے تحت اللفظ مرثیہ پڑھنے کا ابتدائی زمانہ تھا اور مذکورہ مرثیہ میں نے بہت ہی محدود وقت میں پڑھنے کو تیار کیا تھا۔

"چلئے میاں! آج آپ کو سند مل گئی" میرے قریب کھڑے ہوئے میرے مشفق بزرگ و استاد سبطِ حسن انجم (کیسے لکھوں ان کے نام کے ساتھ مرحوم) نے فرمایا

تابش صاحب کی دل آویز شخصیت اور کلام سے میں یوں تو خوب واقف تھا اور کیوں نہ ہوتا،

نشستوں اور مشاعروں میں دیکھتا اور سنتا تھا۔ آمنا سامنا ہوتا تو میں آداب بجالاتا وہ نہایت شفقت وتپاک سے جواب دیا کرتے مگر اس طرح کا براہ راست ENCOUNTAR کبھی نہ ہوا تھا..... پھر کیا تھا ہم "بے" "گئے" گویا جوناتھن سوئفٹ کے لی لی پوٹین کی رسم وراہ ہو گئی گلیور سے۔ اور پھر یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ہمارے سارے بزرگ خانوادہ ایک ایک کر کے اُٹھ گئے تھے...... وہ بزرگ جو اپنے رہن، سہن نشست و برخاست میں ایک تہذیب ایک ادارہ تھے۔ جن کا اوڑھنا بچھونا شعر و ادب تھا جو "غلط العام" کے ساتھ "فصیح" لگانا بھی مکروہ اور ادبی بد دیانتی سمجھتے تھے۔ پھر ایسی محروم فضا میں کہاں جاتے الفاظ کے معنی و محل پوچھنے، کس سے پوچھتے اشعار کی تہہ داری..... کون سناتا غالب، فانی و جوش کے غیر مطبوعہ و ناشنیدہ اشعار اور ان کی محفل آرائیاں، قسمت نے یاوری کی اور تابش صاحب سے قربت ہو گئی..... وہی نفاست، وہی وضعداری، وہی علم و فن میں رچی بسی شخصیت..... وہی تلفظات پر گرفت..... اپنے بزرگوں کے نہ ہونے کا خلا پُر ہوتا سا گیا..... ایک نیازمندانہ تعلق پیدا ہوا جو الحمد للہ تا دمِ تحریر (تابش صاحب کی وضعداری کے باعث) قائم ہے۔

اب کچھ یوں ہوتا ہے کہ میں ٹیلیفون کرتا ہوں :-

"حضور! آداب....."

"بھئی جاوید میاں! کیسا مزاج ہے؟"

"جی دعا ہے آپ کی... حضور فلاں شعر..." ایک طویل انکوائری میری طرف سے ہوتی ہے اور اس کا مختصر مگر جواب مع حوالے کے تابش صاحب پیش کرتے ہیں۔

کبھی زیادہ مدت کی غیر حاضری کے بعد پھر فون کرتا ہوں۔ وہی مشفقانہ لہجہ۔

"کہاں رہے میاں آپ..... بہو کیسی ہیں..... بچے ٹھیک ہیں؟ وغیرہ..... وغیرہ"

ہم پھر مُدعا بیان کرتے ہیں پھر وہی تشفی بخش جواب ملتا ہے۔

اگر کہیں طویل عرصے بعد ملاقات ہو جائے تو آداب و سلام کے بعد فرماتے ہیں

"اماں، وزن بڑھ رہا ہے... بھئی ورزش کو اپنے معمولات میں ضرور داخل کریں اور ہاں صاحب عمر کے ساتھ ساتھ تقلیلِ غذا بھی ضروری ہے" اور اس کے بعد جہاں آپ نے سگریٹ کا پیکٹ ٹٹولا، فرمائیں گے "ذرا سگریٹ نوشی پر نظر رہے۔"

اور پھر ایسی محبت بھری نصیحتیں کہ کچھ نہ پوچھئے، ایک ایک لفظ محبت میں ڈوبا ہوا :-

ع آہنگِ صد ہزار دُعا می رسد بہ گوش

دل چاہتا ہے گلے سے لگ جاؤں مگر اُن کے بُراق کپڑوں کو دیکھ کر ٹھٹک سا جاتا ہوں، ہاں کپڑوں کی نفاست پر یاد آیا کہ بالعموم شعراء اور ادباء کو دیکھتا ہوں کہ بزعم خود "کڑک" مگر جامہ شکن در شکن تابش صاحب کو جب دیکھتا ہوں جہاں دیکھتا ہوں خود بصد انکسار مگر کپڑے "کڑک" اُجلے اُجلے، بے سلوٹ کہیں بھی تو شکن نہیں (ماسوائے جامہ ہستی کی آستین جو کہ گذرتے ہوئے وقت نے بڑے سلیقے سے چُنی ہیں) تابش صاحب اپنی پیشانی پر ہی کچھ سلوٹیں لائیے 'اتنے بڑے ادبی GiANT ہیں آپ' تحفہ کارکردگی بھی مل گیا اب تو آپ کو"۔

"اماچھوڑو! بڑی صرف اللہ کی ذات ہے" تابش صاحب کے ستو جواب کا ایک جواب۔

بیشک ع

آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہُنر

بات انکساری کی چل نکلی تو اس کا ایک اور رُخ دیکھئے 'اپنے مجموعہ کلام "ماہِ شکستہ" کے "حرفِ آغاز" میں الفاظ کے دروبست پر بحث کرتے ہوئے نئے شعراء کو اس کے رموز سمجھاتے ہیں اور مثال میں کوئی چھ مصرعے ایسے لکھتے ہیں جہاں الفاظ کے دروبست کی بے احتیاطی سے ذم کے پہلو نکلتے ہیں۔ جناب اچھا لکھا ..... مگر آخر میں اِس جملے کو شامل کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ "اِن مثالوں میں بیشتر مصرعے میرے اپنے ہیں"

ہاں صاحب اِس کو کہتے ہیں بڑائی۔ فی زمانہ اپنے لکھے ہوئے مصرعے اور سطروں پر خود تو کیا اور کیوں نظر جائے کوئی دوسرا بھی کسی جا پر جائز ٹوک دے تو...... اللہ، اللہ

"تابش صاحب کی شخصیت کا ایک یہ پہلو ملاحظہ فرمائیے گرچہ کہ یہ بہت نجی پہلو ہے مگر کیا کروں کہ لکھنے کو دل چاہتا ہے اور یہ منظر میں نے بارہا دیکھا ہے رشک کے ساتھ کہ تابش صاحب صحبت کی قضا روا سمجھتے ہیں نماز کی نہیں، اِدھر مؤذن "حَیَّ عَلَی الفلاح" تک پہونچا اُدھر تابش صاحب کسی محفل کسی مجلس میں بیٹھے ہوں جھٹ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایک گوشہ تلاش کرتے ہیں اور پھر "یہ" ہیں اور "وہ" ہے۔

حضرت کی شخصیت کے اور بہت سارے پہلو ہیں جو قابلِ ذکر ہی نہیں بلکہ لائق تقلید بھی ہیں مگر کیا کروں اگر لکھتا ہوں تو مضمون خاصا طویل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اِس شعر پر شخصی پہلو کا اختتام کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہوں۔ ؏

توئی آفتاب و چشمم بجمالِ تُست روشن ؎ اگر از تو باز گیرم بہ کہ چشم باز دارم

تابش صاحب، شعری و ادبی حیثیت اور میں؟

میں اپنے آپ کو قطعی اس کا حقدار نہیں سمجھتا کہ تابش صاحب کی شاعری یا نثر نگاری اور اس

محاسن پر کوئی تبصرہ رقم کروں ہاں اپنی پسندیدگی اور رائے کا "استحقاق" ضرور رکھتا ہوں۔

تابش صاحب صرف غزل کے شاعر نہیں بلکہ دیگر اصناف سخن حمد، نعت، منقبت، سلام، مرثیہ اور نثر نگاری پر وہی گرفت رکھتے ہیں جو غزل پر۔ آپ کے مختلف مجموعہ ہائے کلام چھپ چکے ہیں اور علماء و حیات نے اُس پر مقدمے اور پیش لفظ تحریر فرمائے ہیں، میرے لئے اس باب میں کیا گنجائش ہو سکتی ہے (....کا شور بہ) ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ غزل ہو یا کوئی اور صنف اُن کی شاعری میں شائستگی کے ساتھ کلاسیکت، معنی کی گہرائیاں اور تفکر ہے خود جتنے نفیس، سنجیدہ و باوقار ہیں مصرعے بھی ویسے ہی "کیا مجال جو کہیں بھی".... ذرا میرے پیر داب تو دیے یا.. "منہ سے مجھے بتا کریوں" جیسے معاملات ہوں، اگرچہ شاعری کے سارے INGREDIENTS ہیں مگر باوقار۔

آئیے تابش صاحب کے چند خالص غزلیہ اشعار پڑھتے ہیں۔

عہدِ گل گزرے بہت مدت ہوئی تابش مگر ؛ زیرِ دیوارِ چمن اب تک کوئی دیوانہ ہے

یا ؎ دل کا مٹنا ہے سانحہ لیکن ؛ ختم اک عہدِ آرزو تو ہوا

یا ؎ ہائے یہ ناز خرامی تیری ؛ ہر قدم پر مجھے سر یاد آیا

خالی خالی ہے تری راہگذار ؛ تابش خاک بسر یاد آیا

اب آئیے غزل کے وہ اشعار پڑھتے ہیں جہاں معنی آفرینی بھی ہے اور اسرارِ کائنات پر تفکر بھی

؎ بڑھ گئیں حیرانیاں بھی جلوہ ارزانی کے ساتھ ؛ تیرا اِک اِک آئینہ ہے آئینہ خانہ مجھے

یا

میں دیکھتا ہوں کچھ نظر آتا ہے کچھ مجھے ؛ نظروں کو اعتبارِ تماشا نہیں رہا

چلئے اب نعت گوئی کی امتحان گاہ میں چلتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ تابش صاحب یہاں کس کامرانی سے عہدہ برآ ہوتے ہیں، بلاشبہ نعت گوئی ایک کٹھن راہ ہے، یہ "با محمدؐ ہوشیار" کا مرحلہ ہے۔ بڑے بڑے سکندروں نے یہاں ٹھوکر کھائی ہے کیوں نہ ہو معنی کے بجائے لفظوں کی کاریگری میں یہی ہوتا ہے مگر تابش صاحب کی محتاط طبیعت اور "فنافی عشق رسولؐ" کیفیت نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ تابش صاحب کی نعتیں پڑھئے اکثر نعت غزل آمیز ہے۔ اللہ اللہ کتنا مشکل کام ہے، لہجہ غزل کا اور ذکر رحمۃ العالمین کا۔

ملاحظہ فرمایئے "غزلیہ نعت" کے دو اشعار

؎ گئی ہے لے کے جس دن سے نبیؐ کی بوئے پیراہن ؛ نسیم خلد اس دن سے نہ جانے کس ہوا میں ہے

یا ؎ کر کے اُس زلفِ معنبر کا خیال ؛ اپنے ہر عقدے کو وا کرتا ہوں

ایک اور شعر نعت کا دیکھئے اور غالب کے "دشتِ امکاں" جی ہاں وہی "پا پایا" والے شعر کو ذہن

میں رکھتے ۔ ؎

بھٹکتے پھر رہے ہیں جانے کب سے دشتِ امکاں میں ٭ مگر منزل ہماری اُن کے پاتے رہنما میں ہے۔

دیکھا آپ نے کتنا سہل کر دیا تابش صاحب نے سارے معاملے کو۔۔ ہر کلمہ گو آنحضرتؐ کی شفاعت کا امیدوار بھی ہے اور حقدار بھی اور تابش صاحب بھی اس کے امیدوار اور حقدار ہیں مگر اس معاملے میں وہ کسی قسم کا "چانس" لینا نہیں چاہتے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

خطاؤں نے ہماری لاج رکھلی بر سرِ محشر ٭ گناہوں سے ملا ہے ہم کو حق انکی شفاعت کا

فی زمانہ صنفِ "سلام" عمومی طور پر کچھ زیادہ بحث و غور طلب نہیں ہے، یہ اور بات کہ کہا سب نے کسی نے عقیدۃً کسی نے محض طبع آزمائی کے لئے، اساتذہ سے آج تک کے سلام دیکھ جائیے۔ وہی دس بارہ پندرہ اشعار سیدھے سادھے۔ بے ثباتی کائنات کے۔ بیچ میں ایک دو منبکی شعر مثالِ مجالس کے لئے اور بس معنوی گہرائی اور سلام! نا صاحب! نا! ہوگا مگر خال خال۔ اب تابش صاحب کے سلام کے مندرجہ ذیل اشعار دیکھئے اور فیصلہ کیجئے کہ کیا یہ صرف طبع آزمائی کے لئے لکھے گئے ہیں یا پھر تہذیب غم کی حرمت ہیں

؎ جب سے جانا ہے کہ شبیرؑ سے نسبت ہے اسے ٭ اپنی تہذیب میں ہم حرمتِ غم رکھتے ہیں
ماجرا قتلِ علمدار کا لکھیں گے وہی ٭ جو قلم رکھتے ہیں جو ہاتھ قلم رکھتے ہیں

یا

معرکے سارے حق و باطل کے اس کے معرکے ٭ کتنی لامحدود ہے کتنی کشادہ کربلا

یا

عابدِ بیمار تو چلتے رہے چلتے رہے ٭ اس سفر کی منزلوں میں وقت تھک کر رہ گیا

اور اب اختتام مضمون پر تابش صاحب کے مرثیہ بعنوان "آگ" سے چند بند پڑھتے ہیں اور پھر آپ مجھ سے اتفاق کریں کہ ہمارے کثیر التصنیف مرثیہ نگاروں کے مقابلے میں تابش صاحب مسدس کی تشکیل و منطقی تسلسل اور مرثیے کے مزاج اور تقاضوں سے کس قدر فزوں آگاہ ہیں۔ انہیں یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ مرثیہ کے الفاظ کیا ہیں اور بند میں چوتھے مصرعے اور گٹھی ہوئی بیت کی کیا اہمیت ہے کہ جہاں کوئی بیت ڈھیلی پڑی اور وہ بند چاہے کتنا ہی اعلیٰ مضمون ہو بے مزا ہو جاتا ہے (ہمارے بھائی نصیر ترابی صاحب ایسے مصرعے اور بیتوں کو لیٹی ہوئی بیتیں کہتے ہیں)

سب سے اہم بات جو تابش صاحب کو دوسرے مرثیہ نگاروں سے جُدا اور ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ تابش صاحب نے مرثیے کو اپنے عقیدے کی روشنی میں لکھا ہے سماعت کے عقیدے پر نہیں۔

اپنے مرثیے "آگ" کی تشکیل تابش صاحب نے کچھ یوں کی ہے کہ پہلے حمد و نعت پھر منقبت اور اس کے بعد تکوینِ کائنات پر غور کرتے ہوئے چاروں عناصرِ اربعہ کو حکیمانہ و شاعرانہ برتتے ہوئے ان عناصر کے مثبت و منفی پہلوؤں کا ذکر کرتے ہیں اور پھر آگ سے کربلا کو گریز کیا ہے۔

آیئے پڑھتے ہیں حمد کے سلسلے کا ایک بند

واحد بھی تو وحید بھی تو طاق بھی تو ہی ؛ پروردگارِ انفس و آفاق بھی تو ہی
مورد ملخ کا رازق و رزّاق بھی تو ہی ؛ تو ربِّ نور، آگ کا خلّاق بھی تو ہی
توقیرِ کعبہ، آبروئے دیر تجھ سے ہے
اے ربِّ خیر و شر، یہ شر و خیر تجھ سے ہے

نہیں! ٹھہریئے! اس بند کے چھٹے مصرعے سے یوں سرسری نہ گزر جائیے دیکھئے "ربِّ خیر و شر" لکھا ہے آگے چل کر عناصرِ اربعہ کے مثبت و منفی پہلوؤں کا ذکر آئے گا۔

اب نعت کا ایک بند دیکھئے۔ الفاظ کی شوکت اور ندرت اور نعتیہ مناسبت اور صفتوں کی یکجائی پر یہ بند دادطلب ہے۔ ع

ختمِ رسل، شفیعِ امم، سیّد البشر ؛ عیسیٰ نفوس، صاحبِ اعجاز، چارہ گر
خیرِ کثیر، بحرِ سخا، کیمیا نظر ؛ مولیٰ صفت، فرشتہ شمائل، ملک سیر
سالارِ فوج، صُفّہ و منبر کی زین بھی
طائف بھی اُس کی راہ میں بدر و حنین بھی

ذرا سالارِ فوج، صُفّہ و منبر کی زین اور طائف اور بدر کے CONTRAST پر غور کرتے جایئے۔

حضرت علیؑ کی شان کا بند ملاحظہ فرمایئے۔

خوش طبع خوش مزاج و خوش اطوار و خوش سیَر ؛ دستِ قوی میں زورِ یداللہ سربسر
قبضے میں ذوالفقار سی شمشیرِ معتبر ؛ شوہر ہے فاطمہؑ کا تو حسنینؑ کا پدر
کس ایک ذات کو یہ جہاں میں شرف ملا
بیٹے کو کربلا ملی خود کو نجف ملا

اس بند میں کس قدر شاعرانہ حسن ہے اور پھر شمشیرِ معتبر لکھنا صرف تابش صاحب کا حق ہے تامل ہے تو چلیئے آپ کی تشفی خاطر اسی مرثیے کے ایک بند (بسلسلۂ منقبتِ علیؑ) کے چوتھے مصرعے اور بیت کو نقل کرتا ہوں

اُس کا عمل جہاد بھی ہے اجتہاد بھی
رکھے نہ کیوں جہاد پر ایمان کی طرح
نازل ہوئی ہے تیغ بھی قرآن کی طرح

مضمون کی طوالت کا خیال ہے اور پریشان ہوں کہ کون سا بند آپ کو سناؤں کون سا نہ سناؤں ورنہ درحقیقت اس مرثیہ "آگ" کا ایک ایک بند سیر حاصل گفتگو کا متقاضی ہے، جی ہاں ایک بند اور سنیئے جو عنصر "آگ" سے متعلق ہے اور جہاں سے تابش صاحب نے خوبصورتی سے اصل مرثیہ کی طرف گریز کیا ہے فرماتے ہیں

پہونچی جو طور پر تو شرر بار ہو گئی ؛ پایا کوئی خلیلؑ تو گلزار ہو گئی
جنت کبھی بنی تو کبھی نار ہو گئی ؛ خود بھی تضادِ ذات کی پیکار ہو گئی
ملتا ہے اختلاف جو اسکی صفات میں
ہیں لاکھ کربلائیں اسی سے حیات میں

میدان کربلا کی منظر کشی دیکھئے اور بھرپور کلاسیکی مرثیہ کا لطف اٹھایئے۔

وہ مہرِ نیم روز کی حدت کہ الحذر ؛ دہکے ہوئے ہیں دشت کے سارے شجر حجر
انگارہ ہر خذف ہے، تو شعلہ گُل و ثمر جلتے ہیں ہر پرند کے پر مارنے سے پر
آبِ فرات میں بھی عجب التہاب ہے
گرمی سے پائے موج کا چھالا حباب ہے

کربلا میں خیامِ اہلبیتؑ کو جلانے والی آگ کی بابت مصطفےٰ زیدی مرحوم محض شاعرانہ ترنگ میں "یزیدی جاہ" لکھ سکتے ہیں۔ تابش صاحب نہیں وہ اسے "یزید کا جہنم" ہی لکھیں گے، دیکھئے بند۔

ہیں سامنے نگاہ کے جلتے ہوئے خیام ؛ شعلوں سے ٹمٹمایا ہوا ہے سوادِ شام
چرخِ کبود جن کی لپٹ سے ہے لالہ فام ؛ پھر بھی نہیں ہے سرد ابھی جوشِ انتقام
منظر نظر کے سامنے ہے کربِ دید کا
خیموں کی آگ ہے کہ جہنم یزید کا

اور آخر میں چلتے چلتے ایک اور بند دیکھئے مرثیت سے بھرپور، میرا دعویٰ ہے کہ اگر اس بند کو کسی بھی دبستانِ انیس کے کلاسیکی مرثیے میں خلط ملط کر دیا جائے تو چھانٹنا ممکن نہ ہوگا۔

عباسؑ و قاسمؑ و علی اکبرؑ نہیں رہے ⁂ عونؑ و محمدؑ و علی اصغرؑ نہیں رہے
جانِ حسنؑ، حسینؑ کے دلبر نہیں رہے ⁂ اے کربلا وہ تیرے بہترؑ نہیں رہے
اس وقت دستگیریٔ زینبؑ کو آئے کون
جنگ گاہ سے حسینؑ کا لاشہ اٹھائے کون

بس اب ہم ع
کمیتِ قلم کی عناں کھینچتے ہیں۔
اور یہ بستہ اعتراف و سپاس بند ہوا چاہتا ہے ـــــ اور میں کہ ایک ادنیٰ آرزومند اس دعائیہ آرزو کے ساتھ رخصت ہوتا ہوں کہ اے ربِ قرطاس و قلم، اے مالکِ ہر طبل و علم اور اے پروردگارِ حرف و ظرف جس چشمِ لطف سے تو نے تابش کو تابش کیا ہے اسی توجۂ انتخاب سے تو میرے اور میرے بعد آنے والوں کے لئے تابش کے سائے کو سائبان کر دے، ایسا سائبان جس کی پناہ میں میری تہذیب آلائشوں کی تمازتوں سے محفوظ ہو کر ہموار و استوار ہونے کی اہل ہو جائے (امین)

○

مسلم شمیم

اعتبارِ غزل

تابش یہ کم نہیں ہے کہ اس آن بان سے
اس عہد میں ہو زندہ دلِ مبتلا کے ساتھ

حضرت تابش دہلوی کا یہ مقطع ان کے دوسرے مجموعۂ غزلیات "چراغِ صحرا" کا آخری شعر ہے۔ یہ شعر ان کے فکری و فنی رویوں کا یکساں ترجمان و نمائندہ ہے جس سے ان کی شخصیت و فن کے مختلف النوع پہلوؤں کی نشاندہی ہوتی ہے ان دو مصرعوں میں ان کا عصری شعور بھی قاری پر منکشف ہوتا ہے اور زندگی برتنے میں اثباتیت کی اہمیت بھی اجاگر ہوتی ہے۔ بظاہر انتہائی سادگی سے اپنے عہد کے کرب آگیں حقائق کا اظہار شاعر نے کیا ہے لیکن قاری ان دو مصرعوں کی تہہ داریوں میں تفکر کرے تو وقت کے سفر اور مراحل سفر کے نو بہ نو مناظر اس کی آنکھوں کے سامنے آئیں گے اور معاشرے کے خدوخال کن تجربات و حوادث سے دوچار ہو کر تشکیل پذیر ہوئے ہیں وہ بھی راز نہیں رہیں گے، ادب اور سماج کے رشتوں کی قدر و قیمت کا بھرپور ادراک شاعر کے فن کے حوالے سے عمومی نقطۂ نظر کا مظہر ہے۔ اظہار و ابلاغ کے تمام تر التزام میں متوازن روش کے ساتھ شاعری اور رشتہ درد کا تعلق "دلِ مبتلا" کی ترکیب میں کمال ہنرمندی سے بیان ہوا ہے۔ جناب تابش کی شاعری جذبہ و احساس کی صداقتوں کی علمبردار بھی ہے اور سماجی اقدار کی آئینہ دار بھی۔ ان کے ادب زندگی کا ترجمان بھی ہے اور تنقیدِ حیات بھی۔ دروں بینی کے ساتھ ان کے ہاں ہر مقام پر گرد و پیش اور سماجی زندگی کی تلخ و شیریں حقیقتیں قاری کو اپنی طرف متوجہ رکھتی ہیں اور مطالعہ حیات کا سلیقہ اور شعور بخشتی ہیں اور بدترین حالاتِ زندگی اور انتہائی ناخوشگوار ماحول میں بھی آن بان سے جینے کی دعوت دیتی ہیں۔

زیرِ نظر شمارہ حضرت تابش دہلوی سے منسوب ہے۔ کراچی کی ادبی دنیا آج جن چند شخصیتوں کے حوالے سے جانی پہچانی جاتی ہے۔ ان میں جناب تابش دہلوی کا نام بہت نمایاں بلکہ بہت روشن تر نام ہے۔ انہوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز ۱۹۲۳ء سے کیا۔ گویا ان کا یہ سفر کم و بیش سات دہائیوں سے جاری ہے اور ہماری اور ہمارے قارئین کی دلی تمنا اور دعا ہے کہ ان کا یہ سفر تادیر اسی آن بان سے جاری رہے تاکہ شاعری کا بالعموم اور غزل کا بالخصوص اعتبار اور بھرم قائم و دائم رہے اور فکرِ تابش سے اُفقِ شعر و فن کی تابندگی فزوں تر ہوتی رہے۔

شمارہ میں شامل ان کے کوائف ذات کے مطالعہ سے قارئین پر تابش صاحب کی فکر و شعور کی تربیت میں ان کے گھریلو ماحول کا کردار اور اثرات منکشف ہو جاتے ہیں۔ وہ دہلی کے ایک انتہائی ثقہ اور مستند ادبی خانوادہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انتہائی کم سنی میں ان کے ادبی سفر کی خبر قاری کو کسی حیرت و استعجاب میں مبتلا نہیں کرتی بلکہ مطمئن کرتی ہے کہ فرد کی ذہنی اور شعوری تربیت و تشکیل میں سماج کی بنیادی اکائی یعنی خاندان کا بڑا اہم کردار ہوتا ہے۔ چنانچہ جس علمی و ادبی ماحول میں جناب تابش نے آنکھ کھولی ان کا ادب و شعر سے عہدِ طفولیت سے چولی دامن کا ساتھ ہونا ایک فطری و منطقی بات ہے۔ وہ ۱۹۱۱ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم لکھنو اور حیدرآباد دکن میں ہوئی۔ ۱۹۳۰ء میں دہلی سے میٹرک پاس کیا اور اٹھائیس برس بعد ۱۹۵۸ء میں کراچی یونیورسٹی سے گریجویشن کی سند حاصل کی ملازمت کا ۱۹۳۲ء سے ابتدائی عرصہ حیدرآباد دکن میں گذارا اور ۱۹۴۰ء میں دہلی میں ریڈیو سے وابستہ ہوئے۔ یہ ۱۹۸۰ء تک قائم رہی اور ریٹائرمنٹ پر منتج ہوئی۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد، ۱۹۴۷ء میں وہ کراچی آگئے اور یہیں کے ہو رہے۔

ان حقائق کا یہاں بیان کرنا میں نے اس لیے ضروری سمجھا ہے کہ جناب تابش کے ذہنی سفر اور شعوری زندگی کے ارتقائی عمل میں جو مختلف مقامات کی تہذیبی اور ثقافتی قدروں اور روایتوں کی کارفرمائیاں رہی ہوں گی ان کا صحیح تناظر میں قاری کو ادراک رہے۔ تابش صاحب کو برصغیر کے اہم ترین تہذیبی اور سیاسی مراکز میں زندگی گزارنے اور مشاہدات و تجربات سے دوچار ہونے کا موقع ملا۔ ان کا براہ راست اثر ان کی شخصیت اور فن پر مرتب ہونا عین قرینِ قیاس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تابش صاحب کی فکر و فن میں جو وسعت اور تنوع کا احساس ہوتا ہے۔ وہ ان کے سفرِ حیات پر دلیل ہے۔

حدیں آفاق کی چھو لی ہیں میں نے
بہت آپے سے باہر ہو گیا ہوں

خلوص و انکسار جو ان کی شخصیت کا نمایاں ترین وصف ہے۔ وہ ان کی شاعری کی بھی نمایاں اور امتیازی خصوصیت ٹھہرتی ہے۔ تعصب و تنگ نظری سے ان کی ناوابستگی، بلند نگہی، فراخ دلی، اور روشن خیالی کی لہریں ان کے فن کو نکھارتی اور سنوارتی ہوتی نظر آتی ہیں۔

لب پہ دنیا کی شکایت بھی نہیں ہو گئے ہیں ہم بھی دنیا دار کیا
دل کو رعنائی غم بھی دے دی آپ نے اپنے لیے کیا رکھا؟

سہل ممتنع میں تابش صاحب کو فن کے معیار جمال کو قائم رکھتے ہوئے شعری سحر کو جگانے کا خوب فن آتا ہے۔ سادگی میں فنی اور فکری پرکاری کی بہترین مثالیں ان کے دونوں مجموعۂ غزلیات "نیم روز" اور "چراغِ صحرا" میں کثرت سے ملتی ہیں۔ زبان و بیان پر غیر معمولی دسترس کا اظہار، ان کی شعری نگارشات میں ہر جگہ نظر آتا ہے اور مشکل تراکیب و لفظیات سے شاعری کو آزاد کرانا آسان کام نہیں ہے۔ یہ منزل بڑی مشق اور فنی پختگی کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ تابش صاحب کو یہ منصب حاصل ہوئے، عرصۂ دراز گذر چکا ہے۔ ان کے ہاں سادگی

ان کی فکر میں جو وسعتیں دکھائی
میں پُرکاری کے ساتھ تہہ داری کا عنصر وقت کے ساتھ غالب تر ہوگیا ہے۔
دیتی ہیں وہی ان کے اظہار و بیان میں دیکھی جاسکتی ہیں ان کی ذہنی تربیت ونشوونما میں پورے برصغیر
کے ثقافتی ورثے کی کارفرمائی رہی ہے۔ نتیجتاً ان کے طرزِ احساس اور طرزِ اظہار میں برصغیریت دکھائی
دیتی ہے۔ ان کے لہجہ اور شعری رویے میں کاسموپولیٹزم کا احساس موجزن ہے۔ جس سے برصغیر کے مختلف
تہذیبی مراکز کے دھارے اور رجحانات کا خوب صورت امتزاج اُبھرتا ہے۔
ان کے شعری رکھ رکھاؤ میں دبستان لکھنو اور دبستان دہلی کی جھلک بھی ملتی ہے اور حیدر آباد دکن کے
تہذیبی ماحول کا عکس بھی، کراچی کو تاریخ نے برصغیر کے تمام خطوں اور مراکز کے ثقافتی اور تہذیبی دھاروں کا
سنگم بنادیا۔ چنانچہ کراچی جناب تابش کے لیے بہ یک وقت لکھنو، دہلی اور حیدر آباد دکن کا نعم البدل ثابت
ہوا یہی وجہ ہے کہ جناب تابش کے یہاں وہ کشمکش اور کتاکش نظر نہیں آتی۔ جو دوسروں کی شخصیت اور فن
میں پائی جاتی ہیں۔ تابش صاحب کراچی کے کاسموپولیٹن مزاج اور کلچر سے کبھی نامانوس نہیں دکھائی دیتے۔
جناب تابش نے تمام تر اصناف ادب میں طبع آزمائی کی ہے۔ مگر غزل ہی ان کی اصل جولان گاہ اور
ان کی پہچان بنتی ہے۔ غزل بیشتر اردو شعرا کی طرح تابش صاحب کی سب سے پسندیدہ بلکہ محبوب صنف ہے
انہوں نے غزل سے اپنے عشق کو کبھی مخفی نہیں رکھا۔ "نیم روز" اور "چراغِ صحرا" غزلوں کے دو مجموعوں کے حرفِ آغاز میں
انہوں نے غزل کی بڑی مدلل وکالت کی ہے اور غزل سے اپنی بے پناہ وابستگی کا جواز مہیا کیا ہے۔ "نیم روز (مطبوعہ
۱۹۶۱ء) کے حرفِ آغاز میں انہوں نے تحریر کیا ہے کہ "ہماری شاعری کی اعلیٰ ترین صنف غزل ہے اور صرف
غزل ہی میں یہ خصوصیت ہے کہ وہ معاشی، معاشرتی سیاسی، غرض ان شعبہ حیات کو جن کا تعلق انسان، انسان
اور کائنات کے رشتوں سے ہے، اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے اور ان سے پیدا ہونے والے جذبات اور احساسات
کو لب اظہار بخشتی ہے"چراغِ صحرا" میں غزل سے دیرینہ عشق کے اظہار میں تابش کا لہجہ کچھ اور توانا اور
نکھرا ہوا ملتا ہے۔ ان کے لفظوں میں:
"غزل نے ہر دور میں اپنے دور کی ثقافت کی پوری پوری ترجمانی کی ہے غزل ہر دور میں سچی رہی
ہے اور سچی رہے گی۔ معاشرے کی عکاسی کا جو قرینہ غزل کو حاصل ہے وہ کسی اور صنف شعر کو میسر نہیں۔"
غزل کے ہمہ گیر ارتقائی سفر میں بقول تابش "غزل کی موجودہ ترقی کو کسی ایک تحریک، کسی ایک
مکتبہ خیال یا کسی ایک شخصیت سے منسوب نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی ترقی میں دلی، لکھنوی کے مکتبہ شاعری کا
ہاتھ نہیں ہے بلکہ ہر وہ خطۂ زمین جہاں اردو کا رواج ہے شامل ہے" غرض یہ کہ تابش کے شعری ورثے میں
غزل کو جو خاص منصب حاصل ہے، اس پر دو رائیں قائم نہیں کی جاسکتیں۔ ہر چند کہ ان کے ہاں غزل کا کلاسیکی
رنگ غالب اور حاوی رنگ کا درجہ رکھتا ہے۔ مگر ان کے شعر و فن کا غائر مطالعہ کرنے کی صورت میں بیسویں
صدی میں غزل میں جو رجحانات اور رویے اُبھرے، جس طرزِ احساس کو جگہ ملی، جو حسیت برتی گئی، جو لہجہ اپنایا
گیا اور جن لفظیات کو اعتبار حاصل ہوا۔ تابش صاحب ان تمام تغیرات اور تبدیلیوں سے صرف باخبر نہیں رہے

بلکہ انہوں نے خودکو ان سے متعارف رکھا۔ بلکہ انہیں اپنے شعروفن میں کامیابی کے ساتھ برتا بھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان نگارشات میں ہم عصر زندگی اور ہم عصر فنی محاسن ولوازمات پوری آب وتاب کے ساتھ دکھاتی دیتے ہیں۔
غرض یہ کہ جناب تابش کی شاعرانہ زندگی جو گذشتہ سات دہائیوں پر محیط ہے، خوب سے خوب تر کے سفر پر آج بھی گامزن ہے۔ وہ آج بلاشبہ برصغیر کے ان کے بزرگ ترین شعراء میں سے ہیں جنکو مسلم الثبوت استاد فن کا منصب حاصل ہے اور اردو کا شعری سرمایہ جن کے جواہر پاروں سے دقیع تر گردانا جاتا ہے۔

جناب تابش دہلوی کی ذات صحافت اور ادب میں جانی پہچانی ہے۔ اصناف ادب اور شعر وسخن میں، موصوف کو استادانہ حیثیت حاصل ہے ان کے کلام کا کچھ حصہ اب تک شائع ہو چکا ہے اور اب نعت، منقبت، سلام اور مرثیہ کا مجموعہ زیر طبع ہے۔ اس میں جابجا تاریخی حقائق کی طرف اشارے بھی ہیں اور اخلاق وسیرت کے پاکیزہ رخ بھی۔ جناب تابش کے مزاج میں قدیم وجدید ادب، دونوں کی چاشنی ملتی ہے اور سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ موصوف کے اشعار میں صرف قافیہ اور ردیف کی پابندی ہی نہیں بلکہ ان میں زندگی کے شعلے اور ذہن جدید کے تقاضے بھی پورے ہوتے ہیں اور پڑھنے یا سننے والے کو تخیلات کی نئی نئی وادیاں اور جنون زندگی کے حیات آفرین ولولے بھی ملتے ہیں۔

امید کہ حضرت تابش کے کلام کی قدر ومنزلت صحیح معیار پر کی جائے گی

علامہ سید محمد رضی

ڈاکٹر شکیل نوازش رضا

تابش دہلوی: فکر و فن

کسی شاعر یا ادیب کے فکر و فن کا تجزیہ، تشریح و تعبیر کرتے وقت ان عوامل، محرکات، سیاسی و سماجی، واقعات، و تحریکات شخصی واقعات اور ذہنی روش اور شعور کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ جس سے تاثر قبول کر کے کوئی فن کار واقعی فنکار بنتا ہے شعر و ادب اور فن کی نمود خون جگر سے ضرور ہوتی ہے لیکن فن کو صرف وجدان اور الہام کی دین نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اور نہ ہی فرائڈ، ایڈلر اور ینگ کے نظریات کو تسلیم کرتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ شعر و ادب دراصل خفتہ جذبات کو لاشعور سے شعور میں لا کر ان جذبوں کے اظہار کی شعوری کوشش ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ شاعر و ادیب جس سماجی زندگی میں سانس لیتا ہے اس سے اثر قبول کر کے اپنے فن میں اسے سمو کر پیش کرتا ہے۔ تاکہ ایک انسان دوسرے انسان کو سمجھ سکے۔ اس کرۂ ارض پر آدمی کے لیے انسان بن کر زندگی گزارنے میں معاونت ہو سکے۔

تابش دہلوی کے فکر و فن کا تجزیہ کرتے وقت سب سے پہلے جو بات ذہن میں آئی وہ یہ تھی کہ پہلے ان عوامل، محرکات، واقعات اور شخصیات کا مختصراً جائزہ لیا جائے جن سے متاثر ہو کر تابش دہلوی نے شعر و ادب میں جگمگاتے ہوئے چراغ روشن کئے ہیں۔

تابش دہلوی کا فن نصف صدی سے بھی زیادہ عرصے پر محیط ہے۔ وہ شاعر بھی ہیں اور نثر نگار بھی، انہوں نے شاعری کی تقریباً تمام اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ نثر تحریر کرتے ہوئے انہوں نے خاکہ نگاری بھی کی ہے۔ یادداشتیں بھی قلم بند کی ہیں اور تنقیدی مضامین بھی تحریر کئے ہیں۔ یعنی وہ تخلیق کار اور تنقید نگار دونوں ہیں۔ لیکن بنیادی طور پر وہ شاعر ہیں اور شاعری ان کی شناخت کا ذریعہ ہے۔ لہٰذا یہاں پر مختصراً تمام حوالوں سے تابش دہلوی پر اظہار خیال کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یقیناً یہ مختصر سا مضمون تابش دہلوی کے فکر و فن کا احاطہ کرنے کی ناکام کوشش ہے۔

تابش دہلوی کے شعری سفر کا آغاز جس دور سے ہوا اور آج جب کہ وہ شعر و ادب کی بلندی پر گامزن ہیں، کا مختصراً جائزہ لیا جائے۔ تو ان کی فکری اساس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

جب برصغیر میں سیاسی افق پر آزادی کی لہر زوروں پر تھی۔ دوسری جنگ عظیم کی آمد آمد تھی۔ تحریک خلافت دم توڑ چکی تھی۔ تحریک پاکستان کا آغاز ہو چکا تھا۔ اودھ شاہی کی بساط الٹ چکی تھی۔ نظام حیدرآباد شاد و آباد تھے فن کار حیدرآباد دکن کی طرف مراجعت کر رہے تھے۔ سماجی زندگی میں انتشار تھا۔ شرافت خودداری، ایمانداری، صاف گوئی، سادگی اور بزرگوں کی تعظیم کو اعلیٰ اقدار سمجھا جاتا تھا۔

تابشؔ کی شاعری کی ابتدا اویس داغ کا دور ختم ہو چکا تھا ایک طرف اقبالؔ کی شاعری کا شہرا تھا تو دوسری طرف بے خود، سائل، حسرت، اصغر، فانیؔ اور جگرؔ کی شاعری کا چرچا تھا۔ جوشؔ و فراقؔ کی شہرت کا بھی آغاز ہو چکا تھا۔ رومانوی تحریک بھی زوال پذیر تھی۔ اور کچھ وقفے سے ترقی پسند ادبی تحریک کا بھی آغاز ہو چکا تھا۔ اور اس کے مقابلے پر حلقۂ ارباب ذوق کا وجود بھی عمل میں آیا تھا۔ اور سماجی زندگی میں ترقی پسند نظریات و افکار کا عمل دخل شروع ہو چکا تھا۔

ان حالات و واقعات اور شخصیات کے درمیان تابشؔ دہلوی کا شعور بیدار رہا۔ ان کے ذہن کی پرورش ہوئی۔ اور انہوں نے اپنی شاعری کا آغاز کیا۔ یہ بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا کہ ان کا خاندان بھی علمی و ادبی تھا۔ لہٰذا گھر کے ماحول نے بھی ان کے فکر و نظر کو جلا بخشی۔ اپنے دور کے مختلف افکار و خیالات، شخصیات و واقعات سے تاثر قبول کر کے جو شخصیت تعمیر ہوئی اس کا نام تابشؔ دہلوی ہوا۔

تابشؔ دہلوی کا خود یہ خیال ہے کہ ان کی شخصیت کی تعمیر میں سب سے زیادہ ہاتھ ان کی والدہ کا ہے وہ اپنی والدہ کے بہت زیادہ زیر اثر رہے ہیں۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ تابشؔ دہلوی اپنی والدہ سے متاثر رہے ہیں۔ کیونکہ کوئی ذی شعور اور حساس شخص ایسا نہیں ہو سکتا۔ جو اپنی والدہ سے تاثر نہ قبول نہ کرے اور یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ ماں کے دودھ کا اثر تو بہر حال ہوتا ہے۔

جن شخصیات نے تابشؔ دہلوی کو سب سے زیادہ متاثر کیا ان میں فانیؔ بدایونی کا نام سرفہرست ہے۔ قیام حیدرآباد دکن کے دوران وہ فانیؔ سے بہت قریب رہے ہیں اور فانیؔ سے انہوں نے بہت اثر قبول کیا ہے۔ ثبوت کے طور پر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے سب سے زیادہ مضامین فانیؔ کی شخصیت اور شاعری پر تحریر کئے ہیں۔
دوسری طرف تابشؔ دہلوی ریڈیو سے وابستہ رہے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے زیڈ اے بخاریؔ مرحوم کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور بخاریؔ صاحب کی سحر انگیز شخصیت کے اثرات بھی انہوں نے قبول کئے ہیں۔ اس کے علاوہ حلقۂ ارباب ذوق سے بھی وابستہ رہے ہیں اور اس انجمن کی ترقی و ترویج میں انہوں نے فعال کردار ادا کیا ہے۔ حلقۂ ارباب ذوق کے حوالے میراجیؔ کی دلچسپ شخصیت سے بھی ان کو قربت حاصل رہی ہے۔
ان شخصیات کا ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اندازہ لگایا جاسکے کہ تابشؔ دہلوی کا فکر و فن کن ٹیڑھے میڑھے، متضاد راستوں سے گزر کر اس منزل تک پہنچا ہے۔ ایک جانب فانیؔ ایسے روایتی شاعر ہیں اور دوسری طرف میراجیؔ ایسے اپنے دور کے جدید یے اور ان دونوں کے درمیان تابشؔ دہلوی کی شخصیت ہے جس نے دونوں کے فکر و مزاج کو پرکھ کر اپنے فکر و فن کو نکھارا۔ اب جب کہ وہ ردّ و قبول کی منزل سے گذر چکے ہیں تو ان کا فن کمال کے درجے پر فائز ہوا ہے۔
تابشؔ دہلوی کے فکر و فن کا تجزیہ کرتے ہوئے اس بات کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ ان پچاس برسوں میں برصغیر کی سماجی تاریخ جس نشیب و فراز سے گزری ہے۔ ان سب کے تابشؔ دہلوی ناظر و منظور ہیں۔
تابشؔ دہلوی نے فکر کے اظہار کے لیے فن شاعری کو وسیلہ بنایا لہٰذا ان کے فکر و نظر کا تجزیہ ان کی شاعری کے حوالے سے ہی زیادہ مناسب ہے۔ شاعری سے متعلق تابشؔ صاحب کا خیال ہے۔

شاعری احساسات کی زبان ہے۔ احساسات جب کسی جذبے کی صورت اختیار کرتے ہیں تو شعر وجود میں آتا ہے۔ جذبات بہیمانہ بھی ہوتے ہیں اور پاکیزہ اور لطیف بھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جذبات انسان کے باہمی رشتوں کے انفرادی اور اجتماعی شعور سے پیدا ہوتے ہیں اور انہی جذبات کو جب شاعری کا پیکر ملتا ہے تو وہ ادب کا لازوال سرمایہ بن جاتے ہیں۔" (نیم روز ص۱۵)

ایک دوسری جگہ کہتے ہیں:

شاعری کو شاعری ہی رہنا چاہیے۔ شاعر کے قلم کو چرواہا نہیں بننا چاہیئے۔ شاعری کے ذریعے ویسے بھی کوئی سیاسی انقلاب برپا نہیں ہوا ہے۔ شاعری نے قوموں کی تہذیبی، اخلاقی اور فکری سطح کو ضرور بلند کیا ہے اور آئندہ بھی ایسا ہوتا رہے گا کیوں کہ شاعری محبت کی زبان ہے اور یہ زبان ساری دنیا میں ایک ہی طرح سے بولی جاتی ہے جاتی ہے کیوں کہ محبت کا دائرہ کار سارے عالم انسانیت پر محیط ہے اس لیے ہم صرف محبت اور صرف محبت سے ہی اپنی بہیمانہ جذبات پر قابو پاسکتے ہیں۔" (نیم روز ص ۱۷)

تابش دہلوی کے ان افکار و خیالات سے اختلاف و اتفاق دونوں ممکن ہے، ہوسکتا ہے کچھ لوگ اس خیال سے قطعی طور پر اتفاق نہ کریں اور یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ کی نظر میں یہ نظریہ درست ہو۔ اس سے قطع نظر کہ تابش دہلوی نے شاعری سے متعلق جو خیالات و نظریات بیان کئے ہیں۔ ان کے ردّ و قبول کی منزل کیا ہے۔ یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ تابش دہلوی کی فکر یہ ہے کہ شاعری قوموں کی اخلاقی اور فکر سطح کو بلند کرنے میں معاون و مددگار ہے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جذبات انسان کے باہمی رشتوں کے انفرادی اور اجتماعی شعور سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ جذبات بہیمانہ بھی ہوتے ہیں اور محبت جس کا دائرہ سارے عالم انسانیت پر محیط ہے۔ اس سے ہی بہیمانہ جذبات پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تابش دہلوی شعر و ادب کی افادیت کے قائل ہیں۔ وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ اعلیٰ اقدار کی تہذیب و تربیت میں شاعری معاون و مددگار ہے۔ یعنی وہ ترقی پسند نظریات کی نفی نہیں کرتے۔ یہ جملہ میں نے اس لیے تحریر کیا ہے کہ یاد رہے عہد جوانی میں تابش دہلوی حلقۂ ارباب ذوق سے وابستہ تھے۔

یہاں پر تابش دہلوی کی فکری اساس پر روشنی ڈالی گئی ہے اب ان کے افکار و خیالات کا ذکر ان کی شاعری کے حوالے سے کیا جائے گا۔ یعنی ان کی فکر ان کے حوالے سے تجزیاتی تجربے سے گزرے گی۔

تابش دہلوی کی شاعری اور نثری مضامین کے اب تک پانچ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی غزلیات کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ پہلے مجموعے کا نام "نیم روز" ایک دوسرے مجموعے کا نام "چراغ صحرا" ہے تیسرا مجموعہ منظومات پر مشتمل ہے جس کا نام "غبار انجم" ہے۔ چوتھا مجموعہ مذہبی شاعری سے متعلق ہے اس مجموعے میں نعت، منقبت، سلام اور مرثیہ ہے۔ اس مجموعے کا نام "تقدیس" ہے پانچواں مجموعہ "دید باز دید" ہے یہ ان کی تحریر کردہ نثری مضامین مشتمل ہے۔

یوں تو تابش صاحب نے نظمیں بھی تخلیق کی ہیں اور ان کی نثری تحریریں بھی بے شمار ہیں وہ صحافت سے بھی وابستہ رہے اور ریڈیو سے بھی لیکن غزل ان کی شناخت کا ذریعہ ہے۔ ایک غزل گو شاعر کی حیثیت سے ان کا درجہ بہت بلند ہے۔

جو لوگ تابش صاحب کی شخصیت سے واقفیت رکھتے ہیں اور جنہیں ان کی تھوڑی بہت بھی معرفت حاصل ہے وہ بہت

آسانی سے اس بات کو سمجھ سکتے ہیں کہ جو صفات، سنجیدگی، سحر انگیزی اور وقار تابش صاحب کی شخصیت رکھتی ہے۔ وہی خوبیاں ان کی شاعری میں بھی موجود ہیں اور یہ خصوصیات ہی تابش کی شاعری کی پہچان ہیں۔

یہ ایک حیرت انگیز بات ہے کہ تابش صاحب فانی بدایونی کے بے حد قریب رہے ہیں جیسا کہ پہلے ہی عرض کیا گیا ہے انہوں نے فانی پر کئی مضامین بھی تحریر کئے ہیں۔ وہ فانی سے ایک خاص قسم کی انسیت بھی رکھتے ہیں۔ لیکن وہ فانی کی فکر سے قطعی طور پر متاثر نہیں ہیں۔ ان کی شاعری میں فانی کی قنوطیت نہیں ہے۔ وہ زندگی کے رجائی فلسفہ کو تسلیم کرتے ہیں مایوسی ان کے یہاں کفر ہے۔ ان کا خیال ہے کہ :

کشتیاں کیا ہیں کناروں سے بھی ٹکرانا ہے　　　　ٹوٹنے پائے نہ قوت ابھی طوفان کی

زندگی کے اس اندھیرے میں اجالا چاہیئے　　　　صرصرِ غم دیکھتا دل ہی چراغِ خانہ ہے

یہ اور اس طرح کے بہت سے مصرعے کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تابش صاحب فلسفیانہ خیالات کے اظہار میں غالب سے زیادہ قریب ہیں اور سوز و گداز اور شیوۂ تسلیم کے عناصر کی موجودگی انہیں میر سے زیادہ قریب کرتی ہے جب وہ یہ کہتے ہیں کہ :

فنائے عشق میں زندہ ہوں، کوئی خضر نہیں　　　　کہ زندگی نہ ملے عمرِ جاوداں کے لیے

تو بے ساختہ غالب کی شاعری یاد آتی ہے اور جب وہ اس انداز سے کہتے ہیں کہ :۔

یوں تو دل کا قرار لٹ گیا　　　　گویا کوئی ساتھ چھوٹ گیا ہے

صبح سے پہلے بجھ گیا تابش　　　　ایک دل ہی چراغ خانہ تھا

تو میر تقی میر کی شاعری کا سوز و گداز، سادگی، ملائمیت، دھیما پن اور بے ساختگی ذہن میں گردش کرنے لگتی ہے تابش صاحب کے ہمعصروں میں اقبال، اصغر، حسرت، جگر، جوش اور فراق بھی تھے لیکن انہوں نے کسی سے تاثر قبول نہیں کیا۔ انہوں نے بالکل ایک نئی راہ نکالی۔ جس میں غالب کی بلند فکری اور میر کے انداز بیان کی جھلک نظر آتی ہے تابش دہلوی کا خیال ہے کہ "صرف غزل ہی میں خصوصیت ہے کہ وہ معاشی اور سیاسی غرض اور ان تمام شعبہ ہائے حیات کو جن کا تعلق انسان اور انسان اور کائنات کے رشتوں سے ہے اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے اور پھر ان سے پیدا ہونے والے جذبات اور احساسات کو لب اظہار بخشتی ہے"۔

تابش صاحب نے غزل سے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے تمام خصوصیات ان کی غزلوں میں نظر آتی ہیں۔ اس لیے ان کی غزلوں میں ایک انفرادی شان ایک سنجیدہ وقار ایک فلسفیانہ انداز نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری فکر و نظر

کامطالعہ کرتی ہے یہ وہ شاعری ہے جو دل سے دماغ کی طرف سفر کرتی ہے ان کے اشعار میں گہرائی اور گیرائی ہوتی ہے. وہ ایسی شاعری نہیں کرتے جو صرف روایت کی پاسداری کے لیے کی جاتی ہے۔ وہ روایت سے اپنا رشتہ استوار کرتے ہوئے جدید دور کے تقاضوں کو فراموش نہیں کرتے۔ ان کی شاعری روایت اور جدیدیت کا سنگم ہے۔ جب وہ اس انداز سے اشعار کہتے ہیں ۔

ہے کمی شوقِ شہادت میں دمِ قتل کہ ہم — قوتِ بازوئے قاتل نہیں ہونے پاتے
کس کو رہبر جانیں کس کو راہزن سمجھیں — آج رہبر و راہزن ساتھ چلتے ہیں
مجھے دھوکہ ہے بختِ نارسا یا بختِ دشمن کا — کہ ان کی ہر نظر مجھ تک غلط انداز آتی ہے
دلِ وحشی کو سکون بھی اک دن — ہو تو جائے گا مگر ہونے تک
میں جاں بلب ہوں اور غمِ فرقت بیاں طلب — سن لیجئے حالِ دل کہ ابھی تھوڑی رات ہے
میں وہ مجبور کہ مجھکو نہیں خود پر قدرت — تو وہ مختار کہ تو نے مجھے مجبور کیا

تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے روایت سے جو کچھ حاصل کیا ہے اسے اپنی بالغ نظری سے تجربہ کی کسوٹی پر کس کر جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرتے ہوئے اردو شاعری کو نئے رنگ و آہنگ سے روشناس کروانے کی کوشش کی ہے اور یہی ان کی انفرادیت ہے جو انہیں اپنے دور کے تمام شعراء سے متمیز کرتی ہے ۔

تابش دہلوی کی غزلوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ تحریر کرنا ایک عبث فعل ہے کہ ان کی غزلیہ شاعری میں داغ کے کلام کی سی شوخی اور رندی نہیں ہے ان کی عشقیہ شاعری میں ایک سنجیدگی اور متانت ہے اس میں معنویت اور فکری عنصر زیادہ ہے۔ غالب کا تفکر، میر کی ملائمیت اور نرمی اور فانی کی غم انگیزی کو جب تابش کی منفرد شخصیت سے آمیز کیا جائے تب تابش دہلوی کی شاعری اپنے منفرد انداز میں دل کے نہاں خانے میں جلوہ گر ہوتی ہے ۔

غزل میں جو رمزیت، اشاریت اور ایمائیت ہونی چاہیئے وہ تابش دہلوی کی نظروں میں بھی نظر آتی ہے تغزل عشق و محبت کے جذبات کا کھلے بندوں نئے انداز سے اظہار، تصوف، تفکر، فلسفۂ زندگی، حیات و ممات کے مسائل کا ذکر، جذبات و احساسات کے موجزن سمندر کو غزل کے اشعار کے کوزے میں بند کر کے پیش کر دینے کا فن تابش دہلوی کو بہت اچھی طرح آتا ہے ۔ ان کا انداز بیان دہلوی ہے اور ان کے کلام کی زبان میں بھی دہلوی رنگ اور رچاؤ ان کی غزل کی شناخت بنا ہوا ہے۔

ایک صورت زیبا سے ہیں لاکھ تمنائیں — اک حسنِ تصور سے ہے انجمن آرائی
روز ہوتا ہے یہاں تابش غروب آفتاب اک — کوئی داغ آرزو پھر بھی ہمارے دل میں ہے
فنا کی منزلوں میں بھی مراحل آئے ہیں کیا کیا — کہیں کہیں طوفاں سے گزرے، ہیں کہیں ساحل سے گزرے ہیں

دن بھی اب اس طرح گزرتے ہیں
جیسے فرقت کی رات ہوتی ہے

عیاں ہے اب کوئی دم میں نہاں ہے
مری ہستی غبارِ کارواں ہے

ہے آمدِ بہار مسلّم خزاں کے بعد
لیکن رہے گا دورِ خزاں بھی بہار تک

خانہ ویرانی کی صورت کیا ہو
گھر کی دیوار کے در ہونے تک

تیرا حسنِ حجاب ہے مقصود
جلوہ مدِ نظر نہیں ہوتا

یہ ایک حقیقت ہے کہ تابش دہلوی کی کوئی بھی غزل قاری کی نظر سے گزرے تو اسے فوراً یہ اندازہ ہو جائے گا کہ تابش کی غزل ہے کیوں کہ ان کی غزل کے اشعار کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ اندازہ ہوگا کہ غزل جس شاعر کی ہے وہ تفکر میں غالب سے قریب تر ہے لیکن رندی، سرمستی اور شوخی میں غالب سے مختلف ہے۔ اس کا انداز میر کی طرح دھیماپن لیے ہوئے اور جس طرح میر زندگی کے رجائی فلسفہ کو تسلیم کرتے ہیں اسی طرح یہ شاعر بھی۔ لیکن میر کے یہاں جو سلاست ہے اور نشریت ہے وہ اس کے یہاں نہیں ہے بلکہ اس کے یہاں ایک فلسفیانہ انداز ہے جو اسے فانی کے قریب کرتا ہے مگر فانی کے یہاں جو قنوطیت اور غم سے لذت حاصل کرنے کا جذبہ ہے وہ اس شاعر کو فانی سے متمیز کرتا ہے۔
یعنی یہ ایک ایسے شاعر کی غزل ہے جس نے تاثر سب سے قبول کیا ہے۔ لیکن پھر بھی اپنا ایک الگ راستہ بنانے کی کوشش کی ہے اور اس طرح وہ منفرد رہا ہے اپنے اس بیان کے ثبوت کے لیے تابش دہلوی کے کلام سے چند اشعار پیشِ خدمت ہیں۔

تابش غمِ جہاں غمِ دل سے مفر نہیں
قسمت میں وہ بھی تھا تری قسمت میں یہ بھی تھا

دلبری کے ہیں نرالے انداز
دل کے ہمراہ غمِ دل بھی گیا

شوق یاس افزا ابھی ہے شوقِ جانِ دل ہنوز
کچھ نہیں حاصل مگر اک سعیٔ لاحاصل ہنوز

ہم غبارِ رہِ جاناں ہو جائیں
عشق کے خاک بسر ہونے تک

جھکائی ہے حبیب سے جبیں ترے در پر
میری راہ دیر و حرم دیکھتے ہیں

انوارِ تجلی سے نظریں بھی تجلی ہیں
ہے آپ تماشا بھی اللہ رے تماشائی

تابش دہلوی کی غزل گوئی سے متعلق مختصر آبات وہی کہی جا سکتی ہے جو انہوں نے شاعری کے متعلق کہی ہے۔ یعنی ان کی غزل میں "سوز و گداز کے ساتھ پاکیزہ اور لطیف جذبات کا اظہار نظر آتا ہے۔ وہ بے معنی تمثیلوں کے ہجوم سے تخیل کو قدم قدم پر صدمہ" نہیں پہنچاتے۔ ان کی غزل "مسرت سے دوچار کرتی ہے۔ ان کی غزلوں میں خیال آفرین مناظر میں دلنوازی کے ساتھ ساتھ تازہ کاری ہوتی ہے اور انتشارِ خیال میں نظم و ضبط کے حصول کا ذریعہ ہے۔

تابش دہلوی کی غزلیہ شاعری جدید دور کے شاعروں کیلئے ایک زریں صحیفہ سے کم نہیں جس میں خلوص بھی ہے اور پیغمبرانہ شان بھی۔ جو آج کے دور کے شاعر کو یہ پیغام دیتی ہے کہ کس طرح غزل کے پامال شدہ راستوں پر انفرادیت کے قدم ثبت کیے جا سکتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے کہ تابش دہلوی نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے غزل ان کا پہلا عشق ہے لیکن انہوں نے نظم کو بھی فراموش نہیں کیا ہے۔ نظم گو شاعر کی حیثیت سے بھی ان کا ایک بلند مقام ہے۔ "غبار انجم" ان کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ جس میں ان کی مختلف قسم کی نظمیں شامل ہیں۔ موضوعات کے نقطۂ نظر سے اس مجموعہ میں ملّی نظمیں بھی موجود ہیں اس کے علاوہ بہت سی نظمیں ذاتی نوعیت کی ہیں۔ اور اس مجموعہ میں چند ہائیکو بھی ہیں تابش دہلوی کی نظمیں معرّا اور پابند دونوں ہیں۔ مگر میراجی کا ساتھ ہونے کے باوجود روایت سے اپنا دامن چھڑانے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ "غبار انجم" میں انہوں نے جو مختصر حرف آغاز تحریر کیا ہے اس سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بحر کی پابندیوں کے سختی سے قائل ہیں اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ شعر پابندیوں کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا۔ ہاں وہ یہ ضرور سمجھتے ہیں کہ نظم کا موضوع خود ہیئت تلاش کرتا ہے۔

تابش دہلوی کی نظموں کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ نظمیں تخلیق کرتے ہوئے ایک لمحہ کے لیے بھی اپنی پہلی محبوبہ "غزل" کو بھلا نہیں سکے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی نظموں میں غزل کی کیفیت موجود ہے۔ انہوں نے غزل کے تغزل، رمزیت، اشاریت، معنویت، ملائمیت، رچاؤ اور نغمگی کو اپنی نظموں کے موضوعات کے تنوع سے جوڑ کر منفرد انداز کی "غزل آمیز نظمیں" تخلیق کی ہیں۔ انہوں نے اپنی فنکارانہ چابکدستی سے زبان پر قدرت حاصل ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے خوب صورت نظمیں تخلیق کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر یہ ضرور یہ کہا جائے گا کہ ان نظموں میں غزل گو تابش کی صرف پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ وہ روشن تصویریں نہیں جو نظم گو شاعر کی حیثیت سے ان بلندیوں تک پہنچا دیں وہ ایک منفرد اور بلند پایہ نظم گو شاعر قرار دیئے جائیں۔ ان نظموں میں زبان کی صناعی، موضوعات کا تنوع، نئی تراکیب، استعارات و تشبیہات اور استادانہ فنکاری ضرور موجود ہے مگر خون جگر کی وہ گرمی نا پید ہے جو سل کو دل بناتی ہے۔ بہرحال ان کی نظم ماں، میراث آدم، جیون، تین روپ مسافر، عورت وغیرہ بہترین نظمیں ہیں جن میں جذبہ کی سچائی اور فنکار کی شاعرانہ دسترس کا اظہار بدرجہ اتم نظر آتا ہے اور یہ نظمیں ظاہر کرتی ہیں کہ تابش دہلوی اگر نظم گوئی کی طرف اس کافر غزل سے ہاتھ چھڑا کر توجہ دیں تو نظمیہ شاعری میں بھی گراں بہا اضافے کر سکتے ہیں۔

اگرچہ یہ مضمون طویل ہوتا جا رہا ہے لیکن ضروری معلوم ہوتا ہے کہ چند سطریں تابش دہلوی کی مذہبی شاعری کی متعلق تحریر کی جائیں کیوں کہ ان کا ایک شعری مجموعہ بعنوان "تقدیس" شائع ہو چکا ہے جو مذہبی شاعری پر مشتمل ہے اس مجموعہ میں نعتیں، منقبتیں، سلام اور ایک مرثیہ شامل ہے۔

مذہبی شاعری عقیدتاً کی جاتی ہے اور عقیدہ جتنا راسخ ہوتا ہے اور عقیدت جتنی گہری ہوتی ہے مذہبی شاعری

اتنی ہی دل میں اتر جانے والی اور گھر کر لینے والی ہوتی ہے بقول ابو الخیر کشفی تابش کے مرتبہ نعت میں شاعرانہ محاسن اور عقیدہ کی صحیح سمت ۔ دونوں چیزیں جمع ہیں"

یہ جملہ تابش دہلوی کی تمام مذہبی شاعری کے لیے درست اور مناسب ہے ۔ انہوں نے شاعرانہ فنکاری کے ساتھ اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے انداز بیان نہایت عقیدت مندانہ اور جذبات سے بھرپور ہے ۔ شدید جذبات کے اظہار کے لیے انہوں نے نئے نئے انداز اپنائے ہیں ۔ اپنی عقیدت و محبت کو ایک نئی زبان اور نئے لہجے میں پیش کیا ہے ان کی مذہبی شاعری بھی ان کے عظیم شاعر ہونے کا ثبوت فراہم کرتی ہے

سنتے ہیں کہ استاد فن ہونے کے لیے مرثیہ کہنا بھی ضروری ہے اس لیے شاید غالب کی پیروی کرتے ہوئے تابش دہلوی نے ایک مرثیہ بھی تصنیف کیا ہے یہ مرثیہ جدید مرثیوں میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتا ہے ۔ تابش دہلوی کے فکر و نظر اور شاعری کا مختصر اجائزہ لیتے ہوئے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نثر نگاری پر بھی اظہار خیال کیا جائے مگر اس مختصر سے مضمون میں یہ ممکن نہیں ہے کیوں کہ تابش دہلوی کا نثری سرمایہ بھی بہت کافی ہے اور وہ گراں قدر بھی ہے انہوں نے بھی تنقید کی ہے اور خاکے بھی تحریر کئے ہیں ساتھ ہی ساتھ ادبی نوعیت کی یادداشتیں بھی ضبط تحریر میں لائے ہیں ۔ اس طویل نثری سرمایہ کا تجزیہ یہاں پر نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی مناسب ۔ اس لیے صرف اتنا تحریر کر کے اکتفا کیا جاتا ہے کہ تابش دہلوی ایک منفرد نثر نگار بھی ہیں ۔ ان کی نثری تحریریں تاریخی اہمیت کی حامل ہیں ۔ کہ انہوں نے اپنے ہمعصروں پر تنقید و تبصرہ بھی کیا ہے اور ساتھ ہی اپنے دور کی ادبی تاریخ بھی جستہ جستہ تحریر کر دی ہے ۔ جو محققین کے لیے فائدہ مند ہے اور ادبی تاریخ نگاروں کے لیے ان کی حیثیت ایک دستاویز کی سی ہے ۔

مختصر یہ کہ تابش دہلوی کی نثر بھی خاصی اہم ہے ۔ اور اس پر اظہار خیال اور تجزیہ کے لیے ایک علیحدہ مضمون کی ضرورت ہے

آخر میں تابش دہلوی کی فکر اور شاعری کے حوالے سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ تابش دہلوی ایک عہد ساز شاعر ہیں غزل گو شاعر کی حیثیت سے موجودہ دور میں غزل کی مشعل کو لے کر آگے بڑھنے والوں میں تابش سب سے آگے ہیں اس دور میں اردو غزل کو حیات دوام بخشنے کی کوشش کرنے والوں میں تابش دہلوی کا نام سر فہرست ہے اور تابش کو شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار میں لے جانے کا ذریعہ غزل اور صرف غزل ہے وہی کا فر غزل جو ان کی پہلی محبت ہے ۔

میری پسندیدہ شخصیت: تابشؔ دہلوی

(ڈگری کلاسیز کے طلبا کے لئے، نیاز بدایونی کی تصنیف "گلدستۂ مضامین" میں شامل ایک مضمون)

ہر چند کہ پسند اور ناپسند انسان کا ذاتی معاملہ ہوتا ہے۔ تاہم ہر پسند و ناپسند کے لئے ضروری ہے کہ اس کی کوئی قابل قبول بنیاد ضرور ہو۔ کوئی بھی فرد اسی بنیاد کے تعلق سے دوسرے کو اپنا ہم خیال بنا سکتا ہے یا یوں کہا جائے کہ اپنی رائے سے کسی دوسرے کو متفق کر سکتا ہے

شخصیات کی پسند کے سلسلہ میں پس منظر وہی ضروری ٹھہرتا ہے کہ جس کی ہم نے سطور بالا میں نشاندہی کی۔ کسی شخصیت کی پسندیدگی میں کبھی وہ اوصاف شامل ہوتے ہیں جن کا پسند کرنے والے نے قریب سے مشاہدہ کیا ہو اور کبھی وہ تجربے اس پسندیدگی کا سبب بنتے ہیں جو پسندیدہ شخصیت سے پسند کرنے والے کو حاصل ہوئے ہوں۔ اس سلسلے میں جب ایسے افراد پہ نظر ڈالتا ہوں کہ جنہوں نے مجھے اپنے اوصاف اور محاسن سے متاثر کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ بعض خوشگوار تجربوں نے بھی مجھے ان اصحاب کا گرویدہ بنایا ہے تو ان میں شہر کے ایک ذی علم بزرگ، شائستگی، تہذیب اور وقار کے مجسم پیکر اور باکمال و کہنہ مشق شاعر حضرت تابشؔ دہلوی کی ذات ہی میری پسندیدہ شخصیت ٹھہرتی ہے۔

دنیائے علم و ادب کی اس نامور شخصیت کا نام مسعود الحسن ہے اور ادبی و شعری حلقوں میں اس شخصیت کو تابشؔ دہلوی کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ تابشؔ صاحب ۹ نومبر ۱۹۱۱ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ تعلیمی مرحلہ میں میٹرک کے بعد آل انڈیا ریڈیو دہلی سے وابستہ ہو گئے۔ تقسیم برصغیر پر ہزاروں دوسرے مسلمانوں کی طرح اپنے خوابوں کی پاکستان کو ہجرت کی اور یہاں ریڈیو پاکستان میں ملازم ہوئے۔ اس ملازمت کے دوران انہوں نے اسلامیہ کالج کراچی سے گریجویشن کیا جب انہوں نے نیوز ریڈر کے فرائض انجام دیئے تو نہ صرف ریڈیو پاکستان کے اعلیٰ حکام بلکہ خبریں سننے والے تمام خاص و عام افراد اس حقیقت کے اعتراف پر مجبور رہے کہ قدرت نے تابشؔ صاحب کو نہ صرف متاثر کرنے اور دل میں اتر جانے والی آواز اور لب و لہجہ عطا کیا ہے بلکہ انہیں زبان و بیان پر کامل دسترس بھی حاصل ہے

شاعری کے میدان میں تابشؔ صاحب نے ابتدا ہی سے دوسروں کو اپنے فن کا مداح اور معترف

اس طرح بنایا کہ اپنے خیال کی پاکیزگی، جذبوں کی صداقت اور بیان کی صفائی کو بہت ملحوظ رکھا۔ اس مختصر سے مضمون میں ان کی شاعری پر تفصیلی تبصرہ ممکن نہیں تاہم ان کے بارے میں جناب احمد ندیم قاسمی کی رائے کو یقیناً جامع سمجھنا چاہیئے کہ انہوں نے غزل گو کی حیثیت سے اس زمانہ میں نام پیدا کیا جب فانی فراقؔ، جگرؔ اور حسرتؔ کی غزلوں سے پورا برصغیر گونج رہا تھا۔ اتنی قد آور شخصیات کی موجودگی میں ناموری حاصل کرنا مشکل کام تھا تابشؔ دہلوی کی غزل نے یہ کام کر دکھایا۔

مجھے کتنے ہی مشاعروں اور دوسری ادبی تقریبات میں ان کا کلام سننے کے علاوہ تابشؔ صاحب کو قریب سے دیکھنے کا اتفاق بھی ہوا ہے۔ مجھے تو وہ انتہائی نفاست پسند، خوش پوش، سنجیدہ مزاج اور بڑے شفیق اور پر خلوص انسان نظر آتے ہیں۔ ان کی نفاست پسندی اور خوش پوشی کے بارے میں یہ دلچسپ واقعہ مشہور ہے کہ ایک بار ان کے نہایت صاف ستھرے اور بے شکن لباس کو دیکھ کر ان کے ایک ہم عصر نے ان سے پوچھا تھا "تابشؔ صاحب! کیا آپ کپڑے پہن کر ان پر استری کراتے ہیں؟" رہی ان کے حسن اخلاق کی بات تو ان کی شفقت کا ذاتی تجربہ ایک بار مجھے اس انداز سے ہوا کہ میرے کالج کے مشاعرے میں بھی انہوں نے صدر مشاعرہ کے بطور شرکت فرمائی۔ مشاعرہ ختم ہوا تو میں نے آٹوگراف بک آگے بڑھاتے ہوئے عرض کیا۔ "ازراہ کرم دستخط سے پہلے کوئی شعر بھی لکھ دیں۔" انہوں نے بڑے مشفقانہ انداز میں کہا "شعر نہیں مگر ایک جملہ ضرور آپ کی نذر کرتا ہوں۔" اور پھر انہوں نے جو کچھ لکھا وہ یہ تھا۔

"مشاعروں میں ضرور آیئے مگر تہذیبی و ثقافتی اقدار سیکھنے کے لئے۔"

تابشؔ صاحب کا یہ آٹوگراف آج بھی میرے پاس محفوظ ہے اور جب بھی مجھے کسی مشاعرے میں شرکت کا موقعہ ملتا ہے تو میں ان کی ہدایت و نصیحت ضرور پیش نظر رکھتا ہوں۔ لیکن اگر مجھے اجازت دی جائے تو عرض کروں کہ موجودہ دور کے اکثر مشاعروں کو دیکھ کر تو دل کچھ یہی کہتا ہے کہ کاش اس دور میں مشاعروں کا انعقاد کرنے والے منتظمین اور شرکت کرنے والے سامعین کو بھی ان شعری محفلوں کی بنیادی اہمیت و افادیت کا احساس پیدا ہو سکے اور مستقبل قریب میں خدانخواستہ مشاعرے صرف تھیٹر اور میوزک پروگرام بن کر نہ رہ جائیں۔

مختصراً میرے نقطہ نظر سے حضرت تابشؔ دہلوی کی ذات اور فن کے کتنے ہی روشن رخ ہیں کہ جنہوں نے انہیں بہتوں کی پسندیدہ شخصیت بنا دیا ہے۔ خدا ایسی آبروئے ادب شخصیت کو زندہ و سلامت رکھے۔

جاوید منظر

تابش دہلوی۔ انفرادیت کے آئینے میں

تابش دہلوی صاحب ایک ہمہ جہت شخصیت ہیں ان پر لکھنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل بہت ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ دریا کو کوزہ میں بند کرنا، آسمان سے تارے توڑ لانا، طوفان کو زنجیروں میں جکڑنا اگرچہ یہ سب ناممکنات میں شامل ہیں مگر جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا بہت مشکل مراحل سے گزرتے ہوئے تابش صاحب سے اپنی محبت و عقیدت اور خاندانی راہ و رسم سے مغلوب ہو کر نعیم میرٹھی صاحب کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اپنے سچے جذبوں اور تابش صاحب کی ان کاوشوں پر لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ یہ میرا فرض بھی ہے اور مجھ پر قرض بھی۔

آج سے تقریباً ۳۸ سال قبل جب میں پرائمری اسکول کا طالب علم تھا میرے والد نے مجھ سے فرمایا کہ "میاں جاوید آج میں تم کو اپنے ایک دیرینہ دوست سے ملواتا ہوں جو میرے نوجوانی کے ساتھی ہیں۔ آج کل ریڈیو پاکستان کراچی میں پروگرام پروڈیوسر ہیں اور جن کی دوستی پر مجھے فخر ہے۔"

ہمارا گھرانہ ان دنوں پیر الٰہی بخش کالونی میں رہائش پذیر تھا۔ والد صاحب کے پاس مورس کار ہوتی تھی۔ جب ہم ریڈیو پاکستان کراچی کے گیٹ پر پہنچے تو گاڑی گیٹ کے باہر کھڑی کرنے کے بعد والد صاحب مجھے لے کر استقبالیہ پہنچے وہاں سے مسعود تابش صاحب کا کمرہ معلوم کیا جب دروازے کا پردہ الٹ کر والد صاحب کمرے میں داخل ہوئے اور پیچھے پیچھے میں بھی یہ سوچتا ہوا کہ آج والد صاحب کے دیرینہ دوست سے ملاقات ہوگی تو دیکھتا کیا ہوں کہ ایک بہت خوب صورت بردبار تہ دار شخصیت نفیس کپڑے زیب تن کیے ہوئے والد صاحب سے یوں بغلگیر ہوئے جیسے ایک عمر سے بچھڑے ہوئے دوست مل گئے ہوں۔ والد صاحب نے میرا تعارف کرایا۔ بہت، محبت، خلوص اور اپنائیت سے میرے چہرے پر تھپتھپایا مجھ سے دو چار باتیں کرنے کے بعد پھر والد صاحب سے حیدر آباد دکن کے دوست احباب کی بابت معلومات حاصل کرنے لگے۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ والد صاحب اپنے آبائی شہر بدایوں سے حیدر آباد دکن تشریف لے گئے وہاں مسعود تابش صاحب سے ملاقات ہوئی پھر دونوں نے ایک ہی محکمہ میں ملازمت بھی اختیار کی تھی۔ مسعود تابش صاحب سے جب میری ملاقات ہوئی تھی تو وہ ریڈیو پاکستان کراچی میں اسکول براڈ کاسٹ پروگرام کے پروڈیوسر تھے تابش صاحب نے میری طرف دیکھتے ہوئے فرمایا کہ عالم (والد صاحب مرحوم کا نام حسن ممتاز عالم تھا۔ اور دوست احباب انہیں عالم کہتے تھے۔) تمہارے صاحب زادے کی آواز بہت اچھی ہے میرے پاس آڈیشن کے لیے بھیج دینا۔ اسکول براڈ کاسٹ کے پروگرام میں شریک کروں گا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ صاحبزادے کل صبح دس بجے میرے دفتر میں آجانا۔ یہ تھی تابش دہلوی سے میری پہلی ملاقات پھر اسکول براڈ کاسٹ کے پروگراموں میں کئی سال تک شرکت کرتا رہا۔ تابش صاحب کی وہ محبت اور خلوص جس کا اظہار انہوں نے پہلے دن کیا تھا۔ وہ آج بھی اسی طرح برقرار ہے۔ میرا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے کہ برصغیر میں اردو غزل کا ایک اہم اور معتبر نام۔ جن کے بغیر اردو شاعری کی تاریخ نامکمل ہے وہ مجھے خلوص و محبت سے یاد کرتے ہیں۔ انگنت لوگوں کے ہجوم میں جداگانہ اہمیت دیتے ہیں اب اہل علم و ادب سے اگر میں یہ سوال کروں تو بے جا نہ ہوگا کہ جن کے کلام کو سن کر اور پڑھ کر

مجھ اور مجھ جیسے دوسرے شعرا کو شعر کہنے کا سلیقہ کسی حد تک حاصل ہوا ان سے یہ کہا جائے کہ آپ ایسے اہم شاعر پر اپنے خیالات کا اظہار کریں تو یقیناً یہ ایک ناممکن بات نہ سہی تو بہت مشکل ضرور ہے۔

تابش صاحب کی محبتوں کے بے شمار واقعات ہیں کس کس بات کا ذکر کروں ۲۸ سال کچھ کم بھی تو نہیں ہوتے کہ لکھتے چلے جاؤ اور واقعات ختم نہ ہوں، محبتوں کا اظہار کرتا جاؤں کہ قلم کو کئی مرتبہ روشنائی سے پر کرنا پڑے۔ اور پھر بھی تشنگی ہی تشنگی۔ یوں لگے جیسے ابھی تو کچھ بھی نہیں لکھا۔ جب میں مشاعرے میں کوئی غزل سناتا ہوں تو ہر شعر کی یوں تعریف کرتے ہیں کہ شرمندگی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ حقیقت میں کہاں چراغ کو سورج سے نسبت۔ تابش صاحب جنہیں سب ہی تابش بھائی کہتے ہیں یوں اپنی محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ ٹیلیفون کریں گے تو پھر فرمائیں گے جاوید کل شام میرے گھر پر آجانا۔ مشاعرہ ہے کسی جگہ جانا ہے۔ اس وقت تابش بھائی سے "جی اچھا" کے علاوہ کچھ کہا بھی نہیں جاتا۔ چاہے کہیں جانا ہو کوئی بھی ضروری کام ہو مگر سب بالائے طاق رکھنا پڑتے ہیں چونکہ حکم تابش بھائی کا ہوتا ہے اور ان کے حکم کی تعمیل ہم لوگ اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

تابش بھائی کی شاعری جداگانہ اسلوب کی حامل ہے۔ ہر شعر اپنی جگہ بھرپور اور لکھنے کے لیے ایک مکمل موضوع ہوتا ہے جس پر لکھتے چلے جائیں اور شعر کے معنی و مفہوم کھلتے چلے جائیں گے اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا جو روز روشن کی طرح عیاں ہے ہم لوگ انتہائی خوش قسمت ہیں کہ تابش دہلوی صاحب کے دور میں جی رہے ہیں، جس طرح میر، غالب، مومن، ناسخ، آتش، ذوق، فانی، جگر اور اقبال کے زمانے کے لوگ ہم پر فخر کرتے ہیں۔ اسی طرح آنے والے زمانے کی نسلیں یقیناً ہم پر فخر کریں گی کہ ہم لوگ تابش دہلوی صاحب کی زندگی میں اپنے شب و روز گزار رہے ہیں۔

اہل دانش و بینش کو یہ بتانا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ تابش صاحب کے اکثر اشعار ایسے ہوتے ہیں جن کو کتنی ہی بار پڑھا جائے ہر بار ایک نیا لطف حاصل ہوتا ہے مثلاً مندرجہ ذیل اشعار میرے اس خیال کی بھرپور ترجمانی کریں گے۔

نہیں چھوڑوں کا دامان محمد	ابھی دست طلب میں دم بہت ہے
ڈوبنے والا ڈوب چکا	اب طوفان کیا، ساحل کیا
ذات کا نشہ الٰہی توبہ	دن میں سو بار بہک جاتا ہوں
تقدس جب نہ ہو رشتوں کا باقی	تو پھر نا آشنا کیا، آشنا کیا
اللہ یہ بار ہفت افلاک	زخمی ہوئے جا رہے ہیں شانے
دور تک لے گئی طلب اس کی	نقش پا کو بھی رہ گزر دیکھا

ان جیسے اور ان گنت اشعار جنہیں سنانے بیٹھوں تو دفتر کے دفتر آباد ہو جائیں قلم ساتھ چھوڑ دے مگر تابش صاحب کے خوب صورت اشعار یادداشت کے زینوں پر قطار در قطار اپنی باری کے منتظر نظر آئیں گے۔ پاکستان کی ادبی تاریخ اگر دیکھی جائے تو اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرے گا کہ تابش صاحب نے چھوٹی بحر میں غزل کہنے کی ابتدا کی ہے خدائے بزرگ و برتر ہم سب کے تابش صاحب کو عمر خضر عطا کرے تاکہ یونہی خوش رنگ و پر بہار اشعار کی کھیتی لہلہاتی رہے۔ آمین!

سیّد اقبال حسین کاظمی
مؤسس و معتمد عمومی مرثیہ فاؤنڈیشن

تابشؔ دہلوی، فروغ علم و ادب اور تہذیب و شائستگی کے لئے ایک تابندہ ادارہ

کُل پاکستان حلقۂ ادب کے لائق صدر جناب ہوشؔ امروہوی اور اُن کے رفقاء لائقِ صد مبارکباد ہیں کہ وہ برِصغیر کے بلند پایہ بزرگ شاعر حضرت تابشؔ دہلوی مدظلہ، کو حکومت پاکستان کی جانب سے صدارتی اعزاز برائے حسنِ کارکردگی کے نوازے جانے پر ایک شایانِ شان تقریب پذیرائی کا اہتمام کر رہے ہیں۔ اس موقع پر ایک ضخیم ادبی مجلّہ بھی جاری کیا جائے گا تاکہ حضرت تابشؔ دہلوی کو اُن کی ۷۰ سالہ ادبی خدمات پر خراجِ تحسین و سپاس پیش کیا جاسکے اور ناقدینِ ادب اور اُن کے مدّاح اور معاصرین ان کی گوناگوں شعری اور نثری تخلیقات پر اظہار خیال کر سکیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرتِ تابشؔ کے فن اور شخصیت اور اُن کی طویل ادبی کاوشوں کا احاطہ کرنا ایک طرح موجودہ صدی کے کم و بیش تین چوتھائی عہد کے ادبی منظر نامے پر نظر ڈالنا ہے جو جانشینانِ داغؔ دہلوی سے شروع ہو کر دورِ جدید تک پھیلا ہوا ہے۔ اس دوران تابشؔ صاحب کی شاعری پروان چڑھی اور موصوف نے اس عہد کے بڑے بڑے اساتذہ اور اہلِ علم و فن کی صحبتوں سے کسبِ فیض کیا اور ایک نہایت فعال ادبی زندگی گذاری مشاعروں میں غزل سرائی کی مجالسِ مذاکرہ میں حصہ لیا۔ مضامین پڑھے۔ محافل و مجالس میں نہایت عقیدت کے ساتھ عملی شرکت فرمائی۔ یہاں تک کہ اب مشاعروں، مذاکروں اور ادبی اجتماعات میں بحیثیت صدر یا مہمانِ خصوصی آپ کی شرکت ادبی معمولات میں شمار ہوتی ہے۔ ادبی جریدوں میں آپ کی تخلیقات کی اشاعت ادبی جریدیں کے لئے باعثِ اعزاز ہے۔ برِصغیر اور دیگر ممالک کے تمام شعراء اور ادیب تابشؔ صاحب کا ازحد احترام کرتے ہیں۔ ہرچند فی زمانہ استادی اور شاگردی کا سلسلہ تقریباً منقطع ہو چکا ہے مگر تابشؔ صاحب

نئے کہنے والوں اور اپنے خردوں کی رہنمائی کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ آج بھی بہت سے معتبر شعرا حضرت تابش کی شاگردی اپنے لئے باعثِ اعزاز و شرف گردانتے ہیں۔ تابش صاحب نے ایک بھرپور ادبی زندگی بسر کی ہے۔ مقامِ شکر ہے کہ حضرت تابش نے اپنی یادداشتوں کے کچھ حسین مرقعے اپنی خوبصورت کتاب " دید باز دید" میں محفوظ کر دیئے ہیں۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۹۱ء میں شائع ہوئی اور دوسری بار اس کی اشاعت ۱۹۹۴ء میں ہوئی ہے۔ ڈاکٹر اسلم فرخی نے اس کتاب کی دوسری اشاعت میں بجا ارشاد فرمایا ہے۔

"تابش صاحب نے بڑی یادگار علمی اور ادبی صحبتیں دیکھی ہیں۔ بڑے بڑے اساتذہ سے استفادہ کیا ہے اور ایسی ایسی محفلوں میں شریک ہوئے ہیں جن کے تذکرے ہماری ادبی اور ثقافتی تاریخ کا حصہ بن گئے ہیں۔ وہ شاعر ادیب، عالم اور فنکار جن کی عظمت کے چراغوں سے آج کی علمی اور ادبی دنیا میں اجالا ہے جن کے نام ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ تابش صاحب کے اساتذہ، دوستوں اور شناساؤں میں شامل ہیں اور ان کے بارے میں تابش صاحب کے ذہن میں معلومات کا ایسا خزانہ محفوظ ہے جو منظرِ عام پر آجائے تو ادبی تاریخ کا ایک مستقل باب قرار پائے۔ فانی، جوش، یگانہ، سائل، بیخود، نظم طباطبائی، عظمت اللہ خان، وحید الدین سلیم، ڈاکٹر زور، امجد حیدرآبادی اور حکیم آزاد انصاری سے لے کر مخدوم، مجاز، فیض اور فراق گورکھپوری تک کے نام تابش صاحب کے مرقعِ یادداشت میں سجے نظر آتے ہیں۔"

تابش صاحب بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ آپ کا بیشتر کلام غزلیات پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر شکیل نوازش رضا نے تابش صاحب کو منفرد شاعر قرار دیا ہے۔ " دید باز دید" طبع دوئم میں اظہار رائے کرتے ہوئے ڈاکٹر شکیل نوازش رضا یوں رقم طراز ہیں۔

"..... لیکن بنیادی طور پر ان کی پہچان شاعری ہے وہ روایت سے اپنا شعور استوار رکھتے ہوئے عصری تقاضوں کو فراموش نہیں کرتے۔ ان کی شاعری میں معنویت اور فکری عنصر زیادہ ہے۔ غالب کا تفکر، میر کی ملائمت اور نرمی اور فانی کی غم انگیزی کو جب تابش کی

منفرد شخصیت سے ہم آہنگ کیا جائے تب تابش کی شاعری دل کے نہاں خانے میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ تابش کی شاعری اور فکر کے حوالے سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ منفرد شاعر ہیں اور اس دور کی غزل کو حیاتِ دوام بخشنے والوں میں تابش کا نام سرفہرست ہے وہ کافرِ غزل جو اُنکی پہلی محبت بھی ہے۔"

تابش صاحب نے غزلیات کے علاوہ دیگر اصنافِ سخن کو بھی اپنے تخلیقی جواہر سے مالامال کیا ہے۔ "غبار انجم" آپ کی نظموں کی کتاب ہے۔ تابش صاحب نے نہایت خوبصورت نعتیں، منقبتیں سلام اور ایک مرثیہ بھی کہا ہے جو آپ کی کتاب "تقدیس" میں محفوظ ہیں۔ تابش صاحب نے اپنا واحد مرثیہ بعنوان "آگ" ڈاکٹر یاور عباس مرحوم کی تحریک پر کہا۔ پاکستان میں فروغِ مرثیہ کے لئے ڈاکٹر یاور عباس کی خدمات عہد ساز تاریخی اہمیت کی حامل ہیں۔ تابش صاحب کی مندرجہ ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں جو ہمارے دور کا نہایت وقیع ادبی سرمایہ ہیں۔

"نیم روز" مجموعۂ غزلیات مطبوعہ ۱۹۶۳ء طبع دوئم ۱۹۸۴ء

"چراغِ صحرا" مجموعۂ غزلیات مطبوعہ ۱۹۸۳ء

"غبارِ انجم" نظمیں مطبوعہ ۱۹۸۴ء

"تقدیس" مجموعۂ نعت وسلام و مرثیہ مطبوعہ ۱۹۸۵ء

"ماہِ شکستہ" مجموعۂ غزلیات مطبوعہ ۱۹۹۳ء

"دید باز دید" یادداشتیں اور نثری مضامین طبع اوّل ۱۹۹۰ء طبع دوئم ۱۹۹۷ء

"دھوپ چھاؤں" متفرق شعری تخلیقات مطبوعہ ۱۹۹۶ء

حضرت تابش دہلوی اپنے خیالات کے اظہار میں بڑی صاف گوئی سے کام لیتے ہیں۔ گزشتہ سال معروف ہفت روزہ "تکبیر" کے گولڈن جوبلی ایڈیشن مورخہ ۲۱ اگست ۱۹۹۷ء میں شعر وادب کے حوالے سے صفحہ ۷۴ پر ۱۹۴۷ء سے ۱۹۹۷ء تک کے پچاس سالہ دور پر مختصر تبصرہ کرتے ہوئے تابش صاحب فرماتے ہیں۔

"قیامِ پاکستان کے وقت شعر وادب کا شعبہ بھی سیاسی، معاشی اور تہذیبی شعبوں کی طرح کمزور تھا کیونکہ شعر وادب کی تمام قدآور شخصیتیں حسرت موہانی سے لے کر رشید احمد صدیقی تک بھارت میں ہی رہ گئی تھیں۔ پاکستان میں خاص کر پنجاب میں چند

ہستیاں شعر و ادب کے میدان میں فعال تھیں۔ ہم نے اپنے سفر کا آغاز اسی کیفیت سے کیا لیکن جس طرح زندگی کے تمام شعبے رفتہ رفتہ مستحکم ہوتے گئے اسی طرح شعر و ادب کا شعبہ بھی قوت پذیر ہوتا چلا گیا اور ادب کی کوئی صنف ایسی نہیں جس میں قدآور شخصیتیں موجود نہ ہوں۔ مہاجر ادیبوں اور شاعروں نے اس شعبے کو اور تقویت بخشی۔ اب ہم شعر و ادب کے اعلیٰ سرمائے کے مالک ہیں۔ اس ترقی میں خاص طور پر نعت کی صنف کا ذکر نہایت ضروری ہے اس دس بیس برسوں میں نعت کا ایسا ذخیرہ جمع ہوگیا ہے جو پچھلی کئی صدیوں کے ذخیرہ سے افضل ہے۔ رثائی ادب میں بھی خاطر خواہ ترقی ہوئی ہے اور مرثیہ گو شعراء کی اچھی خاصی جماعت پیدا ہوئی ہے جو ہر سال نئے مرثیے کہتی ہے اور اس کا سہرا مرثیہ فاؤنڈیشن کے سر ہے۔ شاعری کے اعتبار سے پاکستان میں نہایت فکر انگیز شاعری ہو رہی ہے جس کی مثال اگلے برسوں میں نہیں ملتی اور اس لحاظ سے ہم بھارت سے بہت آگے ہیں ....."

مرثیہ فاؤنڈیشن کے مؤسس کی حیثیت سے میں حضرت تابش کا ازحد شکر گزار ہوں کہ موصوف نے رثائی ادب کی "خاطر خواہ ترقی" کا ادراک کرتے ہوئے ہماری کوششوں کی ستائش فرمائی۔ اب جبکہ صنفِ مرثیہ کا ذکر چھڑ ہی گیا ہے تو جملۂ معترضہ کے طور پر ایک حرفِ شکایت تحریر کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ "مرثیہ" اردو شاعری کی عظیم صنفِ سخن ہے۔ اردو زبان اپنی کم عمری کے باوجود اپنے "مرثیے" کے طفیل دُنیا کی تمام زبانوں میں ایک منفرد اور ممتاز مقام پر متمکن ہے جس کی مثال دُنیا کی دوسری زبانوں میں نہیں ملتی۔ لیکن نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس عظمت و بزرگی کے باوصف مرثیہ گوئی اور مرثیہ گویوں کو شعر و ادب کے ایوانوں میں اُن کا جائز مقام نہیں دیا جاتا۔ یہاں تک کہ حکومت پاکستان کی جانب سے آج تک کسی مرثیہ گو شاعر کو شعر و ادب کی خدمات کے ذیل میں کسی سرکاری اعزاز سے نہیں نوازا گیا جب کہ پاکستان میں بڑے قدآور مرثیہ گویوں نے شعر و ادب کے میدان میں بڑی خدمات انجام دی ہیں۔ نہ جانے کیوں مرثیہ گوئی کو ادب سے باہر کی چیز سمجھا جاتا ہے اور تنگ نظری کے باعث اُسے ایّامِ عزا اور مجالسِ مرثیہ تک محدود کر دیا گیا ہے۔ تنگ نظری کا یہ مظاہرہ اردو زبان کے ساتھ انتہائی بے انصافی کا رویّہ ہے جسے موجودہ روشن فکری کے دور میں بہرحال جلد از جلد ختم ہونا چاہیئے۔ مرثیہ

فاؤنڈیشن امید رکھتا ہے کہ اس ادبی بے انصافی کی تلافی کی جائے گی اور حکومتِ پاکستان اور دیگر ادارے مرثیہ گویوں کی خدمات اور اُن کے جائز حقوق کو بھی پیشِ نظر رکھیں گے۔

مؤقر ادبی جریدے "طلوعِ افکار" کے مدیرِ مسئول جناب حسین انجم نے طلوعِ افکار کی جون ۹۸ء کی اشاعت میں حضرت تابش کو تمغۂ حسنِ کارکردگی کے اعزاز سے نوازے جانے میں تاخیر کا جو شکوہ کیا ہے وہ یقیناً بے جا نہیں۔ حضرت تابش واقعی اس مملکتی اعزاز کے بہت پہلے مستحق تھے۔ ہمیں بھی جناب حسین انجم سے مکمل اتفاق ہے مگر "دیر آید درست آید" کے مصداق اس پُرمسرت موقع پر ہم حکومت پاکستان کے شکرگذار ہیں کہ وہ آخرکار اس بے انصافی کے ازالے کی طرف متوجہ ہوئی۔ مرثیہ فاؤنڈیشن امید رکھتا ہے کہ عطائے اعزازات کے سلسلے میں تمام مستحقین کے ساتھ عدل وانصاف سے کام لیا جائے گا۔

مرثیہ فاؤنڈیشن حضرت تابش دہلوی کو تمغۂ حسنِ کارکردگی کے اعزاز سے نوازے جانے کے پُرمسرت موقع پر خلوص دل سے مبارکباد پیش کرتا ہے اور ان کی صحت وسلامتی کے لئے دعاگو ہے۔ جناب تابش دہلوی کی ذاتِ گرامی فروغِ علم وادب اور تہذیب وشائستگی کے لئے ایک تابندہ ادارے کی حیثیت رکھتی ہے جس سے طالبانِ شعروادب فیض یاب ہو رہے ہیں۔ تابش صاحب نے نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی اور اُن کی تربیت کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ اس ضمن میں آپ کی خدمات کا دائرہ نہایت وسیع ہے جناب تابش دہلوی نے مرثیہ فاؤنڈیشن کے ساتھ ہمیشہ تعاون کیا ہے اور فروغِ مرثیہ میں ہماری کوششوں کو سراہا ہے جس کے لئے اراکین مرثیہ فاؤنڈیشن آپ کے ازحد ممنون ہیں۔ ہماری دُعا ہے کہ خداوندِ عالم اپنے حبیبؐ اور اس کی آلِ اطہارؑ کے صدقے میں تابش صاحب کو صحت وتوانائی عطا فرمائے اور آپ کا سایہ ہمارے سروں پر تادیر قائم رکھے تاکہ اردو شعروادب آپ کی ذاتِ بابرکات سے برابر مستفید ہوتا رہے۔ آمین! مرثیہ فاؤنڈیشن کل پاکستان حلقۂ ادب کو حضرت تابش دہلوی کے اعزاز میں تقریب پذیرائی منعقد کرنے اور اس موقع پر ایک ضخیم ادبی مجلّہ جاری کرنے پر بارِ دیگر مبارک باد پیش کرتا ہے

ریکوری مہم شروع
گھر گھر دستک



ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن کا عملہ ریکوری مہم پر نکل چکا ہے۔
اگر ریکوری عملہ ابھی تک آپ کے دروازے پر نہیں پہنچا تو
پہنچنے ہی والا ہے۔
نادہندگان کے لیئے آخری موقع ہے کہ اپنے دروازے پر دستک سے
پہلے واجب الادا قرض کی فوری ادائیگی کردیں۔

HBFC کی قسطیں فوراً ادا کیجئے۔ اپنا وقار اور نیک نامی بچائیے

یاد رکھیئے صرف بینک ہی
رقم وصول کرنے کا مجاز ہے۔

HBFC
ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن

تیسری منزل، فنانس اینڈ ٹریڈ سینٹر، شاہراہِ فیصل، پی۔ او۔ بکس نمبر 8508، کراچی -74400
فون آفس 9202301-6 لائنیں (6) فیکس 9202360 ٹیلکس 20851 HBFC PK تار کا پتہ HOUSINGFIN

adage

منظوم نذرانہ

راغب مراد آبادی

نذرِ تابشؔ دہلوی

رباعیات

اللہ کے فضل سے بہر طور ملے
ہم سب کی دعا ہے کہ بہر دور ملے
تابشؔ کو حکومت نے دیا ہے اعزاز
اگلے برس اعزاز انہیں اور ملے

محتاجِ ستائش نہیں نامِ تابشؔ
بے شبہ بلند ہے مقامِ تابشؔ
اعزاز حکومت نے دیا خوب کیا
اس کا متقاضی تھا کلامِ تابشؔ

سرتاجِ سخن فرشتہ خو ہیں تابشؔ
طبعاً دنیائے رنگ و بو ہیں تابشؔ
عمرِ خضر اللہ عطا فرمائے
شہرِ قائد کی آبرو ہیں تابشؔ

تابشؔ تو ہیں مداحِ رسولِؐ عربی
نعتوں میں نہ کیوں ان کی ہو شانِ ادبی
میں بھی ہوں غلامِ شہِ بطحا راغبؔ!
قربان بنامِ پاکشِ اُمّی و اَبی

ہیں شاعرِ ممتاز جنابِ تابشؔ
ہوں اور سرافراز جنابِ تابشؔ
اللہ سے راغبؔ! یہ دعا ہے تابشؔ
کچھ اور بھی اعزاز جنابِ تابشؔ

دلاور فگار — تابش دہلوی کی غبارِ انجم

غبارِ انجم تابش ہے میرے پیش نظر
چمک رہے ہیں ستارے سے سطحِ کاغذ پر

غزل سرا ہیں جو نظمیں یہاں ترنم سے
شعور جھوم اٹھا ہے غبارِ انجم سے

جمالیات کے شاعر ضرور ہیں تابش
مگر ادب کی سیاست سے دور ہیں تابش

یہ راز ہم پہ کھلا آج فکرِ تابش سے
کہ لفظ لکھتے نہیں وہ کسی سفارش سے

بنا لیا ہے یہ تابش نے اپنا ایک اصول
کہ وہ دباؤ نہیں کرتے شاعری میں قبول

رہِ غزل میں وہ فانی کے ساتھ چلتے ہیں
زمیں ہو نم تو روانی کے ساتھ چلتے ہیں

خود ان کے شعر اشارے ہیں اس کہانی کے
کہ ہم سفر ہیں وہ جوش و فراق و فانی کے

وہ تھوڑی دور ہر اک ہمسفر کے ساتھ چلے
مگر پھر اپنے ہی گھر کا چراغ بن کے جلے

وطن سے ان کو محبت جو والہانہ ہے
سمندِ شعر پہ ایک اور تازیانہ ہے

جدید ہیں نہ روایت پرست ہیں تابش
حسین شعر کی خوشبو سے مست ہیں تابش

یہ کیوں کہوں وہ چمن میں قفس کے شاعر ہیں
وہ اتحادِ شرار و نفس کے شاعر ہیں

لکھا ہے سہرا جو شادی پہ بھائی حقی کی
یہاں بھی صاف نمایاں ہے فن کی باریکی

یہ سہرا طرز میں غالب سے استفادہ ہے
ادا وہی ہے مگر دلکشی زیادہ ہے

لکھا ہے سہرا سبب اس کا مالیہ بھی نہیں
نگاہ میں کوئی چھوٹی سی چھالیہ بھی نہیں

بیان خوب ہے انکوائری کے آفس کا
کوئی ردیف گئی اور نہ قافیہ کھسکا

یہاں بھی طرز میں غالب کے ساتھ ہیں تابش
قلم کی کاٹ ہے جس میں وہ ہاتھ ہیں تابش

پسند اُن کو فقط جالبی نہیں کرتے
کہ شعر کہتے ہیں وہ غالبی نہیں کرتے

مزے کی بات یہ تابش کی شاعری میں ہے
جو میرے دل میں ہے وہ ان کی ڈائری میں ہے

اک اور صنفِ سخن جس کو ہائیکو کہیے
کتاب میں وہ بھی لکھتا ہے نظم گو کہیے

یہ سوچتے ہیں کہ ہم کیسے ہائیکو لکھیں
خود اپنی کو نہیں آتی پرائی کو لکھیں

یہ فن خاص مبارک ہو ہائیکو گو کو
وہ ہائیکو ہے میں "لوکو" ہوں اچھے وکو

بس ایک نقص ہے تابش کی نظم میں یعنی
وہ ایک شعر میں رکھ دیتے ہیں کئی معنی

سند بنایا ہے لفظوں کو ان کی بندش نے
"مخالفت" کو "خلافت" نہ لکھا تابش نے

لکھے ہیں لفظ وہی ہیں جو قاعدے سے صحیح
کسی جگہ "غلط العام" بھی نہیں ہے صریح

زبان ان کی بمشکل سمجھ میں آتی ہے
لکھا ہے "دشمنی" اور لفظ "دشمنائی" ہے

غرضکہ خوب ہے تابش کا تازہ مجموعہ
یہ وہ کتاب نہیں جس کو کہیے ممنوعہ

فلک سے لائی ہوئی خاکِ تابدار ہے یہ
غبار بھی ہے اُڑتا ہوا غبار ہے یہ

حنیف اسعدی

ایک شام

"دید باز دید" کے مُصنّف تابشؔ دہلوی کے نام

یہ جو محفل جمائے بیٹھے ہیں — جمع ہیں جن کے گرد اہلِ نیاز
آج کی شام ہے انہیں کے نام — ہیں یہی میرے ہمدم و ہمراز
ان کا ظاہر ہے کس سے پوشیدہ — آپ بھی جانتے ہیں بندہ نواز
ان کے باطن پہ آج ہوگی بات — درمیاں سے اٹھا کے پردۂ راز
شوق کا ان کے ہے عجب عالم — فکر کا ان کی ہے عجب انداز
قلب پاکیزہ ہے بہر صورت — ذوقِ نظّارہ تک ہے خوئے مجاز
دانشِ دیں کہ فہمِ دنیا ہو — دونوں جانب ہے بے غلو انداز
وضع داری بحدِّ استحکام — روا داری بقیدِ عجز و نیاز
شاعری تو رہی ہے نورِ نظر — نثر بھی اب نہیں نظر انداز
لکھ کے ایک نادرالوجود کتاب — تیز کردی ہے فکر کی پرواز
لفظ محدود بات لامحدود — گویا ایجاز بھی ہے اک اعجاز
یہ ہنر بھی یونہی نہیں آتا — فکر جب تک نہ ہو کرشمہ ساز
شمعِ تہذیب و مشعلِ اقدار — روشنی، روشنی کی ہے دم ساز
خود بھی روشن رہیں یونہی تا دیر — بجھنے پائے نہ شعلۂ آواز
یہ تمنّا تو میری اپنی ہے — اے مرے کار ساز و بندہ نواز
اک دُعا ہے جو مانگتا ہے دل — تابشِ دہلوی کی عمر دراز

۱۹۹۱ء

ھدیہ خلوص

مجاہد لکھنوی

ںارے درمیاں ہیں مثلِ شمعِ انجمن تابش
غزل کی آبرو ہیں رونقِ بزمِ سخن تابش

ںالِ لالہ و گل کر دیا اشعار سے روشن
بنے ہیں باعث تبدیلیٔ رنگِ چمن تابش

زل ہو، نظم ہو یا نثر کا ہو کوئی شہپارہ
بہ ہر تخلیق ملتے ہیں سرِ معراجِ فن تابش

ہے ہر دور میں اسلاف کے انداز پر قائم
ہوئے راہِ تغزل میں نہ پابندِ زمن تابش

لوعِ مہرِ صبحِ نو ہوا تھا شہر دہلی میں
جہانِ شعر میں آئی نظر کوہ و دمن تابش

عادت نعت گوئی کی ملی حُسنِ عقیدت بھی
اسی باعث تو کہلاتے ہیں مسعود الحسن تابش

لام و منقبت میں کیوں نہ حاصل ہو کمال آخر
سیادت ہے نسب میں ہیں محبِ پنجتن تابش

لوص، ایثار، الفت اور وفاداری صفات انکی
کسی دشمن سے بھی رکھتے نہیں ہیں سوئے ظن تابش

بت کی کچھ ایسی یادگاریں چھوڑ آئے ہیں
کہ دلّی سے صدا دیتے ہیں شیخ و برہمن تابش

لی کی روح نے نالے کئے جب یہ ہوئے رخصت
اُڑا کر۔۔۔ خاک کہتی رہ گئی ارضِ دکن "تابش"

مجاہد ڈوب جا فکرِ سخن میں، نام پیدا کر
عزیزِ دہر بننا ہے اگر تجھ کو تو بن تابش

واصل عثمانی

حضرت تابش دہلوی

ہر حرف تیرا گنجِ معانی کا ایک باب — فکر رسا پہ تیری زمانہ نثار ہے
دنیائے نظم و شعر میں رخشندہ آفتاب — اس عہد میں تو گوہر یکتا شمار ہے
اللہ رے تیرے حسن و غزل کی یہ آب و تاب — اقلیم نظم و شعر کا تو تاجدار ہے
بزمِ سخن میں تیرا نہیں کوئی بھی جواب — تیری غزل سے لہجہ تیرا آشکار ہے
تو نے علوئے فکر کا دریا بہا دیا — تو نے غزل کو اِک نیا پندار دے دیا
شعرِ سخن کا ایک نیا رستہ دکھا دیا — شعر و سخن کو رتبہ کوہسار دے دیا

علم و عروض میں تو بڑا باکمال ہے — تیری زباں فصیح ہے شستہ کلام ہے
بندش ہر ایک مصرعہ کی کیا بے مثال ہے — تو مستند ہے صنفِ غزل کا امام ہے
تیری غزل کا شعر ہر اک لازوال ہے — جتنا کلام ہے وہ بلاغت نظام ہے
تقلید جس کی سخت ہے سرقہ محال ہے — ہم تشنگانِ علم کا تجھ کو سلام ہے
دلی کی ہے زبان تو فانی کا رنگ ہے — ایوانِ علم و فن میں تیرا غلغلہ رہے
اسلوب تیرا دیکھ کے دشمن بھی دنگ ہے — تا حشر یوں ہی گونجتی تیری صدا رہے

اعجاز رحمانی

تابش دہلوی

زینتِ محفل ہیں تابش دہلوی
رشک کے قابل ہیں تابش دہلوی

ان کا ماضی حال ہے ان کا گواہ
رنگِ مستقبل ہیں تابش دہلوی

عمر گزری ہے حصولِ علم میں
فکر کی منزل ہیں تابش دہلوی

ان سے زندہ ہیں ادب کی محفلیں
شمعِ اہلِ دل ہیں تابش دہلوی

کیوں نہ پھر جسمِ ادب میں جان ہو
خون میں شامل ہیں تابش دہلوی

جس سے وابستہ ہے لیلیٔ غزل
وہ حسین محمل ہیں تابش دہلوی

اپنی ہی آواز کی ہیں بازگشت
اپنی ہی منزل ہیں تابش دہلوی

موجِ نفرت سے کوئی نسبت نہیں
پیار کا ساحل ہیں تابش دہلوی

یہ کسی کی سمت راغب ہی نہیں
خود پہ خود مائل ہیں تابش دہلوی

میر و غالب داغ کے ہیں ہم وطن
واقفِ سائل ہیں تابش دہلوی

فیضِ فانی کا ہے یہ اعجاز اثر
فن میں بھی کامل ہیں تابش دہلوی

نیاز بدایونی

ہاں یہ رائے نہیں ہے دعویٰ ہے

آج پھر تجزیہ یہ کرنا ہے
کس کا کتنا ادب میں حصّا ہے
کون ہے فن میں صاحبِ قامت
یوں تو ہر شخص قد میں اونچا ہے
ہیں شگفتہ جو فکر و فن کے گلاب
یہ جو باغِ سخن مہکتا ہے
سب ہی اس کے ہیں آبیار، مگر
کس نے خونِ جگر سے سینچا ہے
اہلِ نقد و نگاہ سے پوچھو
ان کا معیارِ برتری کیا ہے
آج کہتے ہیں جس کو نقد و نظر
اپنا اپنا خیال ہوتا ہے
یعنی تنقید کے حوالہ سے
متفق سب کو کم ہی دیکھا ہے
ہاں مگر فکر کے دبستاں میں
ایک مردِ بزرگ ایسا ہے
معترف جس کے سارے ناقد ہیں
معتبر حرف حرف جس کا ہے
نامِ مسعود جس کا ہے مسعود
جس کو "تابش" زمانہ کہتا ہے
ہفت تصنیف ہے یہ اہلِ قلم
اس کا اک باوقار لہجا ہے
خود یہ کہتی ہے اس کی ہر تصنیف
میرا تخلیق کار سچّا ہے
اس کا ہر شعر رمزیت کے ساتھ
دعوتِ غور و فکر دیتا ہے
سچ تو یہ ہے برائے صنفِ غزل
تابشؔ اس دور کا مسیحا ہے
دسترس میں ہیں اس کی سب اصناف
سب پہ یکساں گرفت رکھتا ہے
اس کا فن دیکھ کر حکومت نے
خاص اعزاز اس کو بخشا ہے
ہے جو بزم ادب میں اس کا وقار
حاصلِ عمر تو یہ ہدیا ہے
منجملاً یوں کہوں، برائے ادب
وہ بڑا معتبر حوالا ہے
اس کے حق میں یہ سب بیاں میرا
تبصرہ ایک سرسری سا ہے
کیوں نہ اس تبصرہ کے آخر میں
وہ بھی کہہ دوں جو مجھ کو کہنا ہے
کر رہا ہوں بقیدِ ہوش و حواس
ہاں یہ رائے نہیں ہے، دعویٰ ہے
منحرف خود مشاہدہ کرلیں
ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے

شخصیت ذی وقار تابشؔ کی
حسنِ تہذیب کا ادارا ہے

اعتراف سپاس

محترم حضرت تابش دہلوی کو حکومت سے تمغہ امتیاز صدارتی اعزاز ملنے پر

احسان کاکوروی

وہ ایک شاعرِ شیریں مقال و خوش اطوار
اساتذہ کی صفِ اولیں میں جس کا شمار
وہ لفظ اس نے پروئے کہ بول اٹھے اشعار
اُتر کے رہ گئی دل میں وہ دل نشیں گفتار

کھُلے ہیں رازِ ادب کی نشاطِ ثانی کے
ہوئے ہیں دہر میں چرچے زبان دانی کے
وسیلے کیوں نہ نکل آئیں کامرانی کے
گلِ مراد چنے ہیں چمن سے فانی کے

وہ جس کی کاوشِ پیہم سے شاعری کو دوام
خلوص و عجز کا پیکر محبّتوں کا امام

وہ دہلوی ہے تو کیا نازشِ دکن بھی ہے
اسی کی ذات مگر تابشِ وطن بھی ہے

سخن کے باب میں شعلہ بھی ہے وہ شبنم بھی
رموزِ شعر و سخن کا امام اعظم ــــ بھی
سنوارتا ہے زمانے کی زلف برہم ــــ بھی
خوشی کے راز کا محرم وہ واقفِ غم ــــ بھی

دیارِ حکمت و دانش میں مہرِ تاباں ہے
ہر انجمن میں چراغِ سخن فروزاں ہے
جہانِ علم میں پیغمبر بہاراں ہے
شعور ذات کا پیکر امام دوراں ہے

ادب کی گرم فضاؤں میں پہلی بارش ہے
"مسعود نام تخلص جنابِ تابش ہے"

ادب کے باب میں استادِ فن نظر آئے
وہ اپنی ذات میں اک انجمن نظر آئے

ہے منفرد لب و لہجہ الگ ہے پرواز
بہت بلند ہے ادراک و فہم کا انداز
"کمالِ فن کی پذیرائی میں ملا اعزاز
ہو فضلِ خاص سے احسان اس کی عمر دراز

یوں پہ اہلِ ادب کے اسی کا ذکر رہے
فضائے دہر میں روشن چراغِ فکر رہے

خمار فاروقی

قطعات

حرمتِ الفاظ، فن کا مان تابش دہلوی
نظم میں یکتا غزل کی جان تابش دہلوی
اِس سے بڑھ کر اب کوئی اعزاز کیا ہوگا خمار
شاعری کی شان اور پہچان تابش دہلوی

علمِ عروض ہو کہ کوئی گوشۂ سخن
تابش سے فیضیاب ہوا شاعری کا فن
گُلرنگ شاعری ہے اُنہی سے چمن چمن
شاگرد اُن کے آج ہیں ہر سو کرن کرن

ہیں تہذیبی روایت کے درخشندہ نشاں تابش
ہیں فنِ شاعری کے نکتہ سنج و نکتہ داں تابش
غزل ہو مرثیہ ہو نظم ہو نعت و مناقب ہوں
ہر اک صنفِ سخن میں ہیں یقیناً کامراں تابش

خواجہ رضی حیدر

ماہِ شکستہ

وہ نیم روز کہ جس میں چراغِ صحرا نے
بصد ادب یہ کہا تھا غبارِ انجم سے
یہ شعر گوئی بہت خوب ہے مگر اک دن
کوئی کلام ہوا اسلاف کے حوالے سے
سو ایسے عام ہوئی حرف حرف میں تقدیس
دیارِ فکر میں تازہ نفس چراغ جلے
کرشمہ کہیے اسے تابشِ سخن کا رضیؔ
فلک پہ آج بھی ماہِ شکستہ روشن ہے

تابشِ سخن

۱۴۱۳ھ

ہمہ جہت ہیں ہمہ رنگِ انجمن ہیں آپ
دیارِ شعر میں اک شمعِ فکر و فن ہیں آپ
طلوعِ "ماہِ شکستہ" سے ہوگیا ظاہر
میانِ عصرِ رواں "تابشِ سخن" ہیں آپ

۱۴۱۳ھ

انوار عزمی

نذرِ تابش دہلوی

ماہتابِ رہِ سخن ہے وہ — ایک شائستہ اہلِ فن ہے وہ
فکر ہو اس کی کیوں نہ آفاقی — میر و غالب کا ہم وطن ہے وہ
درد و خسرو کے رنگ ہیں اس میں — داغ و مومن کا بانکپن ہے وہ
پانچ عشروں سے اس خرابے میں — آبروئے نگارِ فن ہے وہ
اس سے مل کر یہ ہوتا ہے احساس — ذات میں اپنی انجمن ہے وہ
کج کلاہوں کے کج رویّوں پر — اپنے شعروں میں خندہ زن ہے وہ
ہم نہیں سب ہی لوگ کہتے ہیں — خوش طبیعت ہے خوش چلن ہے وہ
راستہ سب سے ہے جدا اس کا — بت فروشوں میں بت شکن ہے وہ
لاکھ تیشہ بکف نہیں لیکن — اس زمانے کا کوہکن ہے وہ
جو ہے تابش کے نام سے مشہور — ایک شہکارِ علم و فن ہے وہ

جن کی خوشبو ہے دائمی عزمی
ایسے پھولوں کا اک چمن ہے وہ

پروین جاوید

تابش دہلوی پائندہ باد

وہ جو لفظوں میں جان رکھتے ہیں
زندگی کا گمان رکھتے ہیں
ذہن و دل کے لئے یہ ہر موسم
حرف کا سائبان رکھتے ہیں
شعر جن کے لئے ہے سرمایہ
اسی دولت پہ مان رکھتے ہیں
شاعری ہے شعور کی ایجاد
کم ہیں جو یہ گیان رکھتے ہیں
لیکن اقلیم فکر کے یہ لوگ
اک بڑا خاندان رکھتے ہیں
کیونکہ یہ فکر، فکرِ تابش ہے
شعر کا ذکر، ذکرِ تابش ہے
حرمتِ لفظ کی روایت کا
آج گویا ہیں اِک عَلَم تابش

سارے شاعر ہیں محترم گویا
اور ان میں ہیں محترم تابش
فکر کا وہ الاؤ ہے روشن
روشنی کا بہاؤ شعر میں ہے
اور روایت کی چاشنی ایسی
ایک انوکھا سبھاؤ شعر میں ہے
ابتدا سے غزل ہے ان کا نشان
شاعری گویا درد کا درماں
خود کو یوں بھی رکھا ہے وقفِ غزل
اب غزل ہوگئی ہے ان کا بدل
پہلے تھا شعر ان کا سرمایہ
اب ہیں وہ شاعری کا سرمایہ
ہے غزل کی جہاں میں جو معیاد
تابش دہلوی پائندہ باد

ھدیہ تہنیت

بخدمت جناب حضرت مسعود الحسن تابش دہلوی
تمغۂ امتیاز صدارتی اعزاز
۱۴ اگست ۱۹۹۸ء

متاعِ فکر و فن، مسعود تابش — غزل کا بانکپن، مسعود تابش
غزل کو مان لیں شیریں، اگو ہم — تو پھر اک کوہکن، مسعود تابش
ہمارے دور کے باغِ سخن میں — چمن اندر چمن، مسعود تابش
ہمارے عہد کے شعری اُفق پر — خوشا، سایہ فگن، مسعود تابش
غزل کی وضعداری کا یقیناً — سُبک، دھیما چلن، مسعود تابش
ہوئے اعزاز دو باہم دِگر، اب — کہ خود اعزازِ فن، مسعود تابش

جنابِ حضرتِ فانی کا ہاتف
تسلسل ہائے فن مسعود تابش

○

○

ہمارے عصر کی بزمِ غزل میں
بڑے عالی نسب، مسعود تابش
ہوئی تاریخ دو لفظوں میں ہاتف
کہ ہیں۔ "خوش منتخب" مسعود تابش
۱۹۹۸ء

○

رب کی مرضی ہے وہ جسے ہاتف
سنّتِ بے نیاز سے دیدے
اور عظمت جنابِ تابش کو
تمغۂ اِمتیاز سے دیدے
۱۹۹۸ء

منجانب: ھاتف سعید

مرزا ثمر لکھنوی

ڈھونڈ کر لائیں دوسرا تابش

بے نوائی میں ہے نوا تابش
زندگی بھر غزل سرا تابش

غزل آغاز کی تھی بچپن میں
اور اب اس کی انتہا تابش

منزلِ فکر ہے بہت سوں کی
جس سے کرتا ہے ابتدا تابش

انکساری ہے مدعا ورنہ
اپنے قامت میں ہے بڑا تابش

لوگ شہرت کے مدعی ٹھہرے
اور شہرت سے ماورا تابش

حاسدوں کی تھیں سازشیں کیا کیا
پھر بھی مقبول ہو گیا تابش

اور اردو زبان کی خدمت سے
سب کا محبوب ہو گیا تابش

وہ جو کہتے ہیں اپنی ہستی میں
بس غزل گو ہے اور کیا تابش

ان سے کہنا یہ ہے مجھے کہ ثمر
ڈھونڈ کر لائیں دوسرا تابش

نامۂ تہنیت

آبروئے غزل مشہور و معروف بزرگ شاعر حضرت سیّد مسعود الحسن تابشؔ دہلوی
کو صدارتی اعزاز برائے تمغہ امتیاز ملنے پر اظہارِ مسرت

از نعیم میرٹھی

چاہتوں کی اساس لایا ہوں
تربیت کی شناس لایا ہوں
نذر کرنے جنابِ تابشؔ کو!
چند حرفِ سپاس لایا ہوں

عظمتِ فن کا اعتراف ہوا
خسروانہ نظر میں آئے ہیں
میرے استاد حضرتِ تابشؔ
تہنیت کی خبر میں آئے ہیں

گلشنِ شاعری میں مثلِ گلاب
فن کا اک انتخاب ہیں تابشؔ
کہہ رہا ہے یہ تمغۂ خدمت
آپ اپنا جواب ہیں تابشؔ

خدمتِ شاعری کا یہ اعزاز
ہو مبارک جنابِ تابشؔ کو
جو نہیں جانتے کہ فن کیا ہے
وہ پڑھیں اب کتابِ تابشؔ کو

سنوارے عمر بھر گیسو غزل کے
رکھی قائم غزل کی حکمرانی
بہ فیضِ حضرتِ فانیؔ غزل میں
نہیں ہے حضرتِ تابشؔ کا ثانی

سخن دانوں نے مل کر یہ دعا دی
خدا دے ان کو عمرِ جاودانی!
غنیمت ہے دمِ تابشؔ غزل کو
غزل کی وہ غزل اُن کی نشانی

کلب پاکستان حلقہ ادب

پیشکش: ۲۱۔سی شیلو زون سینٹر یونیورسٹی روڈ گلشن اقبال۔ کراچی



RED&WHITE
RED&
WHITE
KING SIZE FILTER
For the Style ... and Taste

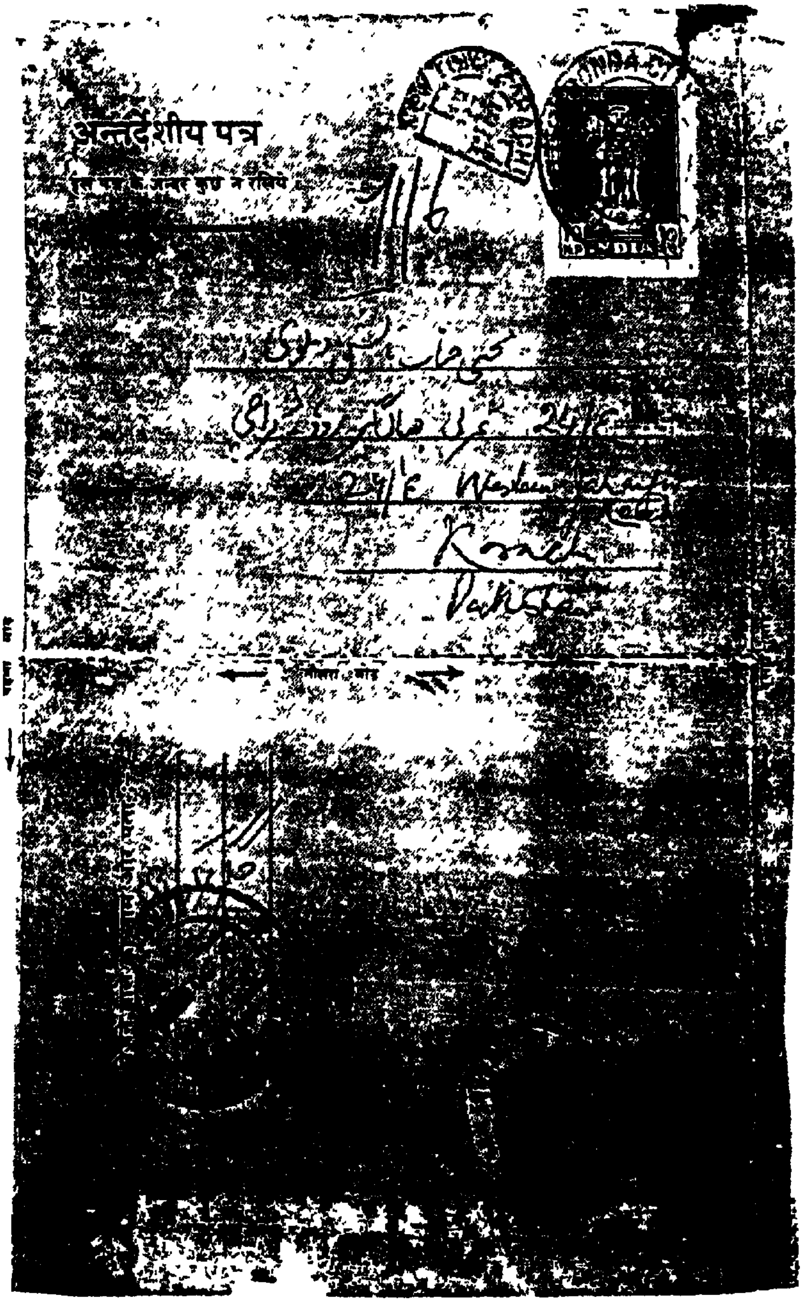
تابش دہلوی

کے

نام

احباب کے

خط


अन्तर्देशीय पत्र
INDIA

عزیز گرامی قدر و ملاطفت شیم دعا ہا فراواں۔

الحمدللہ کہ صحت ترقی کر رہی ہے۔ کیا عجب ہے
شکایت بکسر رفع ہو جائے۔ مگر ضعف اس قدر
ہے کہ اس معمولی سے ذہنی کام بھی انجام نہیں دے سکتا۔
علاج ڈاکٹر محمد الحمید صاحب کا ہو رہا ہے۔ پہلے [illegible]
ہی اور بعد میں لکھنؤ میں بہت ہی شدید ضعف قلبی
ہو گیا ہے۔ ادھر کچھ عرصے سے دورے کم ہو گئے
لیکن یہ سمجھ لیجئے کہ تکلیف ذرا ذرا رہتی ہیں۔

مجھے اپنے احباب و مخلصین پر ناز ہے
مجھے یقین ہے کہ وہ میری معذوری کا صحیح اندازہ
کر کے خطوط کے جواب نہ ملنے پر مجھے صحیح معنوں
معذور سمجھیں گے۔ ~~[illegible]~~

~~[illegible]~~ [illegible]

علمی ورثہ بہت [illegible] آپ [illegible]
آپ مجھ سے بہت قریب رہے ہیں مگر [illegible]
لیکن احباب و مخلصین کو خاطر خواہ [illegible]
[illegible] کی [illegible]
سلسلہ [illegible]
احباب [illegible] اللہ [illegible]
صبر و جبر اختیار کرنا پڑے
[illegible]
[illegible]
[illegible]
ذرے رہ گئی۔ آپ کے [illegible]
[illegible] خدا [illegible]
[illegible]
[illegible]

تابندہ باش حضرت تابش

محبت نامہ ملا - جی خوش ہو گیا -

بیمار رہتا ہوں زیادہ لکھا نہیں جاتا -

آپ کا محبِ صادق

جوش

اسلام آباد

۸۱/۲/۲۳

Professor
Dr. Ghulam Mustafa Khan
M.A., LL.B., Ph.D., D. Litt.

2, OLD UNIVERSITY CAMPUS,
HYDERABAD, SINDH

باسمہٖ حامداً و مصلیاً

DATED ۹ مارچ ۱۹۹۸ء

محترم بھائی جان السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ نے دو کتابیں "دھوپ چھاؤں" اور دید، بازدید
عنایت فرمائیں۔ بہت ممنون ہوں۔
آپ کو "بھائی جان" کہنے پر فخر محسوس کرتا ہوں، کیونکہ
آپ مجھ سے چند ماہ بڑے ہیں۔ میں اپنے بزرگوں کی پرانی
روایات پر بحمداللہ قائم ہوں۔
"خاکے" آپ اور لکھ دیں، کیونکہ اُن کو دیکھنے والے اب
بہت کم رہ گئے ہیں۔ خود آپ کی ددھیال اور ننھیال کے
کتنے بزرگ ہیں جن پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔
بہت کمزور ہو گیا ہوں۔ دعا میں یاد رکھیے۔
فقط والسلام
المخلص
غلام مصطفیٰ

— بعد میں آپ کا مجموعۂ سخن "ماہ شکستہ" بھی مل گیا۔ بہت ممنون ہوں

بیت الحکمہ
• Hamdard University Library • Centre for Academic Research • Translation Bureau • Centre for Higher Educ
Bait al-Hikmah

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
۱۹۔رجب المرجب ۱۴۱۸ ہجری
20-نومبر 1997 عیسوی

حوالہ نمبر: ب ر ح ر ۹۷ ۵۲۲

حضرت محترم تابش دہلوی
السلام علیکم ورحمتہ اللہ تعالیٰ و برکاتہ

"دید باز دید" ضرور ایک سوانح ہے، مگر سوانح کے ساتھ یہ تاریخ بھی ہے اور شعروادب کا ایک شاہ کار بھی ہے۔ آپ کے تاثرات اچھا ہوا کہ قلم بند ہو گئے۔ پاکستان کے پچاس سال پر یہ محیط ہیں۔ اس کے بعد خیال آتا ہے کہ ہم جشن پچاس سالہ کا عنوان اگر علم و حکمت اور شعروادب بنا لیتے تو پاکستان میں کروڑوں اربوں روپوں سے دنیا بدل جاتی۔ نہ جانے کتنے مسودے چھپ جاتے اور کتنے راز ہائے پنہا منظر عام پر آجاتے۔ ہم نے یہ نہایت اہم سرمایہ ضائع کر دیا اور عیش و عشرت میں لگا دیا اور جشن پچاس سالہ ایک استہزا ہو کر رہ گیا۔

آپ نے "دید باز دید" لکھ کر ایک نہایت وقیع کام کیا ہے۔ میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو وقت اور توفیق عطا فرمائیں اور آپ اس انداز کی چند چیزیں کچھ اور معرض تحریر میں لے آئیں جو بے باکی اور جرات کی آئینہ دار ہوں۔

کتاب کے لیے ممنون ہوں۔ اپنی ایک تازہ کتاب "فکر جواں" بھجوا رہا ہوں۔

بہ احترامات فراواں

آپ کا مخلص

حکیم محمد سعید

بگرامی خدمت حضرت محترم تابش دہلوی صاحب
ادب گاہ، بلاک سہرائے، ۴ر۶
ناظم آباد، کراچی ۱۸۰

Madinat al-Hikmah Muhammad Bin Qasim Avenue Off Sharae Madinat al Hikmah Karachi-74700 Pakistan
Telephone Nos 6600000,6996001,6996002,643817 Telex No 29370 HAMD PK Cable HAMDARD Telefax No (92 21) [redacted] 6611755
E-Mail : hlpak @ paknet 3 ptc pk

فون نمبر 73550
تاریخ ....

پروفیسر مجتبیٰ حسین
صدر شعبہ اردو
جامعہ بلوچستان ۔ کوئٹہ

برادرم ۔ آداب

چراغِ صحرا ملا ۔ شکر گزار ہوں ۔ جلد جواب خط نہ ہو سکا ۔ شرمسار ہوں
پڑھ چکا ہوں ۔ دل و دماغ کو روشنی مل رہی ہے ۔ زبان کی وہ شگفتگی مگر کوئی نئی کشود
بنیادی ہے جو معتبر کردیتی ہے ۔ آپ کے یہاں ایسا ٹھہراؤ ہے ۔ آپ کے یہاں نرمی اور گداز ہے
آپ کی زمین پہ چلتا جاتا ہوں اور سوچتا ہوں جو باتیں آپ کہہ رہے ہیں آپ سنے گا کون ؟

درد کی قیمت کون چکائے
دل ہی نہیں دریا کس کا ہے

بہر حال مجھے یقین ہے کہ یہ کلام صدا بصحرا نہیں ثابت ہوگا ۔ یہ چراغِ صحرا ہے اور روشنی دیگا
امید ہے آپ بخیر ہوں گے ۔ زیادہ پھر لکھوں گا

خدا کرے آپ ہر طرح بہتر سے ہوں ۔ ہم سب اہلِ خانہ کو سلام

آپ کا پیارا مجتبیٰ

مجتبیٰ

۱۳/۱/۸۳

بانی: علامہ نیاز فتح پوری

نگار

مدیر: ڈاکٹر فرمان فتح پوری ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ فون ۴۹۸۰۴۴۰
نگران: [illegible] ایم اے [illegible] ۴۹۵۳۵۰

جاری شدہ ۱۹۲۲ء — سی-۲۸ بلاک نمبر ۱۳ ڈی، گلشن اقبال، کراچی، [illegible] ۷۵۳۰۰

مورخہ ________ ۵/۹/۹۶

میرے مخدوم و محترم سلام مسنون

عنایت نامہ [illegible] آپ نے [illegible] واپس آیا تو [illegible] آپ یا یادِ [illegible] [illegible] عنایت [illegible] اور لطف اندوزی کا باعث ہوئی۔ اس لطف افزائی اور [illegible] کا شکریہ واجب ہے۔

[illegible] اگرچہ [illegible] مگر [illegible] کی سیر کرتے وقت [illegible] [illegible]

[illegible] گمراہ آدمی زاد کو + آپ آدمی زاد کو گمراہ آدمی زاد کرے
[illegible] آستانہ + [illegible]
تمام [illegible] + قرار دل کو [illegible]
[illegible] + تو پھر بات [illegible]
[illegible] + [illegible]
[illegible] + ہے عمر کے گزرے ہوئے [illegible] آنکھوں کی [illegible]

حضرت [illegible] بدایونی سے یہ بات پہلی بار [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

دعا کا خواہاں رہتا ہوں — ایک اور بات [illegible] کہنا چاہتا ہوں وہ یہ

میرا یہ [illegible] آپ کے [illegible] شعور کا بھی قائل

ہو گیا ہوں — [illegible] میں [illegible] جو انداز [illegible] ملی تو وہ

ہو گئے [illegible] اور

کسی [illegible] کو [illegible] کر دیتے ہیں

آپ نے [illegible] جو نظم [illegible]

[illegible] میں لکھی تھی اور جو پہلی بار [illegible] آپ نے [illegible] مجھے [illegible]

[illegible] ہے آپ نے مجھے [illegible] یاد فرمایا [illegible]

اور آپ کے بے پایاں خلوص کا [illegible]

مرتبہ [illegible] میں آپ تک پہنچ سکا یا نہیں [illegible]

سمجھتا [illegible] اور [illegible] وقت [illegible]

نذر [illegible] دعا [illegible] آپ کی محبت میں

اضافہ ہو — والسلام

نیاز مند

[illegible]

بملاحظہ گرامی

حضرت تابش دہلوی صاحب

Majrooh Sultanpuri

۲۱ نومبر ۸۶ء

بمبئی

بڑے بھائی! سلام و اکرام کے بعد اپنے شعر کے بارے میں آخری بار عرض کروں گا کہ پہلا مصرعہ دعویٰ ہے دوسرا اس کی دلیل ہے۔ تسلیم کہ لفظ سے بارورتے قاتل کا علاج (یعنی چاہے تو خراب کر دیجئے) ممکن نہیں ہے۔ مسیحا کا معالج ہونا کون نہیں جانتا مگر اسکا حشر ہمارے سامنے ہے۔ یہاں کئی دوستوں سے استمزاج کیا ان میں سے کسی ایک کو شعر کے سمجھنے میں ذرہ زحمت نہیں ہوئی جو مرے یار کو ہے۔ کیوں نہ اس بات کو یہیں چھوڑیں اور چند اچھے اچھے اشعار کے بارے میں گفتگو کریں۔ اب یہ بڑی عجیب بات ہے کہ شاعر جیسے شہر مندرہ صاحب نظر کو میرا شعر سقیم معلوم ہوا جبکہ الٹے میں اس کی داد کا خواہاں تھا۔ آخر ہوں تو شعروادب کا طالب علم ہی نا۔ اب یار کی غزل دیکھیے غزل کا ہر شعر اپنی اپنی ایک معتبر سطح رکھتا ہے البتہ میرے خیال میں ایک شعر ان سب سے ذرا نیچا ہے۔ "تیری رنگینی بیانی کا الخ" مگر ضروری نہیں کہ آپ مجھ سے اتفاق ہی کریں ویسے پوری غزل بڑی غزل ہے ایک سے ایک بہتر ہے۔ سبحان اللہ۔ جناب تھوڑی تعطیل ملتی تو کیا بات ہوتی۔ میری کتاب "گفتنی" میں بڑی خوشی ہوتی لوگوں کے مضامین کا انتظار رہا۔ جو نہ ان کا ارشاد ہوا نہ لکھ کر ہی دیتے ہیں اس لئے میں نے آبادی صاحب کو لکھ دیا ہے کہ انتظار چھوڑیں اور کتاب شائع کر دیں۔ ایک ایک انکی نذر کر کے فرصت کریں میں نے آج تک کسی سے نہیں کہا کہ مجھ پر کچھ لکھیے۔ ایک نظم شہادت کی شکل میں بھیج رہا ہوں۔ عنوان ہے "قلم" رائے ضرور دیجا ہوگا۔ بھابی بیگم کی خدمت میں آداب بچوں کو سلام اور پیار ہے۔

والسلام

مجروح

۳۵۳

فون: ۲۱۳۵۴۸

"لالہ صحرا" ۳ میاں روڈ۔ اسلام پورہ لاہور

میرزا ادیب

برادرِ عزیز

سلام مسنون

آپ کے ۲ خط آئے [illegible] خود ملاحظہ فرمائیں۔ آپ نے

مجھے [illegible]

آپ [illegible] کی تبدیلی [illegible]

نہیں ہوا؟

[illegible]

[illegible] ہے! اللہ آپ کو صحت دے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

میرزا ادیب

۲۴ [illegible]

باسمہٖ سبحانہٗ تعالیٰ

۸ نومبر ۱۹۸۱ء

351 پشاور روڈ
راولپنڈی صدر

عزیز گرامی قدر میاں تابش، زندہ و تابندہ و درخشندہ باد!

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ،

برسوں بعد ٹی وی کے مشاعرہ میں دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ چہرہ مہرہ تو تمہارا بالکل ویسا جیسا کہ اب سے دس بارہ سال پہلے کراچی میں نظر آتا تھا، ماشاءاللہ! مگر یہ تم نے کیا کیا، یعنی کہ بالکل "فارغ البال" ہو گئے! کیا یہ "فکرِ سخن" کی کثرت اور شدت کا نتیجہ ہے، یا اور کچھ؟

غنیمت ہے کہ تم کو ٹی وی والوں نے یاد تو کیا، ورنہ ٹی وی میں یہاں بھی اور وہاں بھی اکثر و بیشتر اہلِ اللہ نا قدرشناس اپنا اڈا جمائے ہوئے ہیں۔ اور دلی والوں سے تو ان سب لوگوں کو ازلی بیر ہے۔ بہرحال! تم نے گویا بزمِ سخن میں اپنا مقام پیدا کر لیا، یہ بڑی بات ہے۔

میں نے جلدی جلدی تمہارے قریب قریب سب ہی اشعار نوٹ کر لیے تھے۔ ان کی نقل تم کو بھیجنا گویا "اُلٹے بانس بریلی کو" کے مترادف ہے، لیکن تعلقِ خاطر کے ثبوت میں "بانس" تک رسید کرنا جائز ہے۔ تو لیجیے، نقل پیشِ خدمت ہے:۔

۴ حق و باطل میں اب بھی معرکہ ہے — خدا جانے کہاں تک کربلا ہے
مقاماتِ سکوں کا سلسلہ ہے — مدینہ ہے، نجف ہے، کربلا ہے

۴ حسینی قافلے کی منزلوں میں — ابد تک کربلا کا فاصلہ ہے
مریض اچھے ہوئے دنیا و دیں کے — سوادِ کربلا دارالشفا ہے

۴ یہ ساری کائناتِ رنگ تابش — حسینؑ ابنِ علیؑ کا خوں بہا ہے

تم نے اپنے پچھلے خط میں ظفر قریشی مرحوم کے سانحۂ ارتحال پر اپنی نظم کے جو اشعار، از راہ محبت، مجھے لکھ کر بھیجے تھے، وہ بہت ہی خوب تھے، میں نے کئی بار ایک ایک شعر کو پڑھا اور ظفر مرحوم کو یاد کیا۔ بلکہ تمہاری اتنی اچھی نظم کی نسبت سے مرنے والے کی قسمت پر مجھے رشک بھی ہوا ۔۔۔ اگر تم میرے بارے میں بھی ایسی ہی نظم لکھنے کا وعدہ کرو تو میں فوراً مرنے کو تیار ہوں۔

ہاں بھائی! دلّی ایسی اُجڑی ہے کہ اُس نے ہماری رنگ رنگیلی بھری محفل یاراں کو اکھاڑ کر رکھ دیا، ادب، بزم ساقی اور کتب خانہ علم و ادب کی محفلیں، جھگڑے، چہل پہل، گلچھرے، لطیفے، قہقہے! ایک بھولا بسرا خواب بن گئے۔

سارا ماحول، بے دریغ جو یاد آتی ہے۔ آنکھ سے خون کی ایک بوند ٹپک جاتی ہے۔

فضل حق قریشی اور صادق الخیری نے بہت عرصے سے یاد بھی نہیں کیا۔ براہ کرم اُن تک میرا سلام شوق پہنچا دو۔ تم ایک میں ہی ایسا بدنصیب ہوں جو جملہ یاران کہن سے الگ تھلگ اس سنگلاخ علاقے میں پڑا ہوں، کہ یہاں دور دور تک کوئی شناسا نظر نہیں آتا، اور یہاں کے لوگوں کیلئے ربع صدی ان کے درمیان بسر کرنے کے باوجود میں ہنوز اجنبی ہوں۔ جوں جوں اپنا وقت قریب آتا جا رہا ہے، اپنی تنہائی اور کس مپرسی کا احساس شدت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ ایسے میں تم ہی لوگ بری طرح یاد آتے ہو۔ کبھی مجھ کو پوچھتے رہا کرو، اپنے بارے میں تفصیل سے لکھو کہ کیا کر رہے ہو۔ مہر نیمروز کے بعد کوئی اور مجموعہ شائع کیا۔؟ بچے کیا کر رہے ہیں؟ معاش کا کیا ذریعہ ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

زیادہ محبت اور دعائیں

خاکسار [redacted]

۲۷ فروری ۹۸ء

پیارے بھائی ناشر دہلوی

السلام علیکم ۔ آپ کی محبت سے "شرار دیدہ و دیدہ" کی دو جلدیں مجھے مل گئی تھیں
یہاں تھا کہ جلد از جلد پڑھ کر آپ کو مکمل رسید بھیج دوں مگر بیمار پڑ گیا
ہوا ـــــ اور آپ کو پتہ ہے کہ بیمار پڑ گیا ہوں، بھی تو شاعر خواہش
اور عمل کے درمیان سب سے بڑا دیوار دائما اور دہشت گرد ہے !!

بہرحال آپ کا خط ملتے ہی میں نے بقیہ دونوں مضامین بھی پڑھ لئے ہیں
جیسا آپ نے ابتدائیے میں فرمایا تھا کہ مضامین میں بعض واقعات کی
تکرار ہے لیکن آپ کی وضاحت بھی بہت مناسب ہے کہ ایک ہی موضوع پر زمانے
یا کردار کے بارے میں مختلف اوقات میں لکھے ہوئے اس طرح کی تکرار ناگزیر ہے ۔
ویسے تو اسے بیشتر واقعے پر تنقید مکرر ہی سمجھا ہے ۔

ناگہ پر تھا آپ نے لکھا ہے کہ یوں پرانے گوشوں کی شکل میں ترمیم و
اضافے کے بعد محفوظ کر دیئے ـــ ۔

اللہ آپ کا بھلا کرے کہ آپ کے طفیل بہت سے بزرگوں
سے بھی ملاقات ہو گئی یہ سچ ہے کہ شخصیت کے دور ناشر دیدہ ـــ مگر
زمانی اعتبار سے بعد میں آنے والا سرور کے لئے جو شنیدہ ہی دیدہ ہوتا ہے
اور پھر اگر راوی آپ جیسا معتبر اور خوش بیان ہو تو بات اور بھی مانی اور خوشنما
ہو جاتی ہے ۔ آپ کی محبت کا ایک بار پھر شکریہ

رفعت عارفی "رشار" میں شامل ہو گئے، اللہ بخشے بہت نیک اور سادہ انسان
تھے خدا ان کی مغفرت کرے ۔ اب سب گھر والوں کو میرا سلام و آداب
دعا ہے آپ کو اور آپ کے اہل خانہ کو خوش اور تندرست رکھے

مخلص

۸ جولائی ۱۹۹۹ء

شفیق و محترم تابش صاحب

سلام نیاز

آپ سے کچھ دن ہوئے فون پر گفتگو ہوئی تھی آپ سے ریاض کا
وعدہ ہوا تھا لیکن آپ کی شفقتوں اور عنایتوں کے بوجھ تلے سانس لے
رہا ہوں میں محسوس کرتا ہوں۔ میں تو کب کا مر چکا ہوں در در کی آپ نے
جن محبتوں سے مجھ کو نوازا وہ آپ کے اظہار تشکر کے لیے میرے
پاس الفاظ نہیں ہیں بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس دور یا بعد میں ہو جاؤں
"ہم درد" میں نے مولانا عرشی مرحوم پر مضمون لکھا ہے اگر میں
گا تو چھپ [illegible] صاحب کے سپرد کر دیا ہے جب ہی اس کا تراشہ
مکمل ہو کر میرے پاس آتا ہے میں رجسٹری سے ارسال خدمت
کر دوں گا۔

آپ کی خوشگوار شخصیت میں بھی کرب نفسیاتی
ایک عجیب عمار اور اعلیٰ تہذیب ہر دونوں کی تصویریں
آنکھوں میں گھومتی ہیں۔ خدا کی قسم اب ایسے لوگ یہاں میں
نہیں تو آپ جیسے خوبصورت ستارہ ہر جگہ کو روشن کر جاتے۔ مجھ
یقین ہے کہ اس قدر دریا دلی آپ دیں شفقتوں کے
سلسلے کو منقطع نہیں ہونے دیں گے۔ کبھی کبھی مجھے چند سطریں
تحریر کر دیا کیجیے تو مجھ ضعیف علیل کا بات کا رابطہ
آتا رہے گا۔

تمام اہل خانہ اور افراد کو میرا سلام نیاز پہنچا دیں

نیاز کیش
[illegible]

[illegible]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

PROF. WASIL USMANI.
CHIEF COST ACCOUNTANT.

M-COM
I C M A. (GOLD MEDALIST)
M A-ECO
M. A-URDU
D L S.

استاد محترم السلام علیکم

خدا کرے آپ بخیریت ہوں آپ کی صحت میں دل
لگا ہی رہتا ہے آپریشن کے بعد امید ہے آپ کی تکلیف
رفع ہو گئی ہو گی
پچھلے دنوں اسلم فرخی صاحب عمرہ کو تشریف
لائے تھے میری ملاقات نہیں ہو سکی مگر فون پر بات
چیت ہو گئی تھی
میرا ابھی تک ایک ہی دو ہی مضامین [illegible]
ہے ملکی خبریں اخبارات سے مل رہی ہیں۔
کسی کی موت پر رضائے الٰہی کہنا درست ہے
کہ نہیں ایک صاحب کا سوال ہے
لفظ "پیشین گوئی" صحیح ہے یا "پیشن گوئی"
درست ہے۔ لغت میں مجھے [illegible] والے سے رضائے الٰہی
نہیں ملا
ایک غزل الحزیں اصلاح آگے خط میں روانہ کر رہا ہوں
خادم صاحب کی طبیعت کیسی ہے۔ دلہن اور مسعود میاں
کو دعائیں۔
فقط والسلام
خادم
واصل عثمانی

13/12/95

ALUMINIUM PRODUCTS CO. LTD
P O BOX 2080, A DAMMAM 31451, K S A
PH (OFF) 8570184 EXT (303) (RES) 8992623

۲۱ ستمبر ۸۰ء

اے تابش تو جاوید

آرزوئے عافیت و کامرانی کے ساتھ حقیر فقیر بندہ پر تقصیر گرفتار بے زنجیر یہ

بحثِ رفیقانہ شروع کرتا ہے کہ آپ کے جن دو تین اشعار میں ہنوز گنجائش کلام ہے، اس کی

دشواری یہی ہے کہ علاوہ بریں تھوڑی سی ہے کہ ہم میں سے کوئی فارسی کا اہل زبان نہیں ہے اور اسی

پر میں نے ایک رفیقانہ دراز زبانی چاہی تھی چنانچہ اب بندہ شروع ہوتا ہے

« بہ فرق پر در دیواری رقصم » میں آپ کو آورد کا عیب لگا یا جبکہ مجھے کسی انا یا فخر کی

بنا پر نہیں بلکہ اردو کی اصطلاح یہ کہنا ہے کہ « رقصم بر در » تو ممکن ہے مگر بر دیوار؟

شکستہ پا ... اس لئے « از فرق » کا لفظ ضروری ٹھہرتا ہے البتہ یہ درست ہے کہ « دیوار آسما » میں

وہ کیفیت تشکر ... دردِ شکایت و بے نیازی کی سی ... کی ترجمانی کرتی

دوسرے شعر کے « خود » کی جگہ « خویش » کا آپ کا شعور یوں درست نہیں ہے

کہ « خود » عام طور سے غیر ذات کی نفی شخصیت کے ساتھ کرتا ہے۔ « خویش »

کا لفظ نہیں کرتا کہ « خویش » تو غیر ذات کو بھی کہتے ہیں مثلاً کوئی عزیز

کوئی رشتہ دار کہ اسے بھی « خویش » تو کہیں گے مگر « خود » کسی طرح

نہیں کہہ سکتے جبکہ شعر میں ساری کائنات ایک ہی ذات یعنی « من » کا

عکس یا نقش ٹھہرتی ہے۔ والسلام مع السلامت درکت کلام

جیو

پس نوشت: برادر شفیق شاہ ... سے ... ہمارے برادرو سلام کہہ ساتھ ہی فرمائش پہنچا دیجیے

کہ فوراً ... کا پتہ لکھ کر گزارش

وہ کتابیں جن میں تاباں دہلوی کا ذکر ہے

۱۔ سخن امروز — ظفر افغانی

۲۔ شخص و عکس — حمایت علی شاعر

۳۔ یادِ رفتگاں (دو جلدیں) — ماہر القادری

۴۔ اور پھر بیاں اپنا — اخلاق احمد دہلوی

۵۔ پھر وہی بیاں اپنا — ״

۶۔ یادوں کا سفر — ״

۷۔ میری زندگی کے پچھتر سال — مولانا اعجاز الحق قدوسی

۸۔ بیگانۂ غزل — حفیظ ہوشیارپوری

۹۔ سبزۂ بیگانہ — میاں عبدالشکور لاہوری

۱۰۔ غبارِ ناتواں — ڈاکٹر مظفر شکوہ امریکہ

۱۱۔ جدید اردو شاعری (دو جلدیں) — عزیز حامد مدنی

۱۲۔ مشرق — سلیم احمد

۱۳۔ ادیبوں کے لطیفے — کے۔ ایل۔ نارنگ، دہلی

۱۴۔ زرگذشت — مشتاق یوسفی

۱۵۔ بے پرکی — سید آل عبا آوارہ

۱۶۔ نکتۂ راز — شان الحق حقی

۱۷۔ فانی شخصیت اور شاعری — ڈاکٹر مغنی تبسم۔ حیدرآباد دکن

۱۸۔ تخلیق البیاض — محوی عثمانی

۱۹۔ سخنور — سلطانہ مہر

۲۰۔ پھول بن — پیامی حیدرآبادی

۲۱۔ شاعر کی دنیا — عظیم الدین محبت

۲۲۔ یاد خزانہ — جمیل زبیری

۲۳۔ جادۂ رحمت — راغب مرادآبادی

۲۴۔ خطوطِ جوش — راغب مرادآبادی

۲۵۔ تند ہوا کے جشن میں — پیرزادہ قاسم

۲۶۔ روحِ غزل — ڈاکٹر مظفر حنفی بھارت

۲۷۔ عرض و سماع — مظفر حسین

۲۸۔ میرے زمانے کی دلی — ملا واحدی

۲۹۔ یہ تھی دلی — شیتن چندر طالب دہلوی

۳۰۔ گلدستۂ احباب — ڈاکٹر اسلم فرخی

۳۱۔ یادوں کے انمول خزانے — حافظ لدھیانوی

۳۲۔ موڈرن اردو پوئٹس MODERN URDU POETS — یونس احمر

۳۳۔ تاریخ جدید اردو غزل — ڈاکٹر وقار رضوی

۳۴۔ "میرا کوئی ماضی نہیں" — سحاب قزلباش

۳۵۔ سخنوراں قصۂ کرڑا — واصل عثمانی

۳۶۔ خامہ بگوش کے قلم سے — خامہ بگوش مشفق خواجہ

۳۷۔ ہماری منزل OUR DESTINATION — سید ہاشم رضا

۳۸۔ تاریخ ادب و زبان اردو — ڈاکٹر ابواللیث صدیقی